اصلاحِ انقلابِ اُمّت

جلد دوم

نکاح و طلاق اور دیگر معاشرتی معاملات اور حقوق العباد سے متعلق معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں بہترین حل

مولانا اشرف علی تھانوی

اِصلاحِ انقلابِ اُمّت

جلد دوم

نکاح وطلاق اور دیگر معاشرتی معاملات اور حقوق العباد سے متعلق معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں بہترین حل

تصنیف

حکیم الامت مجددِ ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز

تسہیل وتزیین

صوفی محمد اقبال قریشی | مولانا حسین احمد نجیب

ناشر

تاج کمپنی

٦١

اشاعت اوّل : ۱۹۸۵ء

تعداد. ایک ہزار

ناشر : تاج کمپنی ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

قیمت : ۱۶ رُوپے

تاج کمپنی - ۱۵۱۱ ۳ - ترکمان گیٹ - دہلی ٦

تاج پرنٹرز، ۶۹ نجف گڑھ روڈ انڈسٹریل ایریا - نئی دہلی - ۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ،

حکیم الامت مجدّد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اپنے دین کی نشر و اشاعت کے لئے منتخب فرمالیا تھا، آپ نے مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار تصانیف کا وہ بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جو انشاء اللہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا، ان تصانیف میں حضرتؒ نے اپنے زمانہ کی بیشتر ضروریات سے متعلق بڑی نادر تحقیقات و ہدایات جمع فرمادی ہیں، اور شاید ہی عہدِ حاضر کی ضرورت کا کوئی موضوع ایسا ہو جس پر آپ کی تصانیف یا مواعظ و ملفوظات میں کم از کم اصولی ہدایات موجود نہ ہوں،

حضرتؒ کے مجددانہ کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ زیرِ نظر کتاب یعنی اُصلاحِ انقلابِ امّت ہے، اس کتاب میں حضرتؒ نے اُن تمام خرابیوں اور بیماریوں کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے سبب سرایت کرگئی ہیں اور پھر اُن کا علاج بھی تجویز فرمایا ہے، دراصل یہ ایک سلسلۂ مضامین ہے جو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ماہنامہ القاسم دیوبند کے لئے تحریر فرمایا تھا، اور اس میں کئی سال تک قسط وار چھپتا رہا، بعد میں اسے کتابی صورت بھی دیدی گئی،

عرصہ سے احقر کی خواہش تھی کہ یہ کتاب دوبارہ شائع ہوکر افادہ عام کا سبب بنے، لیکن چونکہ اس کتاب سے استفادہ کو آسان بنانے کے لئے اس پر کچھ کام کی ضرورت تھی، اس لئے اشاعت ٹلتی رہی، بالآخر کتاب کے پہلے حصّہ پر برادر عزیز مولوی محمد علی صاحب سلمہٗ نے عنوانات وغیرہ لگا کر اسے مکمل کردیا، چنانچہ "ادارۃ المعارف" سے یہ پہلا حصّہ جو عبادات سے متعلق تھا عرصہ ہوا شائع ہوچکا ہے،

دوسرا حصہ احقر کی نظر میں بیحد اہم تھا، اس لئے کہ وہ زیادہ تر اُن احکام پر مشتمل ہے جو نکاح وطلاق اور گھریلو زندگی کے دوسرا اہم مسائل سے متعلق ہیں، اور جن کو ہمارے معاشرے نے دین سے بالکل خارج تصور کر رکھا ہے، لیکن مولوی محمد علی صاحب اس دوسرے حصہ پر کام کرنے سے معذور ہوگئے اس لئے اس کی اشاعت میں پھر تاخیر ہوگئی، بالآخر ہمارے محبِ محترم جناب صوفی محمد اقبال قریشی صاحب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا، اس پر عنوانات لگائے، اور مشکل الفاظ کی تشریح فرمائی اس کے بعد برادر عزیز مولانا حسین احمد صاحب نجیب رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی نے اس پر محنت سے نظر ثانی کی، اور اس کی تسہیل و تزئین میں مفید اضافے فرمائے، اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے،

اس کتاب میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ان خرابیوں کا انتہائی بالغ نظری کے ساتھ حکیمانہ جائزہ لیا ہے جو ہماری گھریلو زندگی میں بری طرح پھیل گئی ہیں، اور جن کی بنا پر ہمارا معاشرہ گوناگوں آفتوں کا شکار ہو رہا ہے، اس میں نکاح، مہر، نفقہ، عدل، رضاعت، طلاق، لقطہ اور دوسرے حقوق العباد سے متعلق شرعی احکام کی تشریح بھی ہے، اور اس بات کی مؤثر نشاندہی بھی کہ ہمارے معاشرہ میں کس کس طرح غلط فہمیاں یا بے عملیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اُن کے نتائج کتنے تباہ کن ثابت ہو رہے ہیں،

امراض کی یہ تشخیص اور ان کا یہ علاج اُس حکیم الامتؒ کی طرف سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے گذشتہ صدی میں تجدیدِ دین کے لئے منتخب فرمایا تھا، اور جسے اُمت کی نبض شناسی کی خاص توفیق مرحمت فرمائی تھی،

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان احکام کے سمجھنے اور اُن پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا و آخرت سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین،

احقر
محمد تقی عثمانی

تعارف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَاَوۡلِیَآءِہٖ
وَبَارِکۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا ط

اما بعد: "اصلاحِ انقلابِ امّت" حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے، جو حقیقی معنی میں حکیم الامت، مصلحِ ملّت اور مسیحِ وقت تھے، ان کی تابندہ و درخشندہ حیاتِ مبارکہ بالکل اس آیۂ مبارکہ کے مصداق تھی اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَاِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ۝ اور وہ صحیح معنوں میں اس شعر کی عملی تصویر تھے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مورخِ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ "حکیم الامت کے آثارِ علمیہ" کے باب "اصلاحیات"، میں حضرت والاؒ کی اصلاحی تصانیف کتاب ہٰذا اور حیٰوۃ المسلمین اور اصلاح الرسوم، صفائی معاملات، اصلاحِ امت وغیرہ) میں بطور تعارف تحریر فرماتے ہیں:

"ان کتابوں میں ہر ایک کا منشا، یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو، اور ان کے سامنے وہ صراطِ مستقیم کھل جائے جو ہدایت کی منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہے"،

(ماہنامہ معارف، صفر ۱۳۶۳ھ بحوالہ حیاتِ اشرف، ص ۱۵۵)

ہندوستان میں تاج کمپنی کو پہلی بار اس نادر کتاب کو شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ دورانِ خط و کتابت احقر نے برادرِ محترم محبِ مکرم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہم سے اس کتاب کی جلد دوم کی اشاعت کے بارے میں استفسار کیا، اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر اشاعت میں تاخیر دورِ حاضر کے مذاق کے مطابق ذیلی سرخیاں وغیرہ لگنے کے سبب ہو رہی ہے تو بندہ اس کیلئے

حاضر ہے، مولانا عثمانی صاحب مدظلہم نے اسے منظور فرمالیا، اور کتاب روانہ فرمادی، درحقیقت بندہ اس کام کا بالکل اہل نہ تھا، "صلاحِ کار کجا و من خراب کجا"

تاہم حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی ایک نادر اصلاحی تصنیف کی خدمت، کو سعادت جان کر توکلاً علی اللہ اس کام کو شروع کیا، اور ان باتوں کا اہتمام کیا۔

(۱) ہر باب میں ذیلی سُرخیاں قائم کرکے شروع میں ایک مکمل فہرست مضامین لگادی ہے، اس فہرست پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

(۲) کتاب کی زبان چونکہ علمی ہونے کی وجہ سے خاصی مشکل ہے، اس لئے قارئین کی سہولت کے مدِ نظر بعض مقامات میں مشکل الفاظ کا مفہوم قوسین میں لکھ دیا ہے،

(۳) اس کے علاوہ قرآنی آیات و احادیث، فقہی عبارات اور فارسی اشعار کا ترجمہ بھی قوسین میں کر دیا ہے، فقہی عبارات کے ترجمہ کے سلسلہ میں برادرم علامہ اختر علی صاحب سینیر اورنٹیل ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول ہارون آباد نے بڑا تعاون فرمایا، بلکہ بعض عبارات کی تصحیح اور حل کے لئے اصل فتاویٰ سے مراجعت فرمائی، حق تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین،

(۴) فقہی اصطلاحات (مثلاً طلاق بائن، خلع وغیرہ) کی تشریح حواشی میں کر دی گئی ہے،

(۵) جدید اردو میں بعض مقامات پر واؤ کا استعمال متروک ہوچکا ہے مثلاً "جاوے" "کھاوے" وغیرہ میں واؤ کو حذف کرکے "جائے" "کھائے" وغیرہ کر دیا گیا ہے،

غرض کہ کتاب کو حتی المقدور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جو صاحب اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں وہ احقر سراپا گناہ خاکپائے اہل اللہ کے لئے بطور خاص دُعاء فرمائیں، کہ حق تعالیٰ شانہٗ زندگی کی بقیہ ساعات میں اپنی مرضیات پر چلنے، نامرضیات سے بچنے کی توفیق بخشتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے افادات زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی توفیق بخشیں، اور اس ناکارہ کو بھی اُن پر عمل کی توفیق عنایت فرمائیں ؎

اُنہی کے طرزِ عمل پر ہوائے خدا جینا
ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس پر عمل کی نیت سے کیا جانا چاہئے،
اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی، آمین،

دعاؤں کا محتاج
بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

اِصلاحِ انقلابِ امت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِصلاحِ انقلابِ اُمّت (حصہ دوم)

اِصلاح متعلق بنکاح

مثل عبادات مقصودہ (ایسی عبادات جو اصل مقصود ہیں جن کا بیان حصہ اوّل میں ہو چکا ہے، مثلاً عقائد، دیانات مثل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، معاملات بیع وشراء، معاشرت مثل طعام، لباس وکلام وغیرہ، اخلاق باطنہ مثل ریاء وغیرہ) کے امر نکاح میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے (یعنی مختلف کوتاہیاں پھیلی ہوئی ہیں) اس لئے مختصراً ان پر بھی متنبہ کرنا ضروری ہے وَھِیَ ھٰذا :۔

ناکارہ ہونے کے باوجود بلاضرورت محض عرفی رسم سمجھ کر نکاح کرنا؛

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ بالکل ضرورت نہ ہونے، بلکہ باوجود از کار رفتہ (نکاح کے لئے بیکار ہونے کے) محض خاندانی یا عُرفی (رواجی) رسم سمجھ کر اپنی خدمت کی مصلحت سے جوان عورت یا لڑکی سے نکاح کرتے ہیں، اور اپنے ناکارہ ہونے کو منکوحہ و اولیاءِ منکوحہ (جس سے نکاح کرنا ہو اور نکاح کرنے والے کے ولی) سے چھپاتے ہیں، تو یہ لوگ اپنی وہمی مصلحت کے سبب دوسرے آدمی کو یقینی مفسدہ (خرابی) میں مبتلا کرتے ہیں، نتیجۃً اس کے دو امر ہوتے ہیں؛

(۱) اگر وہ عورت عفیفہ (پارسا) یا متعففہ (خود کو پارسا رکھنے والی) ہوئی، تب تو وہ تمام عمر کے لئے قیدِ شدید میں مبتلا ہوئی، اور اگر اس صفت سے معرّا (خالی) ہوئی تو بدکاری میں مبتلا ہوئی، اور دونوں حالتوں میں زوجین (میاں بیوی) میں ناگوار رنجش و نااتفاقی امر مشترک ہے۔

(۲) دوسری صورت میں دونوں کی بے آبروئی بلکہ دونوں کے خاندان کی بھی ساتھ رسوائی ہے؛

مال و زر کی طمع وحرص سے اپنی لڑکی کی زندگی برباد کرنا ،،،

بعضے لوگ یہ اندھیر کرتے ہیں کہ باوجود شہرت اس امر کے پھر بھی اپنی لڑکی ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جس کا سبب اکثر مال و زر کی طمع وحرص ہوتی ہے، جس کی اُن کو اپنے لئے توقع ہے، یا پہلے ہی لے لیتے ہیں،

بعض سادہ لوح نکاح کی غایت کھانا پینا سمجھتے ہیں

اور ان سے بھی زیادہ عقل کے دشمن وہ ہیں جو خود بھی منتفع نہیں ہوتے صرف اولاد کی احمقانہ خیرخواہی ہی اس کا باعث ہوتی ہے، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ خیر فراغت سے کھائے پہنے گی، تو ان سادہ لوحوں (بیوقوفوں) کو یہ خبر نہیں کہ نکاح کی غایت (مقصد) آیا کھانا پینا ہے یا مصالحِ زوجیت ؟ اگر امر اوّل غایت ہوتی تو چاہئے تھا کہ جو لوگ کھلانے پینے کی وسعت رکھتے ہیں یا خود وہ منکوحہ صاحبِ وسعت (مالدار) ہے تو ایسی جگہ نکاح ہی نہ کیا جایا کرتا حالانکہ مشاہد (دیکھا جاتا) ہے کہ بناتِ سلاطین (بادشاہوں کی بیٹیاں) تک اس سے مستغنی (بے نیاز) نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نکاح سے مقصود دوسرے ہی مصالح ہیں،

بدونِ موافقتِ تام کے نکاح کے مصالح پورے نہیں ہوسکتے،

اور وہ بدون موافقت تام (پورے) نہیں ہوسکتے، اور موافقت حالتِ مذکورہ میں ہو نہیں سکتی، پس وہ مصالح بھی اس حالت میں تام نہ ہوں گے، بلکہ بعض مصالح جو کہ مقتضاء ہیں طبیعت بشریہ کے وہ تام کیا، حاصل بھی نہیں ہوتے، اس لئے نکاح میں اس امر کی رعایت سخت ضروری ہے، تاکہ زندگی تلخ نہ ہو پھر مرد کو اگر عورت سے ناگواری پیش آئے تو وہ طلاق دے کر استخلاص (آزاد ہونے) پر قادر ہے، یا بدون طلاق دوسری عورت سے نکاح کرکے اس ناگواری کی تلافی (کمی پوری) کرسکتا ہے، مگر عورت بیچاری کیا کرے کہ عمر بھر سوختہ و افروختہ (جلی بھُنی) رہا کرے، اور تفریقِ قاضی (حاکم کے عورت کو شوہر سے الگ کردینے) کا سامان ہر جگہ میسّر نہیں ہوسکتا، اور بعض عورتیں اس اظہار کو خلافِ غیرت سمجھتی ہیں، بعض جگہ ایسے مواقع ہیں کہ عورت کو تپِ دق لگ گئی ہے اور گھُل گھُل کر خاتمہ ہوگیا، کیا یہ ظلم نہیں، خواہ عورت ایسا کرے یا اولیاء منکوحہ ایسا کریں،

عمر کے تناسب کا خیال نہ رکھنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں،

اور اسی کے قریب ہے عمر کے تناسب کا خیال نہ کرنا، جبکہ لڑکی بے زبان یعنی کنواری یا مثل کنواری (کنواری جیسی) کے غیرذی رائے (یعنی اپنی رائے نہ رکھنے والی) ہو، جیسا بعضے لوگ ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھوں سے تیرہ تیرہ ۱۳ برس کی لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں، یہاں بھی وہی مفاسد مرتب ہوتے ہیں، جو اوپر مذکور ہوئے، اور اس سے ایک مفسدہ زیادہ وہ یہ کہ اکثر بوڑھا پہلے مرجاتا ہے، اور وہ مظلومہ اکثر بوجہ

عرفاً رسم ورواج میں) عار ہونے کے جیسا بہت قوموں میں اب تک یہ جہالت موجود ہے، بیوہ بیٹھی رہتی ہے، علاوہ مفاسدِ مذکورہ کے بعض اوقات یہ غریب کھانے پینے سے محتاج ہو جاتی ہے اگر شرافتِ عرفیہ (رسمی شرافت) لئے ہوئے ہے کسی کی مزدوری نہیں کر سکتی، اور اگر مزدوری گوارا کی دوسرے گھر بلکہ بعض اوقات رہنا پڑتا ہے، چونکہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا، بدنفس (برے خیالات کے) لوگ اس بیچاری کے درپے ہوتے ہیں، اور کبھی ترغیب اور کبھی ترہیب (ڈرا دھمکا کر) کبھی کسی حیلہ (بہانہ) سے خاص کر جب اس میں بھی کوئی نفسانی تقاضا (نفسانی خواہش) ہو اس کی آبرو اور دین خراب کر دیتے ہیں، رہی مصلحتِ خدمت تو وہ دوسرے طریقہ سے بھی حاصل ہو سکتی ہے،

بغرضِ خدمت نکاح مقصود ہو تو کیسی عورت سے نکاح کرنا چاہئے!	اور اگر نکاح ہی پر موقوف ہو تو ایسی عورت سے نکاح کرے جو خود مختار ہو اور وہ اپنے لئے پورے طور سے رائے قائم کر سکے،

اور اس سے اس کی حالت د مصلحت پوشیدہ (چھپی ہوئی) بھی نہ ہو، اور بہتر یہ ہے کہ اس کی حالت سے بوجہ زیادتِ سن (عمر زیادہ ہونے کے سبب) یہ بھی گمان غالب ہو کہ اس میں تقاضائے نفسانی (نفسانی خواہش) نہیں رہا تو اس طرح سے کوئی مفسدہ مظنون (خرابی کا گمان) نہ ہوگا ہاں یہ ممکن بلکہ غالب ہے کہ ایسی عورت ہم کفو (ہم مرتبہ) کم ملے گی، تو خدمت کے لئے کفو ہی کی کیا ضرورت ہے، اس کا زیادہ لحاظ توالد وتناسل (اولاد کے ہونے اور نسل کے بڑھنے) میں کیا جاتا ہے، کہ اگر اولاد غیر کفو سے ہوئی اہلِ برادری عرفاً اس کو اپنے برابر نہیں سمجھیں گے اور ان کے ازدواج (شادی کرنے) وغیرہ میں تنگی ہوگی، تو جب یہ مرد ازکار رفتہ فرض کیا گیا ہے تو توالد وتناسل کی نوبت ہی کہاں آئے گی جس کے لئے غیر کفو ہونا نامناسب ہے،

مرد کو دھوکہ دے کر نکاح کر دینے کے مفاسد	ایک کوتاہی اس کا مقابل ایک امر ہے وہ یہ کہ منکوحہ کسی وجہ سے ایسی ہو کہ غالب ظن (گمان غالب) میں مرد اس کو پسند نہ کرے گا، اور اولیاء،

منکوحہ نے دھوکہ دے کر کسی سے نکاح کر دیا، مثلاً اس کو کوئی ایسا مرض ہے جو ہمبستری سے مانع ہے، کہیں کہیں ایسا مشاہدہ ہوا ہے کہ عورت رتقاء (جس کی تنگیِ فرج کے سبب جماع کرنا محال ہو)، یا قرناء (فرج میں ایک زائد گوشت کا پیدا ہونا جو لذتِ جماع میں حارج ہوتا ہے)، ایک جگہ مجنونہ (پاگل) کا نکاح ایک اندھے سے کر دیا تھا، اس نے شوہر کے کاٹ لیا وہ بھاگا، اور بعد رسوائی ہوئی، آخر طلاق ہوئی، مہر کا جھگڑا پڑا، ایک جگہ عورت بالکل بھوری تھی، یعنی جلد

ایسی سفید بھی جیسے برص کے مرض میں ہو جاتی ہے، سو مرد تو کہیں صابر شاکر بے نفس ہوتا ہے اور اس کو سر دھیلتا ہے، مگر تمام زندگی اس کی بے حلاوت (بے مزہ) ہوتی ہے، اور گو استخلاص بعض کو ممکن ہے مگر طبائع (طبیعتیں) مختلف ہیں، بعض اس کو بے مروّتی سمجھتے ہیں، بعضے وسعت کم رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کا اہتمام نہیں کرتے تو جن لوگوں نے اس کو دھوکہ دیا ہے اُن پر تو اس تلبیس (دھوکہ دہی) وایذاء رسانی (تکلیف پہنچانے) کا وبال ضرور ہی ہوگا،

بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ آسیب زدہ لڑکی کو کسی کے سر مڑھ دیا اور جب وہ متوجہ ہوا تو جنّ صاحب اُس کی طرف متوجہ ہوتے، غرض یوں ہی صبر کر کے رہ گیا، اور خدمت اس کی جدا اس کے ذمہ رہی، زر دادن و درد سر خریدن (رقم دے کر سر کا درد خریدنے) کی مثل صادق آگئی، تو یہ لوگ لڑکی کے لئے شوہر تجویز نہیں کرتے، بلکہ اس کے لئے ایک مزدور تلاش کر لیتے ہیں، اور خاصکر ان عوارض (پیش آنے والی چیزوں) کے ساتھ بی بی صاحبہ بدزبان و بدمزاج بھی ہوں تب تو اچھی خاصی شوہر کے لئے دوزخ ہے،

اسی طرح اگر وہ اندھی ہو، کانی ہو، مبروص (برص کے مرض میں مبتلا) ہو، مجذوم (جذام کے مرض میں مبتلا) ہو، ان سب کا نتیجہ بُرا ہے، اگر مرد بے نفس ہوا تو اس کی زندگی ان عنایت فرماؤں کی بدولت برباد ہوئی، اور اس سے صبر نہ ہو سکا تو اس نے اس عورت کو تکلیف پہنچانا شروع کیا، جس سے اس پر ایک مصیبت مرض وغیرہ کی تو پہلے ہی سے تھی ہی، دوسری اور بڑھ گئی اور ان دونوں سے یہ ناچاقی (نااتفاقی) متجاوز (حد سے آگے) ہو کر دونوں کے خاندانوں تک مؤثر ہوتی ہے

مرد اور عورت کے مزاج ناموافق ہونے کے مختلف عوارض،

ان میں باہم عداوت (دشمنی) ہو جاتی ہے، مقدمہ بازی ہوتی ہی، کبھی تفریق (علیحدگی) کی کوشش کی جاتی ہے، اور مرد انکار کرتا ہے، کبھی مہر کی نالش (دعویٰ) ہوتی ہے، کبھی جھوٹے گواہ معافی کے بنائے جاتے ہیں، اور کبھی باوجود معاف کر دینے کے جھوٹا حلف معاف نہ کرنے کا گوارہ کر لیا جاتا ہے، غرض ہزاروں خلجان (الجھاؤ) کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن سب کی جڑ مرد و عورت کا ناموافق ہونا ہے، جس کے اسباب کہیں مرد کے عوارض ہیں کہیں عورت کے،

نکاح کے معاملہ میں زوجین اور اولیاء زوجین کو نہایت دیانت اور صفائی سے کام لینا چاہیئے

چونکہ نکاح بھی ایک معاملہ ہے، جس کا تعلق دو نئے آدمیوں سے ہے اس لئے زوجین و اولیاء زوجین کو اس میں نہایت دیانت و صفائی سے کام لینا واجب ہے، کہ کسی قسم کا خلجان محتمل (الجھاؤ کا احتمال)

نہ رہے، جہاں تک اپنا ذہن رسائی کرے ہر بات کو صاف کردے،

باوجود ضرورت نہ ہونے کے براہِ ہوسناکی کئی کئی بیویاں کرنے کے مفاسد

ایک کوتاہی یہ ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے بعض لوگ براہِ ہوسناکی کئی کئی بیبیاں نکاح میں جمع کرلیتے ہیں، اور یا تو بوجہ اس کے کہ مرد میں دین یا وسعت کم ہے اُن میں عدل نہیں ہوسکتا، یا بوجہ اس کے عورتوں میں دین یا عقل کم ہے باوجود شوہر کے عدل رکھنے کے پھر بھی وہ باہم لڑتی جھگڑتی ہیں، یا شوہر سے بگڑتی ہیں، اور عدل نہ رکھنے کی صورت میں مرد پر مخالفتِ شرع (شریعت کی مخالفت) کا الزام ظاہر ہی ہے، جس سے احتراز (بچنا) واجب ہے، اور جہاں غالب گمان اس عدل کا ہو اس عدم کے سبب سے بھی کہ تعدّدِ ازواج (بیویوں کے ایک سے زائد ہونے) سے بناء بر اس کے کہ مقدمہ ناجائز کا ناجائز ہے احتراز واجب ہوگا، اور عدل رکھنے کی صورت میں مرد پر یہ الزام تو نہیں، لیکن پریشانی میں تو پڑ گیا جس کے بڑھ جانے سے بعض اوقات دین میں خلل پڑنے لگتا ہے اور بعض اوقات صحت وعافیت میں، اور اس کے واسطہ سے احیاناً دین میں بھی خرابی آجاتی ہے،

پریشانی کے بڑھ جانے سے دین میں خلل آنے کا ظنِ غالب ہو تو اس پریشانی اور اس کے اسباب سے بچنا واجب ہے،

جہاں اس کا ظنِ غالب ہو ایسی پریشانی سے بچنا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ ہی پریشانی کے اسباب سے بھی کہ اس .... موقع پر تعدّدِ ازواج ہے، بچنا لازم ہوگا، اگر یہ لزوم بدرجۂ وجوب شرعی بھی نہ ہوتا تاہم عقل کا اقتضاء (تقاضا) تو ضرور ہے، اور شرعاً بھی مرضی و مستحسن (پسندیدہ اور اچھا) اور اس کا خلاف ناپسندیدہ وغیر مستحسن ہوگا، اور اس کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ تعدّدِ ازواج میں فی نفسہٖ کوئی کراہت ہے، نعوذ باللہ، کیونکہ اسکی اباحت بلاکراہت منصوص قطعی (قرآن سے ثابت) ہے، اور سلف میں بلانکیر شائع (رائج) تھا،

تعدّدِ ازواج کا انکار تقلیدِ ملاحدۂ یورپ کا سبب ہے،

اس میں کراہت یا حرمت کا اعتقاد یا دعویٰ اور اس کی بناء پر آیاتِ قرآنیہ میں تحریف کرنا جیسا کہ اس وقت تقلید ملاحدۂ یورپ بعض مسلمانوں کے لئے اس کا سبب ہوگئی ہے سراسر الحاد وبددینی ہے، اصل عمل میں شائبہ (شک) بھی کراہت یا ناپسندیدگی کا نہیں، اور نہ اُس کا جواز (جائز ہونا) بمعنی صحت و نفاذ متیقن عدل کے ساتھ مقید (یعنی نکاح کا صحیح اور نافذ ہونا عدل کرسکنے کی شرط کے ساتھ پابند ہے)، بلکہ اگر عدمِ عدل (انصاف نہ ہوسکنے) کا تیقن (یقین) بھی ہو تب بھی

صحت و نفاذ اس کا یقینی،

> **بعض عوارض کے سبب تعدّدِ ازدواج گناہ ہو سکتا ہے**

البتہ بعض عوارض کے سبب اس کا جواز بمعنی عدم الاثم (گناہ نہ ہونے) مرتفع ہو جاتا ہے، یعنی جب احتمال غالب عدمِ عدل کا ہو تو اس وقت باوجود استحسان فی نفسہٖ (بنفسہٖ اچھا ہونے) کے اس عارضِ خاص کی وجہ سے اس تعدّد سے منع کیا جائے گا، لقولہٖ تعالیٰ:۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً، (النساء، آیت ۳)

(پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو)

لیکن خود عورتوں کی بے اعتدالیوں کا اندیشہ ہو تو اس وقت تعدّد سے نہی شرعی (شرعی ممانعت) تو نہیں، لیکن قواعدِ شرعیہ (شریعت کے اصولوں) کی رُو سے مشورۃً ایک پر کفایت کرنے کے لئے کہا جائے گا، اور یہ مشورہ بھی اس معنی کو شرعی ہو گا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا تھا:۔

ھَلَّا بِکْرًا تُلَاعِبُھَا وَتُلَاعِبُكَ

( )

"کیا کوئی کنواری نہیں تھی کہ تم اس سے جی بہلاتے اور وہ تم سے دل بہلاتی"۔

> **بالغ ہونے کے بعد کنواری لڑکیوں کی جلد شادی نہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں**

اور اس کے مقابل ایک کوتاہی عورتوں کے متعلق ہے، یعنی کوتاہی مذکور کا حاصل تو مَردوں کے لئے توسّع (وسعت کرنا) تھا کہ کئی کئی عورتوں سے شادی کرتے ہیں، اور اس آئندہ کوتاہی کا حاصل عورتوں کے حق میں تنگی کرنا ہے، وہ یہ کہ بعض احوال میں ان غریبوں کے لئے خود شادی ہی کو مہتم بالشان نہیں سمجھتے، کہیں صرف عملاً کہیں اعتقاداً بھی، صرف عملاً ایسا کہ بعضے ناعاقبت اندیش کنواری لڑکیوں کو بالغ ہو جانے پر بھی کئی کئی سال بٹھلائے رکھتے ہیں، اور محض ناموری کے سامان کے انتظار میں ان کی شادی نہیں کرتے، حتیٰ کہ بعض بعض جگہ تیس[۱] تیس اور کہیں چالیس چالیس برس

---

[۱] بہتر اور مناسب تو یہی ہے کہ بچیوں کا جوان ہونے کے بعد فوراً نکاح کر دیا جائے، اور محض خیالی توہمات کی بناء پر زیادہ تاخیر نہ کی جائے، چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دو، ورنہ زمین میں بڑا فتنہ و فساد ہو گا"، اسی طرح جمع الفوائد میں بحوالہ رزین (

[illegible]

کی عمر کو پہونچ جاتی ہیں، اور اندھے سرپرستوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہے، حدیث رسول میں جو اس پر وعید آئی ہے کہ اگر اس صورت میں عورت سے کوئی لغزش ہوگئی تو وہ گناہ باپ پر بھی یا جو ذی اختیار اس پر بھی لکھا جاتا ہے،

بالغ ہونے کے بعد کنواری لڑکیوں کی جلد شادی نہ کرنے کے دنیوی مفاسد

اگر کسی کو اس وعید کا خوف نہ ہو تو دنیا کی آبرو کو تو دنیا دار بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس میں تو اس کا بھی اندیشہ ہے، چنانچہ کہیں حمل گرائے گئے ہیں، کہیں لڑکیاں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں، اگر کسی شریف خاندان میں ایسا بھی نہ ہو تب بھی وہ لڑکیاں ان سرپرستوں کو تو دل ہی دل میں کوستی ہیں، اور چونکہ وہ مظلوم[1] ہیں اُن کا کوسنا خالی نہیں جاتا، ان لوگوں کو یہ بھی شرم نہیں آتی کہ خود تو باوجود بوڑھے ہوجانے کے ایک بڑھیا کو کہ وہ اس لڑکی کی ماں ہے خلوت میں لے جاکر اس کے ساتھ عیش وعشرت کرتے ہیں، اور جس غریب مظلوم کی عیش کا موسم ہے وہ پہرہ داروں کی طرح ماما (نوکرانی) کے ساتھ اُن کے گھر کی چوکسی کرتی ہیں، کیسا بے ربط خبط (بے جوڑ دیوانگی) ہے،

جہیز کے انتظار میں نکاح میں تاخیر نہ کرنی چاہئے،

اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جس انتظار میں یہ ٹال مٹول کی ہے وہ بھی نصیب نہیں ہوتا، یعنی سامان اور زیور اور فخر کے لئے وہ سرمایہ بھی میسّر نہیں ہوتا، اور مجبوری کو جھک مار کر خشک نکاح ہی کرنا پڑتا ہے، پھر اُن سے کوئی پوچھے کہ دیر کرنے سے بجز خسارۂ دنیا و آخرت کے کیا حاصل ہوا، بلکہ اس دیر میں تو اور بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت ابن نجیح رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں منقول ہے مِسْكِينَةٌ مِسْكِينَةٌ لَيْسَ لَهَا زَوْجٌ، قَالُوْا وَاِنْ كَانَ كَثِيْرَةَ الْمَالِ قَالَ وَاِنْ كَانَ كَثِيْرَةَ الْمَالِ، یعنی محتاج ہے محتاج ہے وہ عورت جس کا خاوند نہ ہو، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ بہت مالدار ہو (تب بھی محتاج ہے) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ بہت مالدار ہو، (بندہ احقر قریشی غفرلہٗ)

[1] جیسا کہ حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِتَّقُوْا دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ "یعنی مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور حق شانہٗ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے"۔ حضرت شیخ سعدیؒ نے گویا اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن　٭　اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

بندہ احقر قریشی غفرلہٗ

خلائق کے نزدیک بدنامی ہی، کہ میاں اتنے دن بھی لگائے اور پھر خاک نہ ہوسکا، لڑکی کو اگر ایسا ہی دینے کا شوق ہو تو بعد نکاح کے دینے کو کس نے منع کیا ہے، اگر دعوتِ عامہ ہی کا شوق ہو تو دعوت کے ہزا ہیلے ہر وقت نکل سکتے ہیں، یہ کیا فرض ہے کہ سارے ارمانوں کی اسی مظلومہ پر مشق کی جائے، یہ بالکل ظلم صریح اور عملِ قبیح (بُرا کام) ہے،

موقع کا رشتہ نہ ملنے کا عذر بالکل صحیح نہیں، اور بعضے لوگ دیر میں یہ عذر کرتے ہیں کہ کیا کریں کہیں سے موقع کا رشتہ ہی نہیں آتا، تو کیا کسی کے ہاتھ..... پکڑا دیں؟ یہ عذر اگر واقعی ہوتا تو صحیح تھا، یعنی سچ مچ اگر موقع کا رشتہ نہ آتا تو واقعی یہ شخص معذور تھا، لیکن خود اسی میں کلام ہے کہ جو رشتے آتے ہیں آیا وہ سب ہی بے موقع ہیں، بات یہ ہے کہ بے موقع کا مفہوم خود انھوں نے اپنے ذہن میں تصنیف کر رکھا ہے، جس کے اجزاء یہ ہیں :۔

لائق داماد کی ذہنی تراشیدہ صفات (۱) حسب نسب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جیسا ہو، (۲) اور اخلاق میں جنیدؒ جیسا ہو، (۳) اور علم میں اگر وہ دینی ہے تو ابوحنیفہؒ کے برابر ہو اگر دنیوی ہی تو بوعلی سینا کا مثل ہو، (۴) حُسن میں یوسف علیہ السلام کا ثانی ہو (۵) اور ثروت و ریاست میں قارون و فرعون کے ہم پلّہ ہو،

بس اس کا لقب کہیں لائق داماد ہوگا، ان صفات کے لحاظ کا مضائقہ نہیں، بلکہ منجملہ حقوقِ اولاد کے ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دو امر اور بھی لحاظ کے قابل ہیں،

غلو ہر امر میں مذموم ہے ایک یہ کہ ہر امر میں استدلال مدِّ نظر رکھنا چاہئے، غلو ہر امر میں مذموم ہی، دوسرے یہ کہ ایک شخص میں تمام صفات کا مجتمع ہونا بھی شاذ و نادر ہے، پس اگر صفات مذکورہ بقدر ضرورت کسی میں مجتمع ہوں مگر ان میں جو اہم ہیں وہ موجود رہیں، اور وہ تین امر ہیں،

نکاح کرتے وقت لڑکے میں تین امر کا دیکھنا ضروری ہے ایکؔ قوتِ اکتساب (کمانے کی قوت) دوسرے کفاءت (برابری) میں زیادہ تفاوت نہیں، تیسرے دینداری، ان دونوں صورتوں میں زیادہ کاوش (کھوج) چھوڑ دے، ورنہ وہی بات پیش آئے گی، جس کا ذکر حدیث میں ؎ ہے کہ جب خُلق و دین میں

؎ وہ حدیث یہ ہے: اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ (رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ ؓ کذا فی المشکوٰۃ)

(بندہ احقر قریشی غفرلہٗ)

کفارت ہو تو نکاح کر دیا کرو ورنہ زمین میں فسادِ کبیر ہوگا، یہ تو تحقیقی جواب ہے اُن لوگوں کی غلط فہمی کا،

موقع کا رشتہ نہ ملنے کے عذر کے تین الزامی جوابات

اور تین جواب الزامی میں بھی اُن کے جواب میں قابلِ احتجاج ہیں ؛ ایک یہ کہ جن صفات کو جس درجہ میں تم دوسروں میں ڈھونڈھتے ہو تم کو جس شخص نے لڑکی دی تھی جس کی بدولت آج اپنی لڑکی کے باپ بن کر یہ جولانیاں دکھارہے ہو کیا اس شخص نے بھی تمھارے لئے ایسی ہی تفتیش وکاوش (تحقیق اور جستجو) کی تھی، اگر وہ ایسا کرتا تو تم کو عورت ہی میسر نہ ہوتی، اور ان باتوں کے بنانے کا موقع ہی نہ ملتا، غرض اس نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے جب ایسا نہ کیا تو تم نے یا تمھارے باپ نے دوسرے بھائی مسلمانوں کی بدخواہی کیوں کی، کہ باوجود تمھارے اندر ان اوصاف کے علی سبیل الکمال (مکمل طور پر) مجتمع نہ ہونے کے اس کی لڑکی پر نکاحی قبضہ کرلیا، آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگراں میسند (جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے کیوں پسند کرتے ہو) پر عمل کیوں نہیں کیا ؟

دوسرا الزامی جواب یہ ہے کہ جب تم اپنی دختر کے لئے ان صفات کا شوہر تلاش کرتے ہو، انصاف کرو تم جب اپنے فرزند کے لئے کسی کی لڑکی کی درخواست کی تھی، یا کرنے کا خیال ہی کیا اپنے صاجزادہ میں بھی یہ صفات اسی درجہ کی دیکھ لی ہیں یا دیکھنے کا ارادہ ہے، افسوس! آنچہ بر خود نہ پسندی بر دیگراں میسند کے مقولہ کا یہاں بھی خون کیا،

تیسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح لڑکوں میں بے شمار خوبیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں اگر دوسرا شخص تمھاری لڑکیوں میں اُس سے عُشر (دسواں حصہ) خوبیاں اور ہنر بھی دیکھنے لگے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام عمر ایک لڑکی بھی بیاہی نہ جائے، یہاں بھی وہی آنچہ برخود نہ پسندی بر دیگراں میسند کا اہمال (چھوڑ دینا) لازم آتا ہے،

غرض یہ عذر کہ رشتہ موقع کا نہیں آتا اکثر احوال میں بے موقع ہے، یہ تو بیان تھا عورتوں کے حق میں شادی کے باب میں عملاً تنگی کرنے کا،

اعتقاداً بیوہ کے نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھنا جہالت ہے،

اور اعتقاداً تنگی کرنا اور اہتمام نہ کرنا ایسا کہ جیسے اکثر لوگ بوجہ افراطِ جہل (بسبب کثرتِ جہالت) کے بیوہ کے نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھتے ہیں، بعض جگہ تو یہاں تک غضب سُنا ہے کہ منگنی ہونے کے بعد اگر لڑکا مرگیا تو پھر لڑکی کو تمام عمر بٹھلائے رکھا، اور یہ تو بکثرت ہے کہ بعد شادی کے بچپن میں یا جوانی میں بیوہ ہوگئی، بس اب

اس کی شادی کرنا گویا بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، بعض لوگ اگرچہ بوجہ جابجا علمِ دین اور وعظ کے چرچوں کے اب اس درجہ کا عیب نہیں سمجھتے مگر تاہم جس طرح اس لڑکی کی پہلی شادی کی فکر تھی دوسری شادی کی فکر اس سے آدھی بھی نہیں، یعنی اہتمام نہیں،

بیوہ کا نکاح ثانی نہ کرنے سے اس کی صحت، آبرو اور دین برباد ہونے کا اندیشہ ہے؛؛؛

اگر اس میں اور اُس میں فرق کیا ہے بلکہ اگر غور صحیح سے کام لیا جائے تو بہ نسبت نکاح اوّل کے نکاح ثانی اس بیوہ کا اہم ہے، کیونکہ پہلے تو وہ خالی الذہن تھی، مصالح زوجیت کا یا تو علم ہی نہ تھا یا تھا تو علم الیقین تھا، اور اب اس کو عین الیقین ہو گیا ہے، اس حالت میں اس پر وساوس و حسرات کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے، جس سے کبھی صحت، کبھی آبرو، کبھی دین، کبھی سب برباد ہو جاتے ہیں،

بیوہ کو شفقت اور محبت سے نکاحِ ثانی کی ترغیب دینی چاہئے

بعض لوگ کہتے ہیں ہم نے پوچھا تھا وہ راضی نہیں ہوتی، صاحبو! مجھ کو اس میں بھی کلام ہے کہ جو طریقہ پوچھنے کا ہوتا ہے اسی طرح پوچھا تھا؟ یا چلتی ہوئی بات کہہ کر الزام اتار دیا؟ پوچھنے پر جو بیوہ انکار کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اگر میں ایک دم سے راضی ہو جاؤں گی تو خاندان کے لوگ یوں کہیں گے کہ یہ تو منتظر ہی بیٹھی تھی خاوند کو ترس رہی تھی اس میں بدنامی ہوگی، اس خوف سے وہ ظاہراً انکار کر دیتی ہے، چاہئے یہ کہ اس کو اچھی طرح مصلحتیں بتلاؤ، اس کے وسوسے رفع کرو، شفقت اور اہتمام سے گفتگو کرو، اگر اس پر بھی وہ راضی نہ ہو تو تم معذور ہو،

بچوں والی عمر رسیدہ، صاحبِ وسعت بیوہ کو نکاح ثانی کرنا ضروری نہیں،

غرض حتی الامکان بیوہ کا نکاح ہی کر دینا مناسب ہے، البتہ اگر کوئی بیوہ بچّہ والی ہو اور عمر بھی ڈھل گئی ہو، اور کھانے پینے کی بھی گنجائش ہو اور وہ انکار کرتی ہو، اور قرائن سے استغناء (بے نیاز ہونا) اس کا زوج (شوہر) سے معلوم ہو تو اس کے لئے اہتمام ضروری نہیں،

زوجین کی مرضی کے خلاف نکاح کر دینے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر بلکہ قریب قریب کُل ہی مواقع میں متناکحین (نکاح کرنے والے جوڑے) کی مرضی حاصل نہیں کی جاتی، تعجب ہے کہ نکاح جو کہ عمر بھر کے لئے دو شخصوں کا تعلق ہے، جس کے ساتھ ہزاروں معاملات وابستہ ہیں، وہ تو کسی کا اور رائے ہو دوسرے کی، گو ان دو شخصوں کے مصالح کے یقیناً خلاف ہی ہو، اور گو وہ اپنی ناخوشی بھی ظاہر کرتے ہوں مگر ان کو ذرا نہ پوچھا جائے اور زبردستی نکاح کر دیا جائے، بعض دفعہ عین وقت تک متناکحین یا ان میں سے ایک برابر

انکار کرتا ہے مگر اس کو گھونٹ اور جبر کر کے خاموش اور لب بند کر دیا جاتا ہے، اور عمر بھر کی مصیبت میں اس کو جوت دیا جاتا ہے، کیا یہ عقل اور نقل کے خلاف نہیں ہے، اور کیا اس میں ہزاروں خرابیوں کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا اور پھر کیا ان خرابیوں کا کوئی انتظام یا انسداد (روک تھام) کیا جاتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ لڑکے لڑکی سے کہلوانا ضروری ہے،

صغیر یا صغیرہ پر ولایتِ جبریہ حاصل ہے | یا صغیر وصغیرہ پر ولایتِ جبریہ کوئی چیز نہیں، یا بالغہ پر ولایتِ استیذانیہ سکوتیہ (ایسی ولایت جس میں ولی نکاح کی اجازت مانگنے پر صرف خاموشی کافی ہے) کا انکار ہے، یا اولیاء کو مصالح مشخص کرنے کا حق نہیں، سو یہ مطلب نہیں، کیونکہ یقیناً بعض جگہ لڑکا اور لڑکی ذی رائے اکثر جگہ ذی رائے نہیں ہوتے، تو ان نادانوں کی رائے کیا، اور اس پر اعتماد ہی کیا، نابالغ ہونے کی حالت میں اگر شاذ و نادر ذی رائے بھی ہوں تو شاذ و نادر کا کیا اعتبار، یا بالغ اور ذی رائے ہونے کے باوجود حیاء جو خاصۂ فطریہ ہر انوثت و بکارت (عورت اور دوشیزگی) کا وہ طبعاً مانع ہوتی ہے تکلم (بات کرنے) اور اظہارِ رائے سے، بعض جگہ بلوغ و عقل کے انتظار میں موقع صالح ہاتھ سے نکل جاتا ہے، جو ظاہراً عاقد (عقدِ نکاح کرنے والے) کی سعی سے عمر بھر بھی نصیب نہ ہوگا،

نیز اکثر جگہ اولیاء... اپنے تجربہ اور شفقت سے جو تجویز کریں گے وہ مصلحت ہی ہوگی، اسی واسطے شریعتِ مقدسہ نے اپنے احکام و قواعد میں ان سب واقعات کا لحاظ کر کے مکمل قانون بنا دیا، اس لئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ کوئی عاقل یہ بات تجویز کر سکتا ہے کہ بالکل متناکحین کی رائے پر رکھ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اولیاء اپنے تجربہ و شفقت سے مصالح پر پوری نظر کر کے اس کے بعد بھی احتیاطاً و نظراً الی العواقب (احتیاط کے ساتھ نتائج پر غور کرتے ہوئے) اگر لڑکا لڑکی بالغ ہوں جو (بوجہ اس کے کہ اکثر بلوغ سبب ہوتا ہے ذی رائے ہونے کا) شرعاً ذی رائے قرار دیا گیا ہے،

نکاح سے قبل زوجین سے ان کی مرضی اور رائے معلوم کرنے کا احسن طریقہ | اس صورت میں قبل اس کے کہ باضابطہ اُن کی رضا، واذن (رضامندی واجازت) حاصل کی جائے، یعنی باکرہ بالغہ (بالغ کنواری) کو سُنا کر اس کے سکوت (خاموشی) کو معیارِ رضا قرار دیا جائے، اور ناکح بالغ سے مجلس میں قاضی کہلوادے کہ میں نے قبول کی، سو اس کے قبل بھی خاص طور پر اُن کی رائے دریافت کر جائے، جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں، جیسے ہم عمر دوست

اور سہیلیاں ان کے ذریعہ سے اس طور پر کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے بزرگ ہم سے یہ دریافت کررہے ہیں، ان کا مانی الضمیر معلوم کرلیا جائے، اور تجربہ کی بات ہے کہ اس طریقہ سے ضرور ان کے خیالات معلوم ہوجاتے ہیں، اور بعض دفعہ تو بے دریافت کئے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ظاہر کردیتے ہیں، اور اولیا، تک وہ خبریں پہنچ جاتی ہیں،

موجودہ زمانہ میں نکاح سے قبل متناکحین کی رائے معلوم کرلینا بہت ضروری ہے

مگر ظلم و ستم ہے کہ پھر بھی بعض مہمل موہوم مصلحتوں (فضول خیالی مصلحتوں) کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے اس خیال کی پرواہ نہیں کی جاتی، اور ان کو گھونٹ داب کر اس بلا میں پھنسا دیا جاتا ہے، خصوص اس زمانہ میں کہ بیحد ہوشیاری کا وقت ہے اس کی بہت ضرورت ہے، بہت مقامات ایسے ہوئے ہیں کہ ناپسندیدگی کی حالت میں نکاح کردیا گیا ہے، پھر ناکح صاحب نے عمر بھر اس منکوحہ کی خبر نہیں لی اور فہمائش (سمجھانے) پر صاف جواب دیدیا کہ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کردی تھی جنھوں نے اس پر بھی یہ عقد کیا ہے نفقات (اخراجات) کے وہ ذمہ دار ہیں،

خلاف مرضی نکاح کردینے کے مفاسد

اب بتلایئے اس مصیبت کا کیا علاج؟ ان بوسیدہ عقل بزرگوں کی تو مصلحت ہوئی اور غریب مظلوم تمام عمر کے لئے قیدِ غیر میعادی (غیر معینہ) میں گرفتار ہوئی، کہاں ہیں یہ فرسودہ عقل؟ اب آئیں اور اس مظلومہ کی کچھ مدد کریں، مگر مدد کیا کرتے، اوّل تو اس وقت تک مر کھپ بھی گئے، اور زندہ بھی رہ گئے تو ڈھیٹ تو دیکھئے یہ کہہ کر صاف الگ ہوگئے کہ صاحب کوئی کسی کی قسمت میں تو گھس ہی نہیں نکلا، ہم کیا کریں اس کی قسمت، ہائے غضب، کیا غضب کا جواب ہے، جس سے وہ مظلومہ تو درکنار غیر آدمی کے تن بدن میں بشرطیکہ تھوڑا منصف ہو آگ لگ جاتی ہے، بھلے مانسو کو قسمت کی خبر نہیں تھی، اس کی تو خبر تھی کہ خود صاحبِ معاملہ کانوں پر ہاتھ دھر رہا ہے جو ظاہراً وعادتاً اس کی علامت ہے کہ تقدیر میں بھی یوں ہی ہوگا کہ انجام اس کا پریشانی ہوگی،

غلطی کرکے تمسّک بہ تقدیر کا عذر غلط ہے،

اور اگر ایسا ہی تمسّک بتقدیر (تقدیر کو تھامنا) ہے تو بس کل کسی کو قتل کردیجیو، جب سزائے موت کے لئے پکڑے جاؤ تو کہدینا کہ ہم نے تو صرف ایک گولی ماری تھی، تقدیر کی کیا خبر تھی کہ ایک گولی سے مر ہی جائے گا، دیکھیں تو سہی اس عذر سے تم کو کون چھوڑدے گا، خدانکردہ (خدا نہ کرے) اگر وہ مقتول تمھارا ہی کوئی لگتا ہو تو دیکھیں گے کہ تم قاتل کا یہ عذر قبول کرلوگے، یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، کاش! اگر بجائے اس کے

اس وقت اپنی غلطی کا اعتراف ہی کر لیتے تو مظلوم کی کچھ تو تسلی ہو جاتی، ان بیہودہ جوابوں سے تو دُگنا اس کے زخم پر نمک چھڑکا جاتا ہے کہ ایک تو مجھ کو پھنسایا پھر کیسی صفائی سے بَری ہوتے ہیں،

پسندیدہ زمانۂ نکاح بعد بلوغ کے ہی ہے،

اگر نا کح و منکوحہ نابالغ ہوں اور اچھا موقع فوت ہوتا ہو تو دوسری بات ہے اور اگر ایسی کوئی ضروری مصلحت نہیں ہے محض رسم ہی کا اتباع ہے تو خود یہ رسم مٹانے کے قابل ہے، گو نکاح صحیح ہو جاتا ہے، انکار نہیں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

وَابْتَلُوا الْيَتَامٰى حَتّٰى إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء، آیت ٦)

(اور تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہونچ جائیں۔)

صاف مشیر ہے کہ پسندیدہ زمانہ نکاح کا بعد بلوغ کے ہے،

قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح کوئی نہیں ہو سکتا،

اور اس کوتاہی کے مقابل ایک غلو ہے، جو اس وقت اکثر نو تعلیمیافتوں میں بڑھتا جاتا ہے، وہ یہ کہ خلافِ مرضی نکاح کے بعض واقعات مضرّہ (نقصان دہ) انھوں نے احکامِ شرعیہ پر طعن اور ان احکام کے مقابلہ میں یورپ کے رسم و رواج کو ترجیح دینا شروع کیا، مجھ کو ان صاحبوں سے تعجب ہے کہ یہ حضرات اتباعِ فطرت و تحقیقِ واقعات (انسانی فطرت کی تقلید اور واقعات کی چھان بین) کے ازحد مدعی ہیں، اور پھر اُن کی نظر سے یہ واقعہ کیسے مخفی رہا کہ ہر قسم کے مواقع پیش آتے ہیں جن کے لئے کوئی ایک کلیہ کافی نہیں ہو سکتا، اس کے لئے پورے قانون کی ضرورت ہے، جو قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح (مصلحتوں کی رعایت کرنے والا) کوئی نہیں ہو سکتا، چنانچہ خود جن کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں یعنی اہلِ یورپ وہ خود روزانہ اس قانونِ شرعی کے استحسان کا اعتراف کرتے جاتے ہیں، پھر اُن کی نظر سے یہ فطرت کیسے مخفی رہی جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیم المزاج طبقۂ اُناث (صحیح مزاج والی عورتوں کے طبقہ) میں ودیعت کر رکھا ہے، کہ حیا، اُن کے لب پر مُہرِ سکوت لگائے ہوتے ہے،

عورتوں میں فطری طور پر ایک حیا کی شان پائی جاتی ہے

افسوس! ان صاحبوں نے اس امر فطری کی ذرا رعایت نہیں کی اور اگر ان کی نظر میں کوئی ایسی جماعت ہو جس میں یہ امر فطری نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے اس کے فطری ہونے میں شبہ ہو جائے، تو جواب یہ ہے کہ علامت فطری ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ عوارض مرتفع ہوں وہاں اس کا ظہور ہو، سو اس معیار پر اگر تحقیق کیا جائیگا تو اُناث میں اس سکوت کا فطری ہونا ثابت ہوگا،

ایسا خاص طرزِ تعلیم جس سے عورتوں میں حیا کا نام و نشان باقی نہ رہے ان کے واسطے سخت مضر ہے،

سبب اس کا خاص طرز ہی تعلیم کا جو خود ہی اُناث کے لئے نامناسب ہے، ورنہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں تک میں کہ جس میں نہ علم ہو نہ پردہ ہو ایک شان حیا کی پائی جاتی ہے،

شریعتِ مقدسہ نے تمام روئے زمین کے انسانوں کے جذبات کی رعایت فرمائی ہے،

قربان جائیے شریعتِ مقدسہ کے کہ تمام روئے زمین کے اصلی جذبات تک کی رعایت احکام میں فرمائی ہے، ان اہلِ غلو میں سے بعض کی میں نے یہ حکایت سُنی ہے کہ انھوں نے اپنی ناکتخدا (کنواری) لڑکی کے نکاح کے وقت علیٰ رؤس الاشہاد (گواہوں کی موجودگی میں) اس سے پوچھا کہ فلاں شخص سے تمھارا نکاح کیا جاتا ہے، تمھاری کیا رائے ہے؟ وہ خاموش رہی، اس پر جبر کیا، کہ مار ڈالوں گا ورنہ رائے ظاہر کرو، مجبوراً بیچاری کو کہنا پڑا کہ ہاں میری مرضی ہے، سبحان اللہ، کیا خوب صورتی سے رائے لی ہے، ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا سچ مچ تمھارے نزدیک اس طریقہ سے اسکا اصلی ما فی الضمیر معلوم ہوگیا؟ بس اسی عقل و دانش پر شریعت پر اعتراض کئے جاتے ہیں، اگر شریعت آپ سے قانون بنوائے تو بس ایسا ہی بناؤ،

زوجین میں نکاح کے وقت سب سے زیادہ قابلِ التفات چیز دین اور سب سے کم قابلِ التفات مال و جمال ہے،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس زمانہ میں منکوحہ میں زیادہ تر جمال کو ناکح (نکاح کرنے والے) میں زیادہ تر مال کو دیکھتے ہیں اور سب سے کم دین کو دیکھتے ہیں اور باقی اوصاف میں آرا مختلف ہیں، حالانکہ سب سے کم قابلِ التفات یہی مال و جمال اور سب سے زیادہ قابلِ التفات دین ہی ہے، اسی واسطے حدیث میں عورت کے باب میں:

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِحَسَبِهَا وَلِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ،

یعنی عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے، اے مخاطب تجھ کو دیندار عورت سے نکاح کرنا چاہیے (۱۲ من المصنف) ۔

لہ اس کے برعکس شریعت نے کنواری منکوحہ کی خاموشی ہی کو رضامندی کے لئے کافی سمجھا ہے، زبان سے کہنے پر زور نہیں دیا، (احقر قریشی عفی عنہ)

اور مرد کے باب میں:

إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ خُلُقَهُ وَدِينَهُ فَزَوِّجُوهُ اِن لَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ٥

"یعنی اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دو، ورنہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا۔"

وارد ہے، جس میں مال و جمال پر نظر نہ کرنے کا اور دین پر نظر کرنے کا امر فرمایا ہے،

نکاح کا مقصدِ اعظم زوجین میں باہم محبت و مودّت اور توافق ہے،

اور وجہ بھی اس کی ظاہر ہے کیونکہ نکاح جن مصالح کے لئے موضوع اور مشروع ہے، وہ زیادہ تر سب موقوف ہیں توافق (باہمی موافقت) و دوستی اور توادُد (آپس میں محبت) پر، ذالیہ الاشارۃ فی قولہ علیہ السلام

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّيْ اُبَاهِيْ بِكُمُ الْاُمَمَ،

(یعنی ایسی عورت سے نکاح کرو جو زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبت کرنے والی ہو کیونکہ میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔)

حتیٰ کہ توالد جو کہ غرض اعظم ہے نکاح سے، جہاں اس کے لئے صحتِ بدن و سلامتِ مزاج وغیرہ احوالِ طبیعیہ شرط ہیں وہاں یہی توادُد (محبت) ہے کہ بمنزلۂ جزو اخیر علتِ تامہ کے ہے توالد کیلئے، کیونکہ وہ موقوف ہے احبال (حمل ہونے) پر اور احبال طباً (حکمت کی رُو سے) موقوف ہے توافق انزالین (دونوں کے ایک ساتھ انزال ہونے) پر اور ظاہر ہے کہ وہ محبت و مودّت پر موقوف ہے، غرض بڑا مدار مصالح کا نکاح میں توادُد ٹھیرا،

محبت و مودّت میں بڑا دخل دین کو ہے

اور یہ یقینی بات ہے کہ توادُد میں جس قدر دخل دین کو ہے اتنا کسی چیز کو نہیں، سب علائق (تعلقات) قطع ہو جاتے ہیں بجز دین کے، حتیٰ کہ قیامت میں جو کہ وقت ہے تمام تعلقات کے قطع ہو جانے کا،

فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ،
(المؤمنون، آیت ۱۰۱)

("اور ان میں جو رشتے ناتے تھے اس روز نہ رہیں گے۔")

وقال تعالیٰ: وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔

وقال تعالیٰ: مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ

("بس یہ تمہارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے، پھر قیامت میں تمہارا یہ

بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا ط (العنکبوت، آیت ۲۶)	حال ہوگا کہ تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہوگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا")

یہ علاقۂ دنیویہ اس وقت بھی ختم نہ ہوگا، قال اللہ تعالیٰ:

اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ o (الزخرف، آیت ۶۷)	("تمام دنیوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے سوائے متقی لوگوں کے")

بغیر دین کے صرف مال وجمال بقاءِ محبت کے لئے کافی نہیں

خصوص مال وجمال کہ ان کی عمر تو بہت ہی کم ہے، مال تو ایک شب میں بے وفائی کرجاتا ہے، اور جمال ایک بیماری میں ختم ہوجاتا ہے، اور بعض امراض میں پھر عود (دوبارہ آنا) ہی نہیں کرتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے یا چیچک نکل آئے اور داغ نہ جائیں یا سر کے بال گرجائیں وغیرہ ذٰلک (اور اسی طرح دوسری بیماریاں)

پھر جب مقصود مال وجمال تھا اور وہ رخصت بلاعوض ہوگیا، تو تمام تر محبت والفت بھی جو اس پر مبنی (قائم) تھی وہ بھی ختم ہوئی، اور پھر زوجین میں ایک دوسرے کی نظر میں مبغوض (ناپسندیدہ) ہوگیا اور نباہ ہمیشہ کے لئے مشکل ہوگیا، اور چندے (بعض اوقات) اس کو بقاء ہی رہا تب بھی جہاں دین نہیں وہاں دیکھا ہے کہ مال وجمال بقائے محبت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جب دین نہیں اور ظاہر ہے کہ بددین آدمی کے نہ اخلاق درست ہوتے ہیں نہ اعمال و معاملات اور بداخلاقی و بدمعاملگی و بداعمالی کی جس میں مضاعتِ حقوق (حقوق ضائع کرنا) وخود پرستی وخود غرضی بھی آگئی، جو خاصہ ہے مبغوضیت پورا کردینے کا، پس جب شب و روز ایسے اسباب برابر واقع ہوتے رہیں گے، تو کہاں تک اُن میں محبت رہ سکتی ہے، پس باہم کدورت (رنجش) وناا تفاقی و غیظ و طیش پیدا ہونا شروع ہوگا، حتیٰ کہ تمام مصالحِ زوجیت ضائع ہوجائیں گے، ہم نے خود دیکھا ہے بی بی حسن وجمال میں حور کا بچہ اور شوہر مال ومنال میں قارون کے فرزند مگر میاں کی بددینی سے تو اکثر اور کہیں بی بی کی بدخلقی و بدمزاجی یا بدچلنی کے سبب میاں بیوی میں بول چال تک نہیں، وہ اس کو دیکھ کر منھ پھیر لے یہ اس کو دیکھ کر ناک بھویں چڑھائے، یہ دوسری جگہ روٹی پکواتے پھریں وہ باوجود مال ہونے کے الگ ایک ایک پیسہ کو ترسے، بعض جگہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ بی بی غایت نفرت کے سبب میاں سے پردہ کرتی ہے، یہ ثمرات ہیں بددینی کے باوجود مال وجمال ہونے کے، پس اس کا مقصود سمجھنا ہی حماقت ہے،

دین کے ساتھ اگر مال وجمال بھی جمع ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے،

ہاں اگر دین کے ساتھ یہ بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے، چنانچہ حدیث میں ہے أَمَّا مُعَاوِيَةُ فَصُعْلُوكٌ (یعنی جہاں تک معاویہ کا تعلق ہو وہ مسکین ہیں)

اور إِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَيْهَا فَانْظُرْ، او کما قال، (اگر ہو سکے تو نکاح سے پہلے اس عورت کو دیکھ لینا")

مشیر بھی ہے، اور ایک درجہ میں مال وجمال کی رعایت کی طرف، لیکن غلو اس میں بھی بیشک مذموم ہے، جیسا اوپر حدیث ہی سے ثابت ہے،

نکاح سے قبل داماد کے مسلمان ہونے کی تحقیق ضرور کرنی چاہئے

اسی مضمون پر تفریع کے طور پر ایک یہ امر بھی قابلِ تنبیہ ہے کہ آجکل نو تعلیم یافتہ طبقہ میں بعضے لوگ ایسے آزاد اور بیباک پائے جاتے ہیں جو بلا تکلف بدولتِ تقلیدِ ملاحدہ یا بطفیل ہوا پرستی وخود رائی قطعیات (یقینی عقائد واحکام) میں مخالفانہ کلام کرتے ہیں، کسی کو رسالت میں کلام ہے، کسی کو نماز وروزہ کے احکام پر نکتہ چینی ہے، کسی کو واقعاتِ یقینیہ معاد (قیامت کے یقینی واقعات) پر شبہات ہیں، سو خوب سمجھ لو کہ:

مِثْلُ ذٰلِكَ الرَّجُلِ كَافِرٌ وَإِنْ زَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ، (ایسا آدمی کافر ہے خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتا ہو")

اور مسلمہ کا نکاح کافر مرد سے نہیں ہوتا، یا اگر مسلمان ہونے کے بعد کوئی ان امور سے کسی کا مرتکب ہوا تو کافر ہو جاتا ہے، اور نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے، پس بیحد ضرورت ہے کہ نکاح کے قبل داماد صاحب کے داڑھی اور فیشن کو اگر نہ دیکھو تو اس کے مسلمان ہونے کی تو تحقیق کر لیا کرو، اور بعد نکاح ایسا امر پیش آئے تو توبہ کرا کر تجدیدِ نکاح کرا دیا کرو، بہت مہتم بالشان (انتہائی اہمیت والا) امر ہے،

ضرورت اور وسعت ہونے پر نکاح ثانی کرنا واجب ہے

ایک کوتاہی اس باب میں جو کہ سب سے اول کوتاہی کے مقابل ہے یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود ضرورت کے اور باوجود وسعت کے نکاح..... نہیں کرتے، بعضے تو اول ہی سے نہیں کرتے اور بعضے ایک بیوی کے مرنے یا طلاق دیدینے کے بعد پھر نہیں کرتے، سو خوب جان رکھو کہ جب ضرورت یعنی نفس میں تقاضا ہو اور وسعت بھی ہو گو اس قدر ہو کہ روز کے روز کماؤں گا اور کھلاؤں گا تو نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہے، اور اس کے ترک سے گناہگار ہوگا،

نکاح کس صورت میں فرض ہے

اور اگر وسعت کے ساتھ بہت زیادہ تقاضا ہے کہ بدون (بغیر) نکاح

کئے ہوئے فعل حرام میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے تو نکاح کرنا فرض ہوگا،

وَمِنَ الْفِعْلِ الْحَرَامِ النَّظَرُ المحرم والاستمناء بالکف، | (فعل حرام میں نظرِ حرام اور جلق بازی بھی شامل ہے،)

نکاح کس صورت میں سنت ہے اور کونسی صورت میں ممنوع؟

اور اگر ضرورت کا درجہ نہیں لیکن قدرت ہے ادائے حقِ زوجہ پر تب بھی سنت ہے، البتہ اگر اندیشہ ہو بی بی کے حق ادا نہ کرسکنے کا خواہ حقِ نفس خواہ حقِ مال تو ایسے شخص کے لئے البتہ نکاح کرنا ممنوع ہے،

صرف ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو تب بھی نکاح واجب ہے

اور اگر ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو اس میں اقوال مختلف ہیں، احقر قولِ وجوب کو راجح (افضل) سمجھتا ہے، اور وسعت کا تدارک محنت، مزدوری یا قرض سے کرلے، جس کے ادا کی نیت مصمّم (پکی) رکھے، اور ادا کی کوشش بھی کرے، اور اگر اس پر بھی ادا نہ کرسکا تو امید ہے حق تعالیٰ اس کے مخاصم (قرضخواہ) کو راضی فرمادیں گے کیونکہ اس نے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کیا تھا، اس میں مقروض ہوگیا تھا، مگر فضولیات کے لئے یہ قرض جائز نہیں، بلکہ صرف نان نفقہ کے لئے یا مہر کے لئے جہاں کہیں مہر کُلّاً یا بعض (پورا یا اس کا کچھ حصہ) فوراً لیا جاتا ہو، بہرحال اس مقام پر کلام اس میں ہے کہ جب ضرورت اور وسعت دونوں ہوں تو نکاح واجب یا فرض ہوگا، پھر بھی بعض لوگ نہیں کرتے جس کے اسباب مختلف ہیں،

نکاح کا ترک فی نفسہ عبادت نہیں؛

بعض تو نکاح نہ کرنے کو قربت وعبادت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقاد رہبانیت اور بدعت فی الدین (دین میں نئی بات گھڑنا) ہے، اصل عمل مامور بہ شرعاً (جس عمل کا شریعت نے حکم دیا ہے) نکاح ہی ہے، تو اس کا ترک فی نفسہ عبادت نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ظاہر ہے، اور بعضے بیوی کے مرنے سے ..... بددل ہوکر بزعمِ خود تارکِ دنیا بنتے ہیں، بہرحال یہ دونوں ترکِ دنیا کا قصد کرتے ہیں، ایک ابتداء ہی سے، اور ایک بی بی کی وفات کے بعد سے،

حالتِ ضرورت میں عدمِ نکاح سے فتنِ کثیرہ میں مبتلا ہوگا

حالانکہ جب حالت ضرورت کی ہے تو ترکِ نکاح سبب ہوجائیگا فتنِ کثیرہ (بہت سے فتنوں) کا، چنانچہ وساوس وخطرات کا ہجوم جو عبادات میں حلاوت وطمانیت (لذت اور اطمینان) کو بالکل ہی برباد کردے گا، یہ ذیک، حالتِ مشترکہ ہے، اور بعضے ان وساوس وخطرات سے متأثر ہوکر اُن کے مقتضا پر عمل بھی،

صادر ہوجاتا ہے، چنانچہ بعض تو عورتوں سے مبتلا ہوجاتے ہیں، اور بعضے اپنے ظاہری تقدس کی حفاظت کے لئے عورتوں سے بچتے ہیں کہ اس میں آدمی جلد بدنام ہوجاتا ہے نوعمر لڑکوں سے مبتلا ہوجاتے ہیں،

نوعمر لڑکوں میں مبتلا ہونا فتنۂ عظیم ہے

اور یہ اس سے بڑھ کر فتنہ ہے، کیونکہ وہ کسی حالت میں تو محل ہے حلّت کا (حلال ہونے کا مقام ہے) بخلاف اس کے محرّمِ محض (قطعی حرام) ہے پھر ان میں سے بعض تو اصل فعل سے بچے رہتے ہیں، مگر اس کے مقدمات میں مثل قُبلہ ولمس (بوسہ اور چھیڑ چھاڑ) وغیرہ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، جس میں دوسرے بدگمان نہ ہوں، حتیٰ کہ خود متمتّع (جس سے لذّت اندوز ہوا) کہ وہ اس کو بزرگانہ شفقت پر محمول کرے گا، نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (ہم اللہ سے تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے پناہ چاہتے ہیں)۔

ترکِ دنیا سے ترکِ معصیت زیادہ ضروری ہے

تو ترکِ دنیا اتنا ضروری نہ تھا جتنا ترکِ معصیت، پس ان لوگوں کی وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، یہ اسباب تو مردوں کے ترکِ نکاح کے ہیں، خواہ نکاح اوّل ہو یا نکاحِ ثانی،

عورتیں باختیارِ خود بے نکاح رہنے کو ترجیح نہیں دیتیں

اور عورتیں ایسی بہت کم ہیں یا نہیں ہیں کہ باختیارِ خود اول سے بے نکاح بیٹھنے کو ترجیح دیں، اور کسی عارض (معذوری) کے سبب نکاح کی صورت نہ بن پڑے تو اور بات ہے، جیسے اس کو کوئی مرض ہے، کوئی قبول نہیں کرتا، یا دھوم دھام کے سامان کا ان کو انتظار ہے، گو یہ انتظار مذموم ہے، مگر تاہم ان لوگوں نے ترکِ نکاح کو فی نفسہٖ نکاح پر ترجیح نہیں دی، لیکن

بعضی عورتوں کا نکاحِ ثانی کو عیب یا ذلت کا موجب سمجھنا سخت قابلِ گرفت غلطی ہے

ایسی عورتیں بکثرت ہیں جو نکاحِ ثانی کے ترک کو اس کے فعل پر ترجیح دیتی ہیں، جس کا سبب بکثرت تو یہی ہے کہ وہ نکاحِ ثانی کو عیب سمجھتی ہیں، اور بعضی زبان سے بھی ایسی باتیں کہہ ڈالتی ہیں جن میں بعض باتیں تو حدِ کفر تک پہنچ جاتی ہیں، اور بعضی عیب بھی نہیں سمجھتیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عورتیں بھی بے نکاح بیٹھے رہنے کو زیادہ عزت کا سبب سمجھتی ہیں، اور یہ بھی درحقیقت ایک چھپا چور ہے۔ جس کا وطن اس سرحدِ کفر میں داخل نہیں، مگر اس کے جوار (قرب) میں تو ضرور ہے، ورنہ کامل مسلمان کیا وجہ کہ خلافِ سنت کو زیادہ اعزاز کا سبب سمجھے، اور بعض غریب ایسی بھی ہیں جو نکاح کو ہر طرح مستحسن سمجھتی ہیں، اس سے ذرا بھی انقباض (ناپسندیدگی) نہیں، مگر جانتی ہیں

کہ بچے ضائع ہوجائیں گے، یا یہ کہ کوئی اس کو قبول نہیں کرتا، یہ دونوں معذور ہیں، بلکہ پہلی تو ماجور (ثواب پانے والی) ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آیا ہے،

منکوحہ کے مال پر نظر رکھنا بڑی بے غیرتی ہے،

ایک کوتاہی ناکحین (نکاح کرنے والوں) میں یہ ہے کہ منکوحہ (جس سے نکاح کرنا مطلوب ہو) کے مال کو دیکھتے ہیں، اور در حقیقت یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ منکوحہ یا اس کے اولیاء مرد کے مال کو دیکھیں، کیونکہ یہ تو کسی درجہ میں اگر اس میں غلو نہ ہو امر معقول ہے، کیونکہ مرد پر نفقہ و مہر عورت کا واجب ہوتا ہے، تو اس پر استطاعت رکھنے کو دیکھنا مضائقہ نہیں، بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے، البتہ اس میں ایک قسم کا غلو ہوجانا کہ اس کو اور ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے یہ مذموم ہے، لیکن عورت کے مالدار ہونے پر نظر کرنا محض اس غرض سے کہ ہم اس سے منتفع (فائدہ اٹھانے والے) ہوں گے، یا ہم پر نفقات وغیرہ کا بار کم پڑے گا بڑی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے سے

چو باز باش کہ صیدی کنی و لقمہ دہی
طفیل خورہ مشو چوں کلاغِ بے پر و بال

اس کے علاوہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مالدار عورت نادار مرد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، اس کو حقیر اور خادم سمجھتی ہے، اور ناکح کے والدین کا اس پر نظر کرنا کہ ایسی بہو کو بیاہ کر لائیں کہ جہیز بہت سالائے اور بھی احمق ہیں، ان کی بھی وہی مثل ہے کہ ع

چو موش بر سرِ دُکانِ روستا خورسند

اوّل تو وہ جہیز مِلک بہو کا، کسی کو اس سے کیا، لیکن اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ گھر میں رہی گا تو ہمارے بھی کام آئے گا (اس سے) اوّل تو وہی بے حمیتی (بے غیرتی) دوسرے اگر اس کو گوارہ بھی کر لیا جائے تو اس خیال کے ناکح کو تو کسی درجہ میں گنجائش ہے مگر ساس سسر کو کیا واسطہ، آج صاحبزادہ صاحب اپنی رائے سے یا بیوی کے کہنے سے جُدا ہو جائیں بس ساری امیدوں پر پانی پھر جائے،

اپنے برابر والوں سے تعلق نکاح قائم کرنے سے ہر قسم کے مصالح محفوظ رہتے ہیں،

البتہ اگر منکوحہ کے زیادہ مفلس نہ ہونے پر ایک مصلحت کی تحصیل کیلئے اور ایک مضرّت کے دفع کے لئے نظر کی جائے تو وہ نازیبا نہیں، بلکہ مناسب ہی، وہ منفعت تو یہی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفلس محض میں دوام کی کمی ہوتی ہے، ایک سلیقہ کی دوسری سیر چشمی کی، پس سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی، اور اس سے کلفت ہوتی ہے، اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچوں

میں تنگی کرتی ہے، جس سے بعض اہلِ حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں، اور بعض مقامات پر شرمندگی بھی ہوتی ہے، کسی مہمان کو روٹی کم دیدی، کسی سائل حاجتمند کو محروم کردیا، اور اگر وہ بچپن سے کھانے پینے، دینے دلانے، کھلانے پلانے میں رہی ہوگی تو راحت اور انتظام کی زیادہ امید ہے، اور وہ مضرت (نقصان) یہ ہو کہ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتًا مال و دولت کو دیکھکر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اور اُچھلنے لگتی ہیں، اور سلیقہ ہوتا نہیں، پس بے تمیزی سے اس کو اڑانا شروع کردیتی ہیں، چنانچہ اکثر نو دولتوں کو یا بخل کی بلا میں مبتلا پایا یا اسراف کی، ان میں اعتدال کم ہوتا ہے، کیونکہ عادت نہیں تھی اموال سے منتفع ہونے کی جو اعتدال سیکھتی، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اس کو محبت نہیں ہوتی، نقد الگ، جنس الگ کبھی ظاہر میں کبھی خفیہ (چھپا کر) جس طرح بن پڑتا ہے اپنے میکے والوں کو بھرنا شروع کردیتی ہے، اور عمر بھر یہی نزلہ بہتا رہتا ہے، اور اس سے گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے، مرد کما تا کماتا تھک جائے مگر وہ اُڑانے سے نہیں تھکتی، اس لئے مناسب یہ ہے کہ جہاںتک ہوسکے اپنی برابر والوں میں تعلق نکاح کا کرنا تاکہ سب مصالح محفوظ رہیں، اور یوں کسی کی طبیعت ہی خاص رنگ کی ہو اس کا ذکر نہیں،

چھوٹی عمر میں نکاح کردینے کی خرابیاں

اور ایک کوتاہی بعض قوموں میں یا بعض لوگوں میں یہ ہے کہ اکثر بہت تھوڑی عمر میں شادی کردیتے ہیں، کہ جس وقت اُن مناکحین کو کچھ بھی تمیز نہیں ہوتی، کہ نکاح کیا چیز ہے، اور اس کے کیا حقوق ہوتے ہیں، اس میں بہت سی خرابیاں نکلتی ہیں، بعض اوقات لڑکا نالائق نکلتا ہے، جس کو منکوحہ سیانی ہوکر یا اولیا منکوحہ پسند نہیں کرتے، اب فکر ہوتی ہے تفریق کی، کوئی مسئلہ پوچھتا پھرتا ہے، کوئی بے مسئلہ پوچھے ہی دوسری جگہ نکاح کردیتا ہے، کوئی تفریق یا خُلع[۱] کی دیوانی میں درخواست کرتا ہے، کوئی منکوحہ کو اختیارات فسخ حاصل ہونے کی تحقیق بلکہ کوشش کرتا پھرتا ہے، لڑکا ہے کہ براہِ سرکشی نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے نہ اس کو طلاق دیتا ہے، غرض ایک بلائے بے درماں (لاعلاج مصیبت)

---

[۱] خلع: اگر میاں بی بی میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے تو عورت قاضی شرع کی عدالت میں کچھ مال دے کر یا اپنا مہر معاف کرکے شوہر سے درخواست کرے کہ میری جان چھوڑ دے اور شوہر اس پر راضی ہوکر اس کے جواب میں کہے کہ میں نے تیری جان چھوڑ دی ہے، اس سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑتی ہے، جس کے بعد مرد کو اس عورت کو روک رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا، عورت کے اس طرح اپنی جان چھڑانے کو شرع میں خُلع کہتے ہیں، البتہ خلع کیلئے قاضی کی شرط ایک لازمی امر ہے، (احقر قریشی غفرلہٗ)

ہوگئی. بعض اوقات دونوں بچپن میں ایک جگہ کھیلتے اور لڑتے ہیں، جس کا اثر بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے شوہر کی وقعت (قدر وعزت) عورت کے دل میں نہیں ہوتی، اور اس کی جو خرابیاں ہیں ظاہر ہیں، اور بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ باہم تنافر وتباغض (آپس میں نفرت اور بغض) پیدا ہو جاتا ہے، اور چونکہ ابتداء سے دونوں ساتھ رہے تو شوہر کو کوئی خاص میلان، کیفیتِ شوقیہ کے ساتھ نہیں ہوتا، جیسا کہ بلوغ کے بعد نئی منکوحہ کے ملنے سے ہونا متوقع و مظنون ہے، اور اس قلتِ میلان کا ثمرہ بھی ہر طرح بُرا ہی بُرا ہے،

بڑی عمر کی لڑکی سے چھوٹے عمر کے لڑکے کا نکاح کر دینے کے مفاسد اور خرابیاں

اور اس سے اقبح واشنع (بہت زیادہ بُرا) یہ ہے کہ جس کا ارتکاب بعض حمقاء، محض اپنی خاندانی مصلحتوں سے، قطع نظر زوجین کے مصالح سے) کرتے ہیں کہ لڑکا چھوٹا اور لڑکی بہت بڑی، اب لڑکی تو پہلے ... جوان ہوگئی، اور لڑکا ابھی چُوں چُوں کا بچہ ہے، بلکہ کہیں اتنا تفاوت (فرق) ہے کہ لڑکا اس کی گود کے کھلانے کے لائق ہے، ان بے عقلوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ آپس میں رشتہ ہو جائے آگے کو بھائی بہن کی اولاد میں تعلق وارتباط رہے، مگر یہ نہ دیکھا کہ ان سب تعلقات وارتباطات کی اصل بنیاد زوجین کا توافق ہے، اور اس صورت میں خود اسی کی امید نہیں، چنانچہ ایسے مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ لڑکی میں جوانی کا تقاضا پیدا ہو گیا اور لڑکا کسی قابل ہی نہیں، پس یا تو وہ اور کسی سے خراب وخستہ ہوگئی، یا گھُٹ گھُٹ کر مدقوق (تپِ دق میں مبتلا) ہوگئی، اور پھر وہ اگر جوان بھی ہوا تو اس کے جوڑ کا نہیں، ابتدائی تنافر (باہمی نفرت) کا اثر موجود، اور اس سے بڑھ کر ناکح کی وقعت مفقود (شوہر کی عزت ختم)

بعض جگہ کم سنی میں تناکح (نکاح کرنے سے) یہ ہوا کہ بعد جوان ہونے کے وہ لڑکی اس لڑکے کو پسند نہیں، وہ اپنے لئے کہیں اور تلاش کر لیتا ہے، اور اس کی نہ خبر گیری کرتا ہے نہ طلاق دیتا، اگر خبر گیری کی نسبت تو عذر کر دیتا ہے کہ مجھ کو خبر ہی نہیں کہ میرا نکاح کب ہوا؟ جنہوں نے کیا وہ ذمہ دار ہیں، اور طلاق دینے کو عرفاً عار سمجھتا ہے، پس وہ عورت ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ[1] کی مصداق ہو جاتی ہے، کیا ان خرابیوں سے بچنے کی کوشش کرنا ضرور نہیں؟

بعد بلوغ اور درستیِ عقل کے نکاح میں سلامتی ہے،

جس کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ بعد بلوغ اور درستیِ عقل کے نکاح کیا جائے تاکہ جس کا معاملہ ہے وہ اس کو سمجھ لے،

---

[1] یعنی وہ عورت ایک طرف سے دھتکاری گئی اور دوسری طرف سے چوٹ کھا گئی، ۱۲

منکوحہ کے تعلیم یافتہ ہونے کو دیکھنا غلطی ہے	ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح بعض لڑکے کے ایف اے ایم اے ہونے کو دیکھتے ہیں افسوس ہے کہ بعضے نئے مذاق کے لوگ منکوحہ

ایسی تلاش کرتے ہیں جس نے نئی تعلیم حاصل کی ہو، یا تعلیم کے ساتھ ڈاکٹری یا پروفیسری کا پاس بھی حاصل کر چکی ہو، کوئی ان عقلاء سے پوچھے کہ اس سے مقصود کیا ہے، ؟ اگر یہ ہے کہ ان کا بار ہم پر کم ہو، یہ خود بھی کمانے میں امداد دیں تب تو بے حد بے حمیتی ہے، کہ مرد ہو کر عورت کے ہاتھ کو تکا جائے، عورت کا ممنون ہونا تو بدون خلوص کامل کے خود خلاف غیرت ہے،

مہر کو معاف کر دینے کے بادجو ادا کر دینا ہی مناسب ہے	وہ اگر مہر بھی معاف کر دے تو حتی الامکان اس معافی کو قبول نہ کرے اس کو ادا ہی کر دے، حق تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرف بھی

اشارہ فرمایا ہے:-

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّا اَنْ یَّعْفُوْنَ (فیسقط النصف) اَوْ یَعْفُوَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ (ای الزوج بان یؤدی تاما) وَاَنْ تَعْفُوْٓا (ایها الرجال) اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (دالیق لشانکم لکونکم رجالا)۔	(تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف واجب ہے (پس آدھا مہر ساقط ہو جائیگا)[1] یا کہ وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق رکھنا اور توڑنا ہے (یعنی خاوند پورا مہر ادا کر دے) اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنیکے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (اور مرد ہونے

کی شان کے لائق تمہارا درگذر کرنا زیادہ لائق ہے ۔))

شوہر کی خواہش وغیرہ کے بغیر عورت اگر خلوص کامل سے اسکی کوئی مالی خدمت کرے تو اس کا مضائقہ نہیں	البتہ اگر خلوص کامل سے شوہر کی کچھ خدمت کی جائے بدون اس کے کہ شوہر کو اس کی خواہش یا اس پر نظر یا اس کی نگرانی و انتظار ہو تو مضائقہ نہیں، وہو معنی قولہ تعالیٰ:-

وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی، (الضحیٰ، آیت ۸)	(اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا، سو مالدار بنا دیا،))
وَاشتراط عدم التطلع والتشرف	(اور اطلاع و انتظار نہ ہونا شرط ہے جیسا کہ

[1] نصف مہر اس وقت ساقط ہوگا جبکہ عورت کو نکاح کے بعد قبل صحبت اور خلوت صحیحہ طلاق دیدے، (احقر قریشی)

بقولہ علیہ السلام مَا آتَاكَ مِنْ غَيْرِ اِشْرَافٍ فَخُذْهُ وَمَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ او کما قال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کچھ تمہارے پاس ہی بغیر اشراف نفس کے آجائے اسے لے لو، اور جو تمہارے پاس نہیں آتا نفس کو اس کے پیچھے مت لے جاؤ ؛،

عورت صرف سلیقہ سے اپنی شوہر کی خدمت نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لئے اس میں خدمتگذاری وغیرہ کا مادہ ہونا ضروری ہے،

اور اگر یہ مقصود ہے کہ ایسی عورت سلیقہ دار ہوگی ہم کو راحت زیادہ پہنچائے گی، سو خوب سمجھ لو، راحت رسانی کے لئے صرف سلیقہ کافی نہیں، بلکہ اطاعت وخلوص وخدمت گزاری کے مادّہ (جذبہ) کی اس سے زیادہ ضرورت ہے، اور سلیقہ میں کچھ کمی بھی ہو تو اس کو برداشت کرلیا جاتا ہے، اور گو کسی قدر وقتی کلفت ہوتی ہے لیکن وہ بہت جلد دفع ہوجاتی ہے اس کا اثر باقی نہیں رہتا، اور اگر نرا سلیقہ ہو اور وہ اوصاف نہ ہوں تو اوّل تو وہ خدمت ہی کیوں کرے گی ؟

عورتوں کو انگریزی تعلیم دینے سے ان میں بہت سے اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہیں،

کیونکہ تجربہ سے اس تعلیم جدید کا اثر خاصکر اگر عورتوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ وہ فطرۃً ہی ضعیف العقل وضعیف القلب (کم عقل اور کمزور دل) ہوتی ہے، جس کے لئے زیادت تأثر (اثر قبول کرنا) لازم ہے، یہ ثابت ہوا ہے کہ اس سے تکبر وخود غرضی وخود رائی وبے باکی وآزادی وبیحیائی وچالاکی ونفاق وغیرہ اخلاقِ ذمیمہ (برُے اخلاق) جو تمام اخلاقِ ذمیمہ کی جڑ ہیں، پیدا ہوتے ہیں، پس جب ان کا دماغ تکبر ونخوت سے پُر ہے تو وہ تمہاری خدمت ہی کیوں کرے گی ؟ جس سے تم کو راحت پہونچے،

نو تعلیم یافتہ عورت بجائے شوہر کی خدمت کرنے کے اس سے خدمت لینے کی طالب ہوگی،

بلکہ برعکس بوجہ خود غرضی کے وہ خود تم ہی سے اپنے حقوق کا اعلیٰ پیمانہ پر مطالبہ کرے گی، جس سے تمہاری عافیت (سلامتی) تنگ ہوجائے گی، غرض وہ خود تم ہی سے اپنی خدمت چاہے گی، اور اگر تم اُن سے وہ خدمتیں چاہوگے بھی جو ایک شریف سادہ طبیعت کی عورت اس کو اپنا فخر سمجھتی ہے تو وہ تم کو ضابطہ کا جواب دیں گی کہ یہ کام ہمارے ذمہ نہیں، بلکہ جو ان کے ذمہ بھی قاعدہ سے ہوگا، اس میں بھی خلاف تہذیب ہونے کا یا مخلِ صحت (صحت خراب کرنے) کا عذر کرکے ٹکا سا جواب دیں گی، اور اپنے حقوق تم سے پورے وصول کرینگی

تنخواہ تم سے کُل رکھوالیں گی، اور تین پانچ (ٹال مٹول) کرو گے تو عدالت پہنچیں گی، اور اگر کہو کہ یہ بہت کم ہوتا ہے تو جواب میں عرض کروں گا کہ پھر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے، اور اگر کہو کہ ہم ایسی تعلیمیافتہ نہیں چاہتے تو خیر وہ بے شک اس قدر خطرناک نہ ہوگی، لیکن آزادی، بے حیائی، مکروفریب، چالاکی، اور نفاق تو تمغۂ مشترکہ (سب کا مشترک اعزازی نشان) ہے جو پوری اور ادھوری تعلیم سب میں ہے، تو اس کے خطرات بھی ایک شریف اور غیور آدمی کے لئے کچھ کم نہیں ہوں گے،

اگر عورت میں سب ہنر ہوں اور حیاء نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں عورت نہیں

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر عورت میں کوئی ہنر نہ ہو لیکن حیاء ہو تو وہ اور کچھ نہیں مگر عورت تو ہے، اور اگر سب ہنر ہوں لیکن حیاء نہ ہو تو وہ سب کچھ ہے مگر عورت نہیں، اور نکاح کے مصالح کے لئے چاہئے عورت، جب وہ حکماً عورت ہی نہیں تو پھر اس سے مصالح نکاح کیسے حاصل ہوں گے پھر نکاح سے کیا فائدہ؟ بالائی مصالح کے لئے چار مہذب نوکر رکھ لو، اور آب ریزی (شہوت کی ہوس پوری کرنے) کے لئے اہلِ فرانس نے بہت سے طریقے ایجاد کر دیئے ... اُن پر کفایت کرو، رہی اولاد سو وہ اختیار ہی سے خارج ہے، اس کی فکر ہی کیا؟ پھر وہ ہر بدہنر عورت سے بھی حاصل ہو سکتی ہے، اس کے لئے اتنی کد و کاو (جستجو اور تلاش) بیکار ہے، اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ سب مصالح ایک ہی شخص سے حاصل ہوں، غرض نکاح میں مصالح نکاح کی رعایت سب سے مقدم ہے، جو عورت کی بے حیائی کے ہوتے ہوئے سب گرد ہے،

عورتوں میں دینی تعلیم کا ڈھونڈھنا ضروری ہے،

البتہ اگر عورتوں میں دینی تعلیم ڈھونڈی جائے تو وہ علومِ دینیہ کی تعلیم ہی، جو انسان کو مہذب کامل بنا دیتی ہے، جبکہ اس پر عمل کرے، اور غالب یہ ہے کہ جب علمِ دین حاصل ہوتا ہے تو کبھی نہ کبھی عمل کی بھی توفیق ہو ہی جاتی ہے، سو اگر بے عملی سے فرضاً (فرض کرو) کچھ کلفت بھی ہوئی تو وہ دائمی نہ ہوگی، عارضی ہوگی، جو ایک منٹ میں ختم ہو سکتی ہے، غرض اصل تعلیم قابلِ اہتمام تعلیمِ دینی ہے،

دینی تعلیم سب تہذیبوں کی جڑ ہے،

اور اس کے اساس التہذیب (تہذیبوں کی جڑ) ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، اور جس کے قلب میں خدا کا خوف ہوگا وہ اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھے گا کہ اس سے احتمال ہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی کا ذرا حق ضائع کرے، یا کسی کو اس سے تکلیف پہونچے، یا وہ اپنی غرض کو دوسرے کے حق پر

مقدم کرے، یا کسی کی بدخواہی کرے، یا کسی کو دھوکا دے، اور اس سے بڑھکر کونسی تہذیب ہوگی؟

آجکل کی تہذیب قبے تعذیب ہی | اور جس کا نام آجکل تہذیب رکھا گیا ہی جس کا حاصل تصنع و تلبیس و خداع و نفاق (بناوٹ، اپنا عیب چھپانا، دھوکہ دینا اور منافقت) ہے، وہ سراسر تعذیب (عذاب دینا) ہے، جس کا پایا جانا عورت میں اس کو اس شعر کا مصداق بناتا ہے ؎

زنِ بد درسرائے مردِ نکو ❊ ہم دریں عالم است دوزخِ او

(بری عورت نیک مرد کے گھر میں بعینہٖ اس عالم میں اس کے لئے دوزخ ہے)

اس تقریر سے بعض اجزائے تعلیم نسواں کے متعلق بھی حل ہوگئے، اور مکمل بحث اس کی ایک مستقل تقریر میں بندہ نے لکھی ہے، جو القاسم شوال ۱۳۳۱ھ کے پرچہ میں شائع بھی ہوچکی ہے،

عورتوں کو علمِ دین گھر پر ہی پڑھانا چاہیئے؛ | جس کی شرح دو امر ہیں، ایک یہ کہ اُن کو صرف علمِ دین پڑھایا جائے دوسرے یہ کہ یہ تعلیم خاص طرز سے متفرق طور پر گھروں میں ہونا چاہیے، مدارس کے طرز پر مجتمع طور پر نہ ہونا چاہیئے، کہ شریعت نے بلاضرورتِ شدیدہ اُن کے اجتماع و خروج عن البیوت (گھروں سے نکلنے) کو پسند نہیں کیا، اور واقعات نے بھی اس کے مفاسد ایسے دکھلائے کہ بجز متعامی (خود اندھا بننے والے) کے اعمی (اندھے) نے بھی ان کو دیکھ لیا، اور راز اس میں یہ ہے کہ اس اجتماع کو جس درجہ کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ عورتوں سے بن نہیں پڑتا کہ وہ خود مُستتر (پردے میں رہنے والی) ہیں، اور مَردوں کے دخل میں وہ نگرانی پھر کہاں رہی، کہ اس نگرانی کا حاصل یہی عدمِ اختلاط بالرجال (مردوں سے میل جول نہ رکھنا) تو تھا ہی، تو نگرانی تو کم اور خروج عن البیت کے بعد مواقع فساد میں وسعت ہوگئی، دوسرے معلمہ اگر شریف و متدین و شفیق و ذی اثر و باوجاہت و بارعب ہو تو اس کا نوکر رکھنے کے لئے میسّر ہونا قریب بہ محال اور جو نوکر رکھنے کے لئے مل سکتی ہے وہ ان اوصاف سے معرّیٰ (خالی) جس کی صحبت مَردوں سے زیادہ خطرناک، خیر یہ جملہ معترضہ استطراداً ربہ سبیل تذکرہ آگیا، اصل بحث یہ ہے کہ منکوحہ میں تعلیم پر نظر کرنا کیسا ہے؟

نوتعلیم یافتہ ہونے سے عورت کا بے علم ہونا اچھا ہے، | اصل بات یہ ہے کہ اگر اس میں علمِ دین ہو تو نورٌ علےٰ نور ہے، اور اگر علمِ دین نہ ہو تو اس کا بے علم ہونا یقیناً اس کے نئے علوم کے عالم ہونے سے اسلم (محفوظ ترین) اور بے خطر ہے کیونکہ بے علم میں اگر اخلاقِ حمیدہ نہ ہوں گے تو وہ اخلاقِ رذیلہ جو جڑ ہیں تمام اخلاقِ رذیلہ اور افعالِ ذلیلہ کی وہ بھی تو نہ ہوں گے، تو اس مصرعہ کا مضمون ہاتھ آئیگا،

ع "مرا بخیر امید نیست و بد مرساں"

(یعنی مجھے آپ سے بھلائی کی توقع اور امید تو نہیں ہی، لیکن بدی بھی تو نہ پہونچاؤ)

نکاح کے لئے اخبارات میں ناکح و منکوح کی اشتہار بازی مذموم ہے،

آجکل تو یہ طوفان ہو گیا کہ اشتہاری دواؤں کی طرح ناکح و منکوح کے اشتہار بھی اخباروں میں چھپنے لگے ... کبھی ناکح صاحب اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ جائداد، یہ نوکری یہ کمالات ہیں، اور ہم کو ان اوصاف کی منکوحہ چاہیے، جس کو منظور ہو ہم سے خط و کتابت کرے، پھر اس کے جواب میں کوئی بی بی صاحبہ اخبار میں یا خاص طور پر جواب لکھتی ہیں اور اپنا جامع اوصاف اور حسین ہونا اپنے بے شرم قلم سے لکھتی ہیں، اور کچھ شرطیں کرتی ہیں، بس اسی طرح خط و کتابت ہو کر کبھی سودا بن جاتا ہے کبھی نہیں بنتا، کبھی نکاح سے پہلے ہی دو چار ملاقاتیں ہو جاتی ہیں، تاکہ تجربہ و لصیرت کے بعد نکاح ہو، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، ... کیسی آفتیں نازل ہو رہی ہیں اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (اے اللہ ہم تجھ سے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں جو اُن میں سے ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ ہیں)۔

عاقلہ بالغہ کا بلاضرورت از خود نکاح کرنا مذموم ہے،

اس میں کلام نہیں کہ عاقلہ بالغہ خود اپنے نکاح کی بات چیت ٹھہرا لے اور ایجاب و قبول کرلے تو نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا بلا ضرورت و بلا مصلحت معتد بہا ایسا کرنا کیسا ہے، سو یہ امر نہ شرعاً محمود (پسندیدہ) ہے نہ عقلاً، شرعاً تو اس لئے کہ تخریج زیلعی میں دارقطنی و بیہقی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کیا ہے:

لَا تَنْكِحُوا النِّسَاءَ اِلَّا مِنَ الْاَكْفَاءِ وَلَا يُزَوِّجُهُنَّ اِلَّا الْاَوْلِيَاءُ وَلَا مَهْرَ اَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ (دارقطنی و بیہقی)	"یعنی عورتوں کا نکاح نہ کرو مگر ان کے کفو میں اور ان کی شادی نہ کرو مگر ان کے ولی کی موجودگی میں، اور اُن کا مہر دس درہم سے کم مقرر نہ کرو۔"

گو بوجہ دوسری حدیث کے:-

اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، (رواہ مسلم و ابوداؤد و الترمذی والنسائی و مالك فی المؤطا لَا يُزَوِّجُهُنَّ)۔	"یعنی بالغ عورت (اپنے نکاح کے معاملہ میں) اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے"!

کو نہی کہیں گے نفی نہ کہیں گے جو کہ مستلزم ہو عدمِ صحت کو لیکن نہی بھی تو عمل ہی کے واسطے ہے، اور کوئی باطنی راز ہے، جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توسط اولیاء کا تجویز فرمایا ہے، اگرچہ ہم کو اس کی لِم بھی معلوم نہ ہو،

بزرگوں کے تجویز کردہ نکاح میں آثارِ برکت ہوتے ہیں !

مگر ہمارے پاس دلیل اِنّی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات اس میں ضرور ہے، اور وہ دلیل اِنّی یہ ہے کہ ہم نے جو آثارِ برکت کے بزرگوں کے تجویز کئے ہوئے نکاح میں دیکھے ہیں وہ اُس نکاح میں نہیں دیکھے جو برادرِ راست خود زوجین کر لیتے ہیں، باقی خاص خاص مواقع ضرورت مستثنیٰ ہوا ہی کرتے ہیں، اور عقلاً اس لئے محمود نہیں کہ ظاہر ہے کہ بلاضرورت شدیدہ خود نکاح کی بات چیت یا خط و کتابت کرنا دلیل اکی وقاحت (بیحیائی) کی ضرور ہے،

وَاِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ

یعنی جب تم میں حیاء کا مادہ نہ رہا تو بس جو چاہے کرو ع بے حیا باش و ہرچہ خواہی کن، کے موافق قلیل الحیاء آدمی سے جو رذیلہ بھی صادر ہو جائے بعید نہیں، عاقل آدمی کو ایسی عورت سے بچنے کے لئے یہی علامت کافی ہے کہ وہ بے حیاء ہے،

متدیّن آدمی کا بازاری عورت سے نکاح کرنا خلافِ احتیاط ہے

اس جگہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعضے آدمی بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں، گو نکاح بھی ہو جاتا ہے، اور بلاوجہ اس پر بدگمانی بھی نہ چاہئے کہ یہ اب بھی بے قید و آوارہ ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ متدیّن آدمی کے لئے خلافِ احتیاط ضرور ہے، اسی واسطے شریعتِ غرّا، نے ایک درجہ اس کو نامناسب قرار دے کر قانون مقرر فرمایا ہے،

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (النور، آیت ۳)	(" یعنی زانی نکاح بھی کسی کے ساتھ نہ کرے بجز زانیہ اور مشرکہ کے اور اسی طرح زانیہ کے ساتھ اور بھی کوئی نکاح نہ کرے بجز زانی یا مشرک کے اور یہ (یعنی ایسا نکاح)

مسلمانوں پر حرام اور (موجبِ گناہ) کیا گیا ہے ")

گو عموم نصوص و اطلاق دلائل سے یہ تحریم نفی کے درجہ میں نہیں کہ نکاح منعقد ہی نہ ہو، بلکہ نہی کے درجہ میں ہے، اور نہی بھی بالذات نہیں کہ یہ نکاح معصیت ہو بلکہ لغیرہ بعارض لزوم

دیوثیت کے ہے، اور اسی لئے یہ تحریم اس صورت میں ہے، کہ اس نے توبہ نہ کی ہو، اور توبہ کی صورت میں یہ تحریم لغیرہ بھی نہیں، لیکن جب کہ اس کی ناپسندیدگی کا مدار اس کا زانیہ ہونا ہے، سو وہ جہاں تیقن ہوگا وہاں ناپسندیدگی اقویٰ درجہ میں حرمت ہوگی، اور جہاں محتمل ہوگا وہاں ناپسندیدگی خفیف درجہ خلاف اَولیٰ میں ہوگی، اور حدیث:

تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ

میں اس کی صریح تائید ہے، کہ کسی نبی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسی عورت بھی پسند نہیں فرمائی جو اس میں کبھی بھی ملوث ہوئی ہو، گو توبہ ہی کرلی ہو، اور یہی معنی ہیں اس آیت شریفہ کے:

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ..... ، | ("پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں")

البتہ اگر توبہ خالص کرے جس سے وہ احتمال نہ رہے اور اس کو کوئی قبول نہ کرے تو اس کی عفت کی حفاظت کے لئے یا جبکہ اس شخص کو اس سے تعشق (عشق ومحبت) ہو تو یہ محل اس سے مستثنیٰ ہے، لعموم قولہ علیہ السلام:

لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابِّيْنَ مِثْلُ النِّكَاحِ

نکاح سے متعلق بعض ایسی کوتاہیاں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے

اب نکاح کے متعلق بعض وہ کوتاہیاں مذکور ہوتی ہیں جن سے زیادہ تر مسائل فقہیہ کا تعلق ہے۔

خفیہ نکاح خلافِ سنت ہے | ان میں سے ایک کوتاہی گو درجۂ ترکِ واجب میں نہیں یہ ہے کہ بعض لوگ بمصلحتِ نفسانیہ خفیہ نکاح کرلیتے ہیں، جس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ سنت کے یقیناً خلاف ہے، حدیث میں مصرح ہے:

اِعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ ... | "اس نکاح کا اعلان کرو......"

اور جن ائمہ کے نزدیک اعلان شرطِ نکاح ہے ان کے نزدیک ایسا نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، تو ان کے نزدیک واجب کا بھی ترک ہے، جو ترکِ سنت سے بھی اشد ہے، اور گو ہمارے نزدیک اس نکاح کا انعقاد ہوجاتا ہے جبکہ اس میں ضروری شہود (گواہ) ہوں، یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت، مگر تاہم علماء کے اختلاف میں بلاوجہ پڑنا خود ناپسندیدہ ہے خصوص معاملہ بضع (شرمگاہ) میں، کہ اس میں (شرمگاہ میں) اصل حرمت ہے، تو یہ دوسری خرابی ہوگئی، اور تیسری خرابی یہ ہے کہ ایک مفسدۂ عظیمہ (بہت بڑی خرابی) کی طرف مفضی (پہنچانے والا) ہے، یعنی یہ طریقہ اگر معمول بہ

ہو جائے تو بہت سے مرد عورت زنا میں مبتلا ہونے کے بعد جب حمل سے یا کسی کو اطلاع ہو جانے سے رسوائی ہوتے دیکھیں گے بہت آسانی سے خفیہ نکاح کے دعوے کی آڑ لے لیا کریں گے، اور اس کے قبائح و فضائح (برائیاں اور خرابیاں) ظاہر ہیں کہ کس قدر کبیر اور کثیر (بڑی اور زیادہ) ہیں، چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض عوام کو خود بھی معلوم نہیں کہ ادنیٰ درجہ شہادت کا صحتِ نکاح میں کیا ہے، جب وہ کسی خفیہ نکاح کو سنیں گے، اور خفیہ ہونے کے سبب اُن کو گواہوں کا عدد معلوم نہ ہوگا عجب نہیں کہ اس کے معنی نکاح بلا شہود دے کر شہادت کے شرط نہ ہونے کا اعتقاد کرلیں اور کسی موقع پر اس پر عامل بھی ہو جائیں، تو اس میں اعتقادی و عملی دونوں خرابیاں جمع ہو گئیں تو اس میں چوتھی کے ساتھ پانچویں خرابی بھی آگئی، خصوص اس زمانے میں جہل بسیط سے بڑھ کر جہل مرکب شائع ہے،

نکاح، معاملاتِ بیع و شراء میں سے نہیں،

چنانچہ خاص اس مسئلہ اشتراطِ شہود (گواہوں کے شرط ہونے) میں بھی افسوس ہے کہ بعض متجرئین (جری قسم کے لوگ) کلام کرنے لگے، ایک شخص کا تو یہ مقولہ سنا گیا ہے کہ شہودِ نکاح میں شرط مقصود نہیں، اصل شرط تراضیِ جانبین ناکح اور منکوحہ کا راضی ہونا) ہے، کیونکہ بعد تراضی کے احیاناً (بسا اوقات) انکارِ تراضی کا بھی احتمال تھا، قطع نزاع (جھگڑا ختم کرنے) کے لئے شہود کا حکم کیا گیا تاکہ اختلاف رفع ہونے میں آسانی ہو، ورنہ نفسِ حِل و صحتِ نکاح شہود پر موقوف نہیں، انتہی کلام الشنیع،

اور ایک شخص کا یہ مقولہ معلوم ہوا کہ نکاح بھی مثل معاملاتِ بیع و شراء (معاملاتِ خرید و فروخت) کے ایک معاملہ ہے، پس جس طرح دوسری چیزوں کا لین دین باہم متعاقدین (معاملہ کرنے والوں) کی رضا سے ہوتا ہے، اسی طرح اس میں بھی اس کو کافی سمجھا جائے گا، پس عورت سے نکاح کرنا مثل گائے اور بکری کے خرید لینے کے ہے، انتہیٰ مقولہ الفضیح،

اس شخص نے شرطِ شہود کو بالکل حذف کر دیا، پس پہلے شخص کا قول تو الحاد (بے دینی) تھا، اور یہ زندقہ (کفر) ہے، جو الحاد سے اشد ہے، اور ان دونوں قولوں کے ابطال (باطل ہونے) کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ رائے محض ہے، بمقابلہ نصِ صریح اور اجماع کے، جو احد الامرین یعنی شہادت یا اعلان کے اشتراط پر منعقد ہے، پس غیر مسموع (غیر معتبر) ہے

جہلِ مرکب کی حسیات سے ایک مثال

. . . . حسیات (محسوس کی جانے والی چیزوں) میں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی جاہل گنوار سے جس کی بغل میں دو من

بجنہ کشمش کا بورہ تھا، ریل میں جب ڈپٹی کلکٹر نے ٹکٹ مانگی تو اس نے پھر اپنا ہی ٹکٹ پیش کر دیا اس نے کہا اس کا ٹکٹ الگ لاؤ، اس نے جواب دیا یہی اس کا ٹکٹ بھی ہے، بابو نے کہا اس ٹکٹ میں پندرہ سیر سے زیادہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے، اس نے جواب دیا کہ نہیں جتنا جو شخص آسانی سے اٹھالے وہی اس کا پندرہ سیر ہے، تم لوگ ضعیف ہو، پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے، ہم قوی ہیں ہم زیادہ اٹھا سکتے ہیں، پس اس گنوار کے قول کے اگر یہ معنی ہیں کہ پندرہ سیر کا قانون تو ٹھیک ہو مگر معلّل ہے علّتِ مذکورہ سے تو اس کا جواب مشابہ ہے قائلِ اول کے قول کے، اور اگر یہ معنی ہیں کہ قانون ہی لغو ہے تو مشابہ ہے قائلِ ثانی کے قول کے، اور دونوں حال میں کیا قانون کے مقابلہ میں اس کا قول مانا جا سکتا ہے؟ یہی حال سمجھ لیجئے ان دونوں قولوں کا۔

بہرحال یہ کیفیت ہو اس زمانہ میں جہلِ مرکب کے شیوع (عام ہونے) کی، پس خفیہ نکاح کرنے میں چونکہ شہود کی اطلاع عام نہ ہوگی بہت قریب ہو کہ اس کو نکاح بلا شہود سمجھا جائے اور ان دونوں اقوالِ باطلہ کے قائلین اس سے اپنی رائے کی تائید کا کام لیں، اور ظاہر ہے کہ الحاد و زندقہ کا مؤید بننا گو بالتسبّب (سبب بننے کے ساتھ) ہی ہو بالمباشرت (عملاً) نہ ہو کیسا امرِ قبیح ہوگا، یہ چھٹی خرابی ہوگئی،

خط وکتابت کے ذریعہ ایجاب وقبول کرنے سے نکاح صحیح نہیں ہوتا

بعضے لوگ اس مسئلۂ شہود کے متعلق ایک جہلِ بسیط میں مبتلا ہیں، اور اس جہل پر عمل بھی کرنے لگے، وہ یہ کہ بعضے مرد و عورت دونوں محض خط وکتابت سے ایجاب وقبول کر لیتے ہیں، اور اس کو کافی سمجھتے ہیں، پھر بعضے تو صرف اپنے ہی خطوط پر اکتفا کر لیتے ہیں، اور بعضے اپنے مضمون پر دو گواہوں کے بھی دستخط کرا دیتے ہیں، اور نکاح کو صحیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ دونوں صورتوں میں نکاح صحیح نہیں ہوتا، صورتِ اول میں تو بوجہ عدمِ شہود (گواہ نہ ہونے) کے اور صورتِ ثانیہ میں اس لئے کہ شہود میں حسبِ تصریحِ فقہاء یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایجاب وقبول کے الفاظ کو ایک ہی مجلس میں سُن بھی لیں، غرض دونوں صورتوں میں نکاح صحیح نہیں ہوگا، پس خفیہ نکاح میں ان دونوں غلطیوں کی بھی تقریب ہے، یہ ساتویں خرابی ہوگئی،

خفیہ نکاح کی ایک نئی ایجاد جو سراسر معصیت اور ضلالت ہے

بعضے لوگوں نے خفیہ نکاح میں ایک اور ایجاد کی ہے اور بزعمِ خود سب گناہوں سے بچنے کی پوری تدبیر کر لی ہے، اور یہ خبر نہیں کہ: فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَوَقَفَ تَحْتَ الْمِيزَابِ (یعنی بارش سے بھاگے اور پرنالہ کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے)۔

کے مصداق بنے ہیں، اور وہ ایجاد یہ ہے کہ نکاح بلا شہود تنہائی میں اس شرط پر کر لیتے ہیں کہ صحبت وغیرہ کچھ نہ ہوگی، خالی نکاح کئے لیتے ہیں، تاکہ تنہائی میں بیٹھنا، ایک دوسرے کو دیکھنا، باہم ہنسنا بولنا یہ امور جائز ہو جائیں، اور صحبت سے مجتنب (بچے) رہیں، تو ان لوگوں کے اعتقاد میں گویا نکاح کے دو درجے ہیں، ایک وہ جس سے صحبت حلال ہو جائے، اس درجہ کے تحقق (وجود) کے لئے تو شہود شرط ہیں، اور دوسرا درجہ وہ جس سے صحبت حلال نہ ہو لیکن خلوت و مس و نظر (تنہائی، چھونا، اور دیکھنا) وغیرہ حلال ہو جائیں، اس درجہ کے تحقق کے لئے شہود شرط نہیں، صرف مرد و عورت کا ایجاب و قبول اور تراضی (باہم رضامندی) کافی ہے، اس جہل میں ایک بدعت، ضلالت (گمراہی) کی بھی آمیزش ہے، کہ تصرف فی الحکم الشرعی (شریعت کے حکم میں دخل اندازی) ہے، نیز بدون ایسے نکاح کے معاصی (گناہ) کو معاصی بھی سمجھتے تھے، اور اس نکاح کے بعد خلوت وغیرہ کو حلال سمجھنے لگے، معصیت کو حلال سمجھنا کتنی بڑی سخت بات ہے، سو خفیہ نکاح میں اس ایجاد کے لئے بھی استناد (دلیل پکڑنا) ہے، یہ آٹھویں بات ہے، اور یہ سب احتمالات فرضی و اختراعی (بناوٹی) نہیں ہیں، مجھکو یہ سب واقعات معلوم ہوئے ہیں،

خفیہ نکاح کے دعوے سے عورت پر صریح ظلم ہو سکتا ہے،

نویں خرابی یہ ہے کہ اس دعوے کے ذریعہ سے کسی ایسی عورت پر ظلم ہو سکتا ہے، جس سے یہ شخص نکاح کی خواہش رکھتا ہو، اور وہ قبول نہ کرتی ہو، پس کسی وقت اگر اس کو شیطان اغوا (گمراہ) کرے تو دو مُردہ شخصوں کا نام لے کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُن کے سامنے اس سے خفیہ نکاح ہو گیا تھا، اور اس دعوے کے بعد دو چار مددگاروں کی اعانت (مدد) سے اس پر جبر (زیادتی) کرے اور عام لوگ اس شبہ میں خاموش رہیں کہ نکاحی عورت پر قبضہ کرنے کا حق ہی ہم کیوں تعرض کریں،

خفیہ نکاح کی دسویں خرابی

دسویں خرابی یہ کہ کسی منکوحہ عورت کی نسبت یہی دعویٰ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دوسرے شخص کے علانیہ نکاح کے قبل کی تاریخ میں ہمارے عزیز سے خفیہ نکاح ہو چکا تھا، چنانچہ ان ایام میں ایک ایسا ہی حادثۂ خونبار ایک شہر میں واقع ہو رہا ہے، جس کے واقعات سن کر رونگٹا کھڑا ہوتا ہے،

خفیہ نکاح کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلانِ نکاح کا حکم فرمایا ہے،

اور عجب نہیں کہ انہی مفاسد کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلان کا حکم فرمایا ہو، اور بعض ائمہ نے اس حکم کو انہی وجوہ سے وجوب (واجب ہونے) پر محمول کیا ہو، مگر اکثر علماء نے سنیت (سنت ہونے)

پر اس لئے محمول کیا ہے کہ:

بعض اوقات بوجہ عذر شرعی خفیہ نکاح جائز ہوگا،

بعض اوقات عذر شرعی سے بھی اس کی ضرورت واقع ہوتی ہے مثلاً ایک بیوہ عورت ... نکاح ثانی کسی سے کرنا چاہتی ہے، مگر اعلان میں اپنے جاہل ورثہ سے اس کو اندیشۂ عضل یا ہلاک ہے، اور دوسری جگہ جاکر نکاح کرنے میں سفر میں کوئی محرم[1] نہیں ہے، اس لئے اس نے خفیہ نکاح کرلیا، پھر اسی کے ساتھ امن میں دوسری جگہ چلی گئی، اسی لئے میں نے شروع مضمون میں بمصلحتِ نفسانیہ کی قید لگائی تھی،

نکاح خواں کو ایجاب کے وقت منکوحہ کا بلند آواز سے نام لینا ضروری ہے،

ایک کوتاہی وہ بھی خفیہ نکاح کے ساتھ ملحق (ملی ہوئی) ہے یہ ہے کہ اکثر جاہل نکاح خواں ایجاب کے وقت منکوحہ کا نام بہت ہی آہستہ آواز سے لیتے ہیں، صرف ناکح تو سُن لیتا ہے، لیکن آس پاس والے بالکل نہیں سنتے، تو ایسا نکاح بھی بلا شہود ہوگا، کیونکہ شہود کا صرف مجلسِ نکاح میں حاضر ہونا کافی نہیں، بلکہ صحتِ نکاح کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایجاب وقبول کے الفاظ کو بھی صاف صاف سُنیں، سو جب انھوں نے منکوحہ کا نام ہی نہ سُنا تو یہ شرط صحت کی نہیں پائی گئی، اس واسطے نکاح صحیح نہیں ہوگا، نکاح خوانوں کو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ناواقفی سے ایسا کریں تو اہلِ مجلس کو خصوصًا ناکح ومنکوحہ کے سرپرستوں کو چاہئے کہ نکاح خواں سے دوبارہ ایجاب (وقبول) کرائیں، اور تاکید کریں کہ بلند آواز سے منکوحہ کا نام لے،

بضرورتِ شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں لینا شرم وحیاء کے خلاف نہیں،

اپنے نزدیک اس میں بڑا حق شرم کا ادا کرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو بضرورتِ شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں ظاہر کرنا کچھ شرم کے خلاف نہیں، پھر مجلس کے اکثر حاضرین اہلِ تعلق ہوتے ہیں، جن کو منکوحہ کا نام بھی معلوم ہوتا ہے، البتہ اس معلوم ہونے سے نکاح منعقد نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ صیغۂ ایجاب میں اس کا نام نہ سنیں، سو جب معلوم ہے تو نکاح خواں کی زبان سے سننے میں کونسی نئی بات ہوگی، جو موجبِ شرم ہے، علاوہ اس کے اگر نام سنانا بے حیائی ہے تو نکاح صحیح نہ ہونے کی صورت میں جو عمر بھر بلا نکاح استعمال میں رہی گی کیا اس سے بڑھ کر بے حیائی نہیں ہے؟ دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ شرع کو چھوڑ دینے سے عقل بھی چھوٹ جاتی ہے:

---

[1] عورت کا قریبی رشتہ دار جس سے نکاح ناجائز ہو، ۱۲

اِصلاحِ بعض اغلاط
متعلّق بہ تحلیلِ حرام وتحریمِ حلال

اب بعض کوتاہیاں تحلیل بعض محرّمات (بعض حرام چیزوں کو حلال کرنے) اور تحریم بعض محلّلات (بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے) کی مذکور ہوتی ہیں:

یعنی احکامِ شرعیہ کی ناواقفی یا تجاہل سے بعضی ایسی عورتوں سے جوکہ حرام ہیں نکاح کرلیا جاتا ہے، اور بعضی ایسی عورتوں سے جوکہ حلال ہیں نکاح کرنے کو ناجائز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ خبر متواتر سے سنا گیا ہے کہ ایک مدّعی تحقیق نے اپنی علاتی (سوتیلی) بہن سے نکاح کیا، لوگوں نے جو ملامت کی کہ یہ تو بنصِ قرآنی حرام ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:-

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ، (النساء، آیت ۲۳)

("تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں")

تو جواب دیا کہ آیت میں اخوت سے مراد حقیقی بہنیں ہیں، یہ علاتی بہن کو شامل نہیں، استغفراللہ من الجرأۃ فی الدین (میں اللہ تعالیٰ سے دین کے معاملہ میں ایسی جرأت کرنے سے پناہ مانگتا ہوں)

اگر کسی شخص کو بلا دلیلِ شرعی ایسی تقییدات کا اختیار حاصل ہو تو دوسرا شخص یہ کہہ دے گا کہ عَلَيْكُمْ میں ضمیر خطاب کی ہے، اور اصل مقتضا خطاب کا مخاطب کا موجود عند التکلم... (بولنے کے وقت موجود) ہونا ہے، اور ہم نزولِ آیت کے وقت موجود تھے نہیں، پس اس کے مخاطبِ خاص اسی زمانے کے حضرات ہیں، جن کو یہ خطاب ہی نہیں، اور اس لئے وہ شخص حقیقی بہنوں کو بھی حلال سمجھے، اسی طرح امّہات وبنات (ماؤں اور بیٹیوں) کو بھی حلال سمجھے، تو

اس متجری فی الدین (دین میں جرأت کرنے والے) سے سوال ہے کہ تمھارے پاس اس شخص کے دعوی کے ابطال کی ایسی کونسی دلیل ہے جو تمھارے فعل کے کرنے والے کے پاس نہ ہو، اگر تمھاری وہ دلیل اس کے مقابلہ میں کافی ہے تو تمھارے منکر کی بھی دلیل تمھارے مقابلہ میں کافی ہے اور اگر تمھارے منکر کی دلیل کافی نہیں تو تمھاری دلیل بھی کافی نہیں،

اجتہاد بالکل عام ہو تو شریعت کا ایک جزو بھی باقی نہیں رہ سکتا،

حضرت اجتہاد ایسا عام اور اختیاری نہیں ہے ورنہ شریعت کا ایک جُزو بھی باقی نہ رہے، اس کے خاص شرائط ہیں، اس کے خاص محل (مواقع) ہیں جہاں اجتہادِ مجتہد جامع شرائط کا مقبول ہے اور اس محل کے غیر میں کسی کا اجتہاد مقبول نہیں، اور محض حرف شناسی (کتابی علم) سے اس کی اہلیت و معرفت نہیں ہو سکتی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یعنی ہر خوب صورت شخص کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو، اور ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو)

ایک مدعیِ اجتہاد کا جدِ حقیقی کی منکوحہ سے فتویٰ جوازِ نکاح

ایک دوسرے مدعیِ اجتہاد کا فتویٰ منقول دیکھا گیا کہ جدِ حقیقی (حقیقی دادا) کی منکوحہ (بیوی) سے نکاح حلال کر دیا گیا اور جو کسی نے نصِ قرآنی پیش کی؛

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ، الآیہ (النساء، آیت ۲۲)

("اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ (دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو")

تو جواب میں کہہ دیا کہ یہ آباء (والدین) کے منکوحات کے لئے ہے، اور آباء میں اجداد (دادا) داخل نہیں، نعوذ باللہ من الرائے فی القرآن المبین (ہم قرآن پاک میں اپنی رائے دینے سے اللہ تعالےٰ کی پناہ مانگتے ہیں)

تفسیر بالرائے کی چند سنگین مثالیں

یہاں بھی مثل سابق کے معروض ہے کہ اگر ایسی تفسیر مقبول ہو دیں تو دوسرا شخص کہہ دے گا کہ جدہ (دادی) سے نکاح حلال ہے، کیونکہ قرآن سے امہات (ماؤں) کی حرمت ثابت ہے اور اُمہات میں

جدّات (دادیاں) داخل نہیں تو اس مدعی کے پاس بجز اطلاق لفظ امّہات کے (لفظ امّہات کے اطلاق کے علاوہ) اشتمالِ جدّات کی کونسی دلیل ہے، سو ویسا ہی اطلاق لفظ آباء اشتمال اجداد (لفظ آباء دادا نانا کو شامل ہونے)... کی بھی دلیل ہے، اور جمع بین الاختین (دو بہنوں کا جمع کرنے) کی آفت تو حدِّ احصاء (حدِّ شمار) سے خارج ہے، یعنی بے شمار مواقع پر جہلاء اس کا ارتکاب کر رہے ہیں، اور گو وہ اس کے حلال ہونے کا شاید منہ سے دعویٰ نہ کرتے ہوں، لیکن بیباکی اور استخفاف (ہلکا سمجھنا) اور اصرار اور اس کو عیب نہ سمجھنا اور منع کرنے والوں کو بے پروائی سے جواب دینا، بلکہ ان سے رنج و نزاع (جھگڑا) کرنا ایسا ہی ہے کہ اس کو استحلال (حلال سمجھنا) کہہ سکتے ہیں، جس میں زوالِ ایمان (ایمان جاتے رہنے) کا قوی اندیشہ ہے،

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک صاحب فارغ عن الدرسیات کلہا او اکثرہا (درسیات کی مکمل یا بیشتر کتابوں کے فارغ التحصیل) کی نیت اپنے حقیقی ہمشیرہ زادہ کی دختر (حقیقی بہن کی پوتی) پر ڈانواڈول ہوتی، اور ان کو اس کی حلّت (حلال ہونے) کا بھی احتمال ہوا، مگر کچھ تردّد (شک) ہونے سے مجھ سے سوال کیا، خیر اُن کو حرمت کا فتویٰ دیا گیا، یہ بھی حیرت انگیز قصہ ہے، قرآن مجید میں بنات الاخت (بہن کی بیٹیاں) اپنے اطلاق سے اجماعًا بنت ابن البنت (نواسے کی بیٹی) کو بھی شامل ہے، فقہاء نے اس کے محرمات (نکاح کے لئے حرام ہونیوالیوں) میں سے ہونے کی تصریح کی ہے، پھر ان کو گنجائش کا احتمال ہوا، اللّٰہم احفظنا من الزیغ والھویٰ،

یہ سب خرابیاں قلّتِ مناسبتِ علمِ دین و غلبۂ اتباعِ آراء وہویٰ (علمِ دین سے تعلق کی کمی اور اپنی رائے ونفسانی خواہش کے غلبہ کی وجہ) سے ہیں، اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَی الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَالْیَقِیْنِ الْقَوِیِّ (اے اللہ ہمیں صراطِ مستقیم اور کامل یقین پر ثابت قدم رکھ)

حرمتِ مصاہرت سے متعلق چند کوتاہیاں

حرمتِ مصاہرت (رشتۂ دامادی) کے متعلق بعض واقعات ہیں، بعضے لوگ ایک عورت سے ایک مدت تک ناجائز تعلق رکھتے ہیں، جب وہ دل سے اُتر جاتی ہے اور اس درمیان میں اس کی کوئی لڑکی سیانی ہوجاتی ہے اس کی طرف میلان ہوتا ہے، اور اپنے نزدیک گناہ سے بچتے ہیں، کہ اس لڑکی سے نکاح کر لیتے ہیں، حالانکہ حرمتِ مصاہرت کے قاعدہ سے اس شخص پر اطلاق مدلول:۔

وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ	(اور تمھاری بیبیوں کی بیٹیاں جوکہ تمھاری پرورش میں رہتی ہیں اُن بیبیوں سے کہ

(النساء، آیت ۲۳) | کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو۔")

میں داخل ہونے سے حرام ہے، اور بعضے دونوں ماں بیٹی کو استعمال میں رکھتے ہیں، حالانکہ بیٹی سے منقطع (علیحدہ) ہونے کے بعد اس کی ماں سے نکاح تک حرام ہوگیا، اور بلا نکاح تو دو حرمتیں جمع ہوگئیں، ایک وطی بلا نکاح (بغیر نکاح کے ہمبستری) دوسری امہات نسائکم سے انتفاع،

بیوی کی ماں یا بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑجانے سے بیوی حرام ہوجاتی ہے۔

بعضے عمداً تو اسباب حرمت کے مرتکب نہیں ہوتے، مگر احیاناً غلطی سے بیوی کے دھوکہ میں اس بیوی کی ماں پر یا اس بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑجاتا ہے اور بعد تنبہ کے فوراً دست کش ہوجاتا ہے، لیکن اس سے بھی اس شخص کی بیوی اس پر حرام ہوجاتی ہے، اس میں بہت لوگوں کو کلام ہوتا ہے، کہ عمداً (جان بوجھ کر) تو اس فعل کا ارتکاب نہیں کیا گیا،

مذکورہ حرمت کا مدار سزا نہیں بلکہ اس فعل کا خاصہ ہے

سو یہ کلام کرنا غلطی ہے، اس حرمت کا مدار سزا نہیں ہے جو یہ سوال کیا جائے جس طرح بعض اعیان (چیزوں) میں بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد (بغیر ارادہ) کے بھی اُن کے تناول سے وہ خواص ظاہر ہوتے ہیں، جیسے سنکھیا کھانے سے ہلاک ہوجانا اور اس کو اطباء اور کبھی بعض عوام بھی جانتے ہیں، اسی طرح بعض افعال میں بھی بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد ان کے صدور سے وہ خواص واقع ہوتے ہیں اور اس کو شارع علیہ السلام اور ماہرانِ شریعت بارشادِ شارع جانتے ہیں، پس ان اسباب حرمتِ مصاہرت میں یہ خاص اسی قبیل (قسم) کا ہے، البتہ آخرت میں جو مضار (نقصانات) بعض افعال کے واقع ہوں گے وہ سزا ہیں، وہ عمد و قصد (جان بوجھ کر اور ارادہ کے ساتھ کرنے) پر موقوف ہیں،

بہو پر براہِ شرارت ہاتھ ڈالنے سے وہ اپنے بیٹے پر بھی حرام ہوجائے گی،

اسی طرح بعض ایسے ہی دھوکہ میں یا براہِ شرارت کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ ڈال دیتا ہے تو یہ بیوی اپنے شوہر پر یعنی اس شخص کے بیٹے پر حرام ہوجاتی ہے، اس میں عوام کو پہلے سے زیادہ کلام ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو جس شخص پر حرمت ہوئی ہے اس کی اتنی کوتاہی تو تھی کہ اس نے تحقیق کرنے میں بے احتیاطی کی، مگر یہاں جس شخص پر حرمت ہوئی ہے اس بیچارے کی کیا خطا اور اس کا کیا دخل جو اس پر سختی کی گئی، اس کا جواب بھی اوپر کی تقریر سے ہوچکا ہے کہ یہ سزا نہیں ہے، اس فعل کے خاصہ کا ظہور ہے، اور خاصہ ہونا دلیلِ شرعی سے ثابت ہے اور گو یہ مسئلہ حرمتِ مصاہرت بدون النکاح کا مجتہدین میں مختلف فیہ ہے،

کسی مسئلہ میں محض نفس پرستی کے لئے کسی دوسرے امام کی تقلید دین سے مذاق ہے،

مگر جو شخص ایسے مجتہد کی تقلید کا التزام کئے ہوئے ہو جو حرمت کے قائل ہوں اس شخص کا محض اتباعِ ہوی (صرف نفسانی خواہش کی پیروی) سے اس حرمت پر عمل نہ کرنا نفس پرستی ولعب فی الدین (دین کو کھیل بنانا) ہے، اور اس مسئلہ میں کچھ شرائط وتفاصیل بھی ہیں جن کا محل کتبِ فقہ ہیں، ان سے یا علماء سے وقوعِ حوادث کے وقت تحقیق کرنا ضروری ہے، تاکہ حرمت کی جگہ حلت اور حلت کی جگہ حرمت نہ سمجھی جائے کہ اول میں حقوقِ شرع کا اتلاف (ضیاع) اور دوسری میں حقوقِ زوجہ کا اتلاف ہے،

بلا قصد بھی حرمتِ مصاہرت ہوجاتی ہے

اور چونکہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے، اور بعض صورتوں میں بلا قصد بھی حرمت ہوجاتی ہے،

بیوی سے مباشرت سے قبل سخت احتیاط کی ضرورت ہے

اس لئے اس کی احتیاط کا بہت ہی اہتمام رکھے، یعنی اول تو جہاں بیوی سوتی ہو اس کی ماں یا بیٹی وہاں نہ ہونا چاہیئے، اسی طرح وہاں اپنے بیٹے کی بیوی یا باپ کی بیوی نہ ہونا چاہیئے، اور اگر کسی ضرورت سے ایسا ہو تو جب تک بیوی کو پکار کر اس کی آواز نہ سُن لے اور خوب پہچان نہ لے اس کو ہاتھ نہ لگائے،

اسی طرح ان مذکورہ عورتوں کے ہاتھ سے اگر کوئی چیز لے تو اس کا بہت خیال رکھے کہ اس کے ہاتھ کو ان کا ہاتھ نہ لگ جائے، نفس کا کیا اعتبار، اگر ہاتھ لگنے کے وقت مرد کے دل میں یا عورت کے دل میں شہوت کا اثر ہوگیا تو حرمتِ مصاہرت کا طوق (پٹہ) پڑ گیا، پھر بعض اوقات تو ایک کو دوسرے کی کیا خبر کہ اس وقت اس کے نفس میں کیا کیفیت تھی، جب خبر ہی نہیں تو حرمت پر عمل کیسے کرے گا، اور اگر اپنے نفس کی خبر بھی ہوگئی تو دنیا کی شرم یا خوف سے زبان سے نکالنا مشکل، تو تمام عمر ارتکاب حرام، یا یہ شخص مباشر یا سبب (یعنی خود کرنیوالا یا سبب بننے والا ہو گیا) کتنی مصائب جمع ہوگئیں،

حرمتِ رضاعت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی حرمتِ رضاع کے متعلق ہے کہ وہ بھی مثل حرمت مصاہرت کے کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والی) ہے، اکثر لوگ تو بوجہ دقیق وغیر مشہور ہونے .... اس کے مسائل کے باوجود علمِ رضاع اس میں بلا احتیاطی کرتے ہیں، مثلاً بعض عوام کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی عورت کا دودھ پئیں، لیکن ایک ہی زمانہ میں نہ پئیں بلکہ چار پانچ سال (کے فرق) سے پئیں تو یہ بھائی بہن نہیں بنتے، حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اور مثلاً بہت لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر ایک شخص کی ایک بی بی نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا اور ایک ہی زمانہ میں یا دوسرے زمانہ میں اس شخص کی دوسری بی بی نے کسی

لڑکی کو دودھ پلایا تو یہ بہتوں کو معلوم نہیں کہ یہ لڑکا لڑکی آپس میں بہن بھائی ہوگئے، اور ان کا نکاح بھی باہم ناجائز ہے، یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک ہی عورت کا ہو بلکہ دونوں کا دودھ چونکہ ایک ہی مرد کے سبب سے ہے اس لئے دونوں کا دودھ بحکم ایک ہی دودھ کے ہے،

اناکا دودھ بلاضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے، اور بعض اوقات خود رضاع ہی کی تحقیق نہیں کرتے، اور ایسی غلطی ان مقامات پر ہوتی ہے جہاں مائیں دودھ کم پلاتی ہیں، انائیں نوکر رہ کر زیادہ دودھ پلاتی ہیں، جیسے شہروں کے امراء ہیں، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اوّل تو اناکا دودھ بلاضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے، اور اگر ایسا اتفاق ہو تو اس کو خوب مشہور کر دینا چاہئے، اس کا سہل (آسان) طریقہ یہ ہے کہ جس انا کا دودھ پلوائے اس سے بھی تحقیق کرلے کہ تونے کہاں کہاں دودھ پلایا ہے اور اس کی یادداشت لکھ کر اپنے خاندان میں محفوظ رکھے، تاکہ رشتہ ناطہ کے وقت اس کا لحاظ رکھنا آسان ہو، اور بعض جگہ سب سے بڑھ کر یہ غضب ہوتا ہے کہ اولاً رضاع کا علم نہ ہونے سے نکاح ہو گیا، اور پھر بعد میں معتبر طریقہ سے علم بھی ہوگیا، لیکن اب تفریق سے عار آتی ہے کہ لوگ ہنسیں گے، اور طعن کریں گے کہ ان لوگوں نے کیا حماقت کی تھی، اور بھائی بہن میں مثلاً نکاح کر دیا تھا، اس لئے کبھی وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ رضاع کسی طرح ثابت نہ ہو، اور کبھی اور طرح طرح کے حیلے نکالتے ہیں، کبھی دوسرے علماء کے اقوال کی تلاش کرتے ہیں، حتیٰ کہ کل جن فرقوں کو برا بھلا کہتے تھے آج ان سے استفتاء کرکے ان کے جواب کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر رضاعی بہن بھائی کے نکاح میں ایسی ہی غلطی ہوگئی، جب علم ہوا تو بہت پریشان ہوئے، مجھ سے سوال کیا، میں نے حرمت کا فتویٰ دیا، کہنے لگے صاحب اب تو بڑی بدنامی ہوگی، میں نے کہا اوّل تو حکم شرعی کے ماننے میں اگر بدنامی بھی ہو تو کچھ پرواہ نہ کرنا چاہئے،

حکم شرعی ماننے میں بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی ہے، دوسرے بدنامی بھی نہ ہوگی بلکہ نیک نامی ہوگی، کہ ایسے حق پرست دیندار لوگ ہیں کہ جب غلطی کا علم ہوا فوراً تدارک کر دیا، البتہ بدنامی اب ہے کہ کیسے بے حیاء اور بد دین ہیں کہ باوجود علم ہوجانے کے پھر بھائی بہن حرام کرتے ہیں، جب یہ بات نہ چلی تو کہنے لگے کہ اس لڑکے نے اس لڑکی کی ماں کا دودھ ایک ہی بار پیا تھا، میں نے کہا تب بھی حرمت ثابت ہوگئی، کہنے لگے کہ صاحب وہ تو اُگل (قے کے ذریعہ باہر نکال) بھی دیا تھا، میں نے کہا، تب بھی حرمت باقی رہی، کہنے لگے، خدا کے واسطے کوئی صورت تو حلت کی نکالو، میں نے کہا دیوانے ہوئے ہو، کیا احکام شرعیہ میں تحریف کروں، غرض مایوس ہو کر چلے گئے، ایک مقام پر ایک اہل حدیث میں

طلاق دیدی یا وہ مرگیا، تو نکاح تو رہا نہیں، اور عدت[1] ویسے ہی ایک امر زائد ہے تو اس میں نکاح کرلینے سے کون امر مانع ہے، معتدّہ (عدت گذارنے والی عورت) سے نکاح کرلیتے ہیں، سخت افسوس ہے، یہ لوگ نص کے مقابلہ میں اپنی رائے چلاتے ہیں،

ایامِ عدت نکاح کے بقیہ اثر میں سے ہیں،

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عدت بھی بقیہ اثر اسی نکاح کا ہے، خواہ شوہر نے طلاق دیدی ہو یا مرگیا ہو، اور یہ بقیہ اثر احکامِ تزویج غیر (دوسرے کے ساتھ نکاح حرام ہونے) میں بعینہٖ مثل نکاح کے ہے، پس ایسا نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا، اور تمام عمر حرام ہوتا ہے، اور بعضے یہ غضب کرتے ہیں کہ نکاح کو تو جائز نہیں سمجھتے، مگر اس لئے کرتے ہیں کہ یہ عورت دوسری جگہ نکاح نہ کرے، اس کے مفاسد بعض بعض وجوہ سے اور بھی شدید ہیں، ایک تو دھوکہ دینا جو صریح گناہ ہے، دوسرا جہلاء وعوام کو صحتِ نکاح کا گمان ہونا جس سے ان کا اعتقاد اور ایسے ہی موقع پر ان کا عمل بھی فاسد ہوتا ہے، تیسرے بعض جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ پھر نکاح ہی نہیں کرتے، چوتھے غلبۂ نفس میں اس سے استمتاع کرنے لگے تو وہ بگمانِ صحتِ نکاح کے انکار نہیں کرتی، جس سے ایقاء فی المعصیۃ (گناہ میں پڑنا) لازم آیا، بعض جگہ انکار کرنے پر ظلم بھی کیا گیا اور دوسرے لوگ اس مظلومہ کی اس لئے نُصرت (مدد) نہیں کرتے، کہ اس کو منکوحہ سمجھتے ہیں، جس پر زوج (خاوند) کو حقِ جبر (مجبور کرنے کا حق) حاصل ہے،

مفقود (یعنی گم شدہ کے متعلق چند کوتاہیاں

اور ایک کوتاہی اس نکاح مجھنات (شوہر والی بیبیوں سے نکاح کرنے) کے متعلق بعض خواص میں ہو رہی ہے کہ مفقود (گم شدہ) کی بی بی سے بزعمِ خود امام مالکؒ کے مذہب پر چار برس کے بعد حکم بالموت (موت کا حکم کرنے) کے لئے قضاءِ قاضی کے اشتراط کی کتبِ مالکیہ میں تصریح ہے، اور اگر ان کے نزدیک اس کی تصریح بھی نہ ہوتی تب بھی ہمارے فقہاء نے اس اشتراط (شرط ہونے) کی تصریح کی ہے، باقی یہ شبہ کہ ہمارے فقہائے مالکیہ کے قول پر عمل کو جائز کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بجائے نوّے سال کے چار سال کی مدت کو لے لینا جائز کہا ہے، باقی یہ اشتراط مطلق ہے، کسی حال میں اس کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں،

---

[1] عدت:۔ اگر کسی کا شوہر طلاق دیدے تو اس عورت کو (اگر حاملہ نہیں تو) تین حیض آنے تک شوہر ہی کے گھر میں رہنے کا حکم ہے، اور گھر سے نہ دن کو نکلنے کی اجازت ہے اور نہ رات کو، یہ عدت پوری ہونے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے، اور شوہر کی موت واقع ہونے پر چار مہینے دس دن تک عدت بیٹھنے کا حکم ہے، (احقر قریشی غفرلہٗ)

بلکہ نوے سال کے بعد حکم بالموت کرنے کے لئے بھی قضاءِ قاضی (حاکمِ شرعی کے فیصلہ) کی حاجت ہے،
علاوہ اس کے بہت جگہ ایسے نکاح کے بعد شوہر اوّل آگیا ہے، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ بھی مالکی بن جائے
بلکہ وہ مالک بن کر جھگڑتا ہے، اور مفاسدِ عظیمہ برپا ہوتے ہیں، ان مفاسد سے بچنا بھی شرعاً ضروری ہے
باقی یہ کہ عورت بلا نکاح نہیں رہ سکتی، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر خاوند مفقود نہ ہو اس کا نشان و
مقام سب معلوم ہو مگر زوجہ کے حقوق ادا نہ کرے تو آخر یہ عورت اُس وقت کیا کرے، بس وہی اب بھی
کرے، اگر شبہ ہو کہ اس صورت میں تو اس پر دعویٰ کر سکتی ہے، تو جواب یہ ہے کہ اگر دوسری سلطنت
میں ہو تو دعویٰ کیسے کرے؟ بہرحال ان سب صورتوں میں صبر کرنا پڑتا ہے، بس اب بھی صبر اختیار کرے
البتہ جن ریاستوں میں قاضی شرعی با اختیار موجود ہو وہاں جا کر رجوع کرنے سے اگر وہ (تفریق کا)
حکم دے تو احقر کے نزدیک گنجائش معلوم ہوتی ہے، دوسرے علماء سے بھی اس کی تحقیق فرمالیں،

پردیسن عورت کے شوہر فوت ہونے یا طلاق کے بعد عدت گزر جانے کے دعوے کا حکم،

ایک صورت اسی نکاحِ محصنات کی ایک اور بھی شائع ہے، کہ ایک پردیسن عورت نے دعویٰ کیا کہ میرا شوہر مر گیا، یا اس نے طلاق دیدی، اور عدت بھی گذر گئی، اور اُس عورت کی ظاہری حالت قابلِ وثوق (اعتبار کے قابل) نہیں ہے، جس سے خدا ترس حلال و حرام کی احتیاط کرنے والے مسلمان کا قلب اس کے صدق پر شہادت دیتا ہے، پھر بھی بعضے لوگ غرضِ نفسانی کے غلبہ سے ایسی عورت سے نکاح کر لیتے ہیں، پھر بعد میں پتہ لگتا ہے کہ وہ خاوند والی ہے، پھر بعضے اس حالت میں بھی نہیں چھوڑتے، گویا اتنے دنوں کے قبضہ سے یہ موروثی کاشتکار ہو گئے، جن کے سامنے اصلی زمیندار کا حقِ تصرف (استعمال کا حق) مضمحل ہو گیا، فقہاء نے ایسی عورت سے نکاح کے جواز میں شہادتِ قلب کو شرط ٹھہرایا ہے،

دورِ حاضر میں شہادتِ قلب معلوم کرنے کا طریقہ،

اور یہ شہادت پہلے زمانہ میں تو جلد متحقق ہو جاتی تھی، مگر اب کے زمانہ شیوع کذب و فساد (جھوٹ اور فساد کے عام ہونے) کا ہے بدون جرح و قدح و تحقیق تام و امتحانِ تدریجِ مجرّہ (بغیر چھان بین اور مکمل تحقیق نیز خبر دینے والے کی دینداری کا اچھی طرح امتحان) جس کا نام شہادتِ قلب ہو وہ جلدی حاصل نہیں ہوتی، مغلوب الغرض (نفسانیت سے مغلوب شخص) دھوکہ سے غیر شہادت کو شہادت سمجھ لیتا ہے، اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے،

نو مسلم عورت کا فوراً نکاح کر دینا صحیح نہیں،

اسی طرح محصنات کی ایک صورت یہ ہے کہ نو مسلم عورت کا نکاح فوراً ہی کسی سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ شوہر والی تھی، تو بدون عرضِ اسلام علی الزوج (شوہر کے سامنے اسلام پیش کرنے) اور اباءِ زوج دارالاسلام میں یا بدون تین حیض آئے ہو

کسی نے کہہ دیا کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمت نہیں ہوتی، پس فوراً انھوں نے سوال تراش لیا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا تو کیا حکم ہے؟ اور اسی قائل کے کسی ہم مشرب نے جواب لکھ دیا کہ حرمت نہیں ہوئی پس فتویٰ لے کر بے فکر ہو گئے، حالانکہ اول تو یہ لوگ (اہلِ معاملہ) ان مفتیوں کو اس دن تک اہلِ حق میں سے بھی نہ سمجھتے تھے، پھر یہ کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) مر گئی، زمانہ دراز ہو گیا، اب یہ کس طرح معلوم ہوا کہ پانچ گھونٹ سے کم پیے تھے، اس کو بجز دین کو دنیا کے تابع بنانے اور دین کو دنیا کے لئے بدلنے کے کیا کہا جائے گا؟ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا (اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا کرنے سے بچائے)

مخطوبہ (یعنی منسوبہ لڑکی) قبل نکاح بالکل حرام ہے،	بعض لوگوں کو اس میں مبتلا پایا کہ مخطوبہ (منگنی کی ہوئی عورت) کے ساتھ جو کہ قبل نکاح حرام ہے مثل منکوحہ کے معاملہ کرتے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ

یہ جب عنقریب حلال ہونے کو ہے تو ابھی سے حلت شروع ہو گئی، اس کا بطلان (باطل ہونا) عقلاً وسمعاً ظاہر ہے، اور شاید کسی کو اس سے شبہ واقع ہو کہ مخطوبہ کو قبلِ خطبہ کے دیکھ لینا جائز ہے، تو یہ بھی ایک قسم کا استمتاع (حصولِ لذت) ہے، اور استمتاع سب برابر ہیں، سو جواب اس شبہ کا خود ہی سوال میں موجود ہے، یعنی خطبہ کے قبل ہی تو دیکھ لینا جائز ہے جس سے مقصود استمتاع نہیں بلکہ اس کا اندازہ کرنا ہے کہ اس عورت میں جو وصفِ حسن وغیرہ میں نے سنکر یا سمجھ کر اس کے استمتاع کے حلال ہونے... یعنی انعقادِ نکاح کی تجویز سوچی ہے آیا وہ وصف اس میں ہے یا نہیں ہے، چونکہ نہ ہونے کی صورت میں سوءِ معاشرت کا خوف تھا شریعت نے محض اس غرض کے لئے ایک بار چہرہ دیکھ لینے کی اجازت دیدی، سو اس نظرِ ضروری پر جو کہ بغرض استمتاع نہیں ہے دوسری نظرِ غیر ضروری بعد الخطبہ کو اور اسی طرح مس وغیرہ کو جو کہ محض بغرض استمتاع بلاضرورت ہی، کیونکہ وہ ضرورت ایک بار دیکھنے سے مرتفع ہو چکی ... کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے،

محصنات کے بارے میں چند کوتاہیاں	منجملہ محرمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) کے بنصِ قرآنی محصنات یعنی شوہر والی بیبیاں ہیں، اور شریعت میں شوہر والی کا مفہوم عام

ہے، یعنی کسی کے نکاح میں ہو وہ بھی اور جو کسی کی عدت میں ہو وہ بھی اس میں داخل ہی، اس میں بھی بکثرت حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے، چنانچہ بعضے تو صرف خاوند کی مدت تک خبر گیری نہ کرنے سے اور بعضے عورت کے اپنے خاوند کو چھوڑ کر نکل آنے سے اور بعضے عورت کے فاحشہ (بدکار) ہو جانے سے اور ایک مدت .... اسی حالت میں گزر جانے سے سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب نکاح نہ رہا ہوگا، بس بے تکلف اس سے نکاح کر لیتے ہیں، اور بعضے عدت کے اندر یہ سمجھ کر کہ جب شوہر نے

غیر دار الاسلام میں تفریق جو بحکم تطلیق (طلاق) ہے واقع نہیں ہوتی، پھر اس تفریق کے بعد عدّتِ جدیدہ میں اختلاف ہے، اور احوط (زیادہ احتیاط) اختلاف سے بچنا ہے، واعظین و ائمہ مساجد کو اس کا زیادہ یاد رکھنا چاہیے،

نکاحِ موقّت اور متعہ بالاتفاق حرام ہیں، بعض پڑھے لکھے لوگوں پر افسوس ہے کہ نکاحِ موقت (معیّنہ مدّت کے لئے نکاح) کے حرام ہونے میں اور نکاح موقّت کے قیاس پر متعہ کے حرام ہونے میں شبہ کرتے ہیں، ہماری کتبِ فقہ میں دونوں کی حرمت کی تصریح ہے، اور نکاح موقت میں جو بعض کا اختلاف منقول ہے دراصل ان بعض علماء نے اس نکاح کو موقت ہی قرار نہیں دیا، بلکہ تصریحاً فرمایا کہ یہ توقیت باطل ہے، اور نکاح تابیداً (ہمیشہ کے لئے) صحیح رہے گا، باقی جو عقد موقت ہوگا وہ بالاتفاق باطل ہے، چنانچہ متعہ کو تمام اہلِ حق نے باطل کہا ہے، خود وہ مؤطا میں اس کے تحریم (حرام ہونے) کی حدیث لائے ہیں، اور ان کے مذہب کی کسی کتاب میں وہ نسبت واقع نہیں ہوئی، پس یقیناً غلط ہے،

خریدی ہوئی عورتیں یا لڑکیاں شرعاً کنیز کہلانے کی مصداق نہیں، بعض لوگ ایسی خریدی ہوئی عورتوں یا لڑکیوں کو جن میں کنیز ہونے کے شرائط شرعیہ نہیں پائے جاتے، حلال سمجھتے ہیں، ان سے جبراً خدمت لیتے ہیں، اور بعضے ان سے صحبت کرتے ہیں، یہ بھی تحلیلِ محرمات میں داخل ہے،

تین طلاق کے بعد بدون حلالہ اسی عورت سے نکاح درست نہیں، بعضے لوگ بی بی کو تین طلاق دے کر پھر اس کو نکاح میں داخل سمجھتے ہیں، یا بلا حلالہ[۱] اس سے تجدیدِ نکاح کر لیتے ہیں، بعض کو بعض روایات سے شبہ ہو گیا ہے، لیکن یہ مسئلہ اپنے مقام پر حل ہو چکا ہے کہ تین طلاق خواہ مجتمعاً (ایک ساتھ اکٹھی) دے، خواہ متفرقاً تینوں واقع ہو جاتی ہیں، گو ایک جلسہ میں ایسا کرنا معصیت (گناہ) ہے لیکن طلاق مغلظہ[۲] ہو جائے گی، اور بدونِ حلالہ نکاح جدید درست نہ ہوگا، البتہ جس سے صحبت یا خلوت[۳] صحیحہ نہ ہوئی اس کو

---

۱ حلالہ:۔ عورت اگر تین طلاق ہو جانے کے بعد پھر اسی شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے اور اس کے ساتھ ہمبستری بھی کرے (صرف نکاح کافی نہیں، بلکہ شوہر کے ساتھ اس کی وطی ہونا بھی ضروری ہے) پھر اس شوہر کے مرجانے یا طلاق دیدینے پر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اس کو حلالہ کہتے ہیں، ۲ طلاقِ مغلظہ:۔ یعنی ایسی طلاق جس کے دینے کے بعد میاں بیوی اگر دونوں بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر حلالہ کے نکاح نہ ہو سکے، ایسی طلاق کو طلاقِ مغلظہ کہتے ہیں، جس کے بعد مرد کو اس عورت کو رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا، ۳ خلوتِ صحیحہ:۔ یعنی میاں بیوی کا ایسی تنہائی میں یکجا ہونا جس میں صحبت ممکن ہو، ۱۲ (قریشی)

تین طلاق متفرقاً (علیحدہ علیحدہ) دے، اس طرح کہ تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، اس میں ایک پہلی ہی واقع ہوگی، دو لغو ہوں گی، باقی سب صورتوں میں تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی،

بیک وقت چار عورتوں سے زائد نکاح درست نہیں

ایک کوتاہی اسی تحلیل محرمات کے متعلق یہ ہے کہ بعض لوگ خصوص اہل امارت و ریاست چار سے زائد عورتیں نکاح میں جمع کرنے کو حلال سمجھتے ہیں چنانچہ ایک صاحب کو میں نے دیکھا جن کے پاس سات منکوحہ مجتمع سُنی جاتی تھیں، انھوں نے کسی کا فتویٰ مجھ سے نقل کیا کہ وہ اٹھارہ تک جمع کرنے کو حلال بتلاتے تھے، میں نے اس فتویٰ کی تغلیط کی، اور ان کو سمجھایا جس سے وہ ساکت (خاموش) ہوئے، باقی یہ تحقیق نہیں کہ زائد علی الاربع (چار عورتوں سے زائد) کو انھوں نے چھوڑ دیا یا نہیں، خدا بچائے ایسے خوشامدی بدنام کنندہ علماء سے جو دنیوی اغراض کی تکمیل و تحصیل کے لئے امراء کی خوشامد میں اس طرح دین فروشی کرتے ہیں، گو یہ قول بعض کی طرف کتب میں بھی منسوب دیکھا گیا ہے، لیکن بالیقین غلط ہے، اور بالیقین اس غلطی کا سبب وہاں تدین (دینداری) ہی تھا، اور اُس وقت اُس کا بالاجماع (بالاتفاق) اس قائل پر منکشف (ظاہر) بھی نہ تھا، اور اب تو بعد وضوحِ حق (حق واضح ہونے) کے جو ایسا کرے وہ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ کے مصداق ہے،

مسئلہ مصاہرت کے متعلق ایک محرّف فی الدین کا فتویٰ،

ایسے ہی ایک محرف فی الدین (دین میں تحریف پیدا کرنے والے) کا لکھا ہوا بندہ نے فتویٰ مسئلہ مصاہرت (داماد بنانے) کے متعلق دیکھا ہے، اس شخص نے سائل سے ایک ہزار روپیہ لے کر ایک تاویل باطل سے ساس کے ساتھ نکاح کی اجازت دیدی، وہ سائل اپنی ساس پر فریفتہ (عاشق) ہوگیا تھا، اس مفتی نے ترکیب یہ لکھی کہ ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو، تو کسی عورت کا ساس ہونا موقوف (منحصر) ہوا منکوحہ کے ماں ہونے پر، اور یہ منکوحہ جاہل ہے، اور جاہلوں کے اکثر اقوال و افعالِ شرکیہ و کفریہ صادر ہوا کرتے ہیں، اور نکاح پڑھنے کے وقت کسی نے منکوحہ کو تجدید ایمان نہیں کرائی، اور مرتدہ (دین سے پھر جانے والی) کا نکاح مسلم سے صحیح نہیں، پس یہ نکاح نہیں ہوا، اس لئے نہ وہ منکوحہ ہوئی، اور نہ اُس کی ماں ساس ہوئی رہی حرمتِ مصاہرت بمحض الوطی (صرف ہمبستری کے سبب دامادی رشتہ سے حرام ہونا) یہ صرف امام ابو حنیفہ رح کا مذہب ہے، سائل پر فرض نہیں کہ ان کی تقلید کرے، پس اس لئے وہ ساس سائل پر حلال ہو گئی،

افسوس اس شخص نے ایک شخص کی دنیوی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لئے بلکہ اپنی ایک رقم سیدھی کرنے کے لئے ایک مسلمان عورت کو کافر بنایا اور اتنی مدت تک زوجین (میاں بیوی)

کو مرتکب زنا (زنا کرنے والے) قرار دیا، پھر محض اتباع ہوئی (نفسانی خواہش کی پیروی) کے لئے ایک مقلد مذہب معین (ایک مقررہ مذہب کی تقلید کرنے والے یعنی حنفی مسلمان) کو اجازت ترک تقلید وارتحال الی مذہب الغیر (تقلید کو چھوڑ کر اجازت دوسرا مذہب اختیار کرنے) کی دی، جس کے خطرناک ہونے کے متعلق ایک حکایت...... عنقریب عرض کروں گا، اس طرح پھیر پھار کر محرمہ (جس سے نکاح حرام تھا) کو حلال کیا، ایسے لوگوں میں اور علماء یہود کاتمین للحق وملبسین الحق بالباطل (حق کو چھپانے اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرنے والوں) میں کیا فرق ہے،

وہ حکایت موعودہ (جس کا وعدہ کیا گیا)... یہ ہے:۔

حکی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفة رح خطب الی رجل من اصحب الحدیث ابنته فی عهد ابی بکر الجوزجانی فابی الا ان یترك مذهبه فیقرأ خلف الامام ویرفع یدیه عند الانحطاط ونحو ذلك فاجابه فزوجه فقال الشیخ بعد ما سائل عن هذه واطرق رأسه النكاح جائز ولكن اخاف علیه ان یذهب ایمانه وقت النزع لانه استخف بمذهبه الذی هو حق عنده وتركه لاجل جیفة نتنة كذا فی الشامیة عن التاتر خانیة قبیل كتاب السرقة

(”حکایت ہے کہ ابوبکر جوزجانی رح کے زمانہ میں ایک شخص نے جو امام ابو حنیفہ رح کے متبعین میں سے تھا، ایک اہل حدیث کی بیٹی سے نکاح کا پیغام دیا، اس اہل حدیث نے چند شرائط پر منظور کیا، وہ یہ کہ اپنا حنفی مذہب چھوڑ دے، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے، اور رفع یدین کرے، اس حنفی نے ان شرائط کو قبول کرلیا، اور نکاح ہوگیا، جب شیخ ابوبکر جوزجانی رح سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اپنا سر جھکالیا، پھر فرمایا کہ نکاح تو صحیح ہوگیا، لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں نزع کے وقت اس کا ایمان نہ چلا جائے، کیونکہ اس نے ایک بدبودار مردار کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر جو اس کے نزدیک حق تھا،“)

چند ٹکوں کی خاطر ایک شخص کی اپنی حقیقی ہمشیرہ کو زانیہ قرار دینے کی کوشش،

اسی کی نظیر (مثال) ایک اور قصہ میرے سامنے پیش ہوا تھا، کہ اس میں بھی ایک شخص نے محض ایک نفسانی غرض سے ایک منکوحہ کو زانیہ قرار دیا تھا، یہ تو دین کے خلاف ہوا، اور وہ منکوحہ اس شخص کی بہن تھی، اس کو زانیہ کہنا، بے حیاء وغیرت کے خلاف ہوا، وہ قصہ یہ ہے کہ ایک سنی شخص کی سنی بہن کا نکاح ایک شیعی

مرد سے ہوا، اور وہ عورت لاولد ہزاروں روپے کا ترکہ چھوڑ کر مرگئی، تو شرع سے اس کے دو ہی وارث تھے، ایک زوج (شوہر) کہ نصف اس کا تھا، دوسرا یہ بھائی کہ نصف اس کا تھا، یہ بھائی یوں چاہتا تھا کہ زوج کو کچھ نہ ملے، سب میں ہی لے لوں، تو اس کے متعلق اس ترکیب سے سوال لکھا کہ چونکہ سنیہ کا نکاح شیعی سے حسب فتویٰ کثیر من العلماء (بہت سے علماء کے فتویٰ کے مطابق) صحیح نہیں ہوتا، اس لئے وہ مرد اس کا زوج ہی نہیں، پس وہ وارث نہ ہونا چاہئے، صرف ایک بھائی وارث ہے، تو اس طرح کل ترکہ کس کو ملے گا؟

میں نے کہا، افسوس: اول تو جس وقت یہ نکاح ہوا تھا اس وقت تم کہاں سوتے تھے، کیوں ہونے دیا تھا؟ یہ مسئلہ اور غیرت کہاں گئی تھی؟ پھر ہو جانے کے بعد شور وغل کیوں نہیں کیا! اتنے دنوں زنا ہوتا رہا، اس کو گوارہ کیا، پھر ایمان سے کہو کہ اگر اتنا ہی ترکہ شوہر چھوڑ کر مرجاتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا اور تم کو یہ توقع ہوتی کہ اگر میری بہن کو بوجہ فتویٰ ردّ علی الزوجین عند عدم وارث کے یہ کل ترکہ مل جائیگا۔ تو بوجہ اس کے لاولد ہونے کے پھر سب مجھ کو مل سکتا ہے، تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے غیر معتقد وغیر ثابت (منعقد اور ثابت نہ) ہونے کے لئے کرتے؟ یا اگر کوئی ایسا فتویٰ بھی سناتا تو کہتے کہ نہیں صاحب سب کا فتویٰ اس پر نہیں ہے، اور جواز (جائز ہونے) کا فتویٰ زیادہ معتبر اور صحیح ہے، اور میں نے کہا کہ شیعی سنی کے تناکح (شیعہ سنی سے نکاح کرنے) کا مسئلہ وہ ایک مستقل بحث ہے، میں اس وقت اس میں گفتگو نہیں کرتا، مگر تم سے صرف یہ استفسارات (چند سوال دریافت) کرتا ہوں، تاکہ تم کو اس کوشش کا مبنیٰ (بنیاد) معلوم ہو، غرض بالکل لاجواب ہو کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، یہ صورت مذکورہ مختصر نمونہ تھا تحلیل محرمات کا جن میں لوگ بکثرت مبتلا ہیں،

اُن عورتوں کا بیان جن سے شرعاً نکاح درست ہے۔

اب اس کے مقابلہ میں ایک دوسری فہرست ان کوتاہیوں کی جو تحریم بعض محللات (نکاح کے لئے بعض شرعاً حلال عورتوں سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں) کے متعلق مذکور ہوتی ہیں، یعنی احکامِ شرعیہ کی ناواقفی سے بعضی عورتوں کو جو شرعاً حلال ہیں حرام اعتقاد کر لیا گیا ہے، مثلاً بہت سے عوام ممانی سے، چچی سے، اسی طرح پیرانی اور استانی سے، اسی طرح شاگردنی اور مریدنی سے نکاح کرنا حرام سمجھتے ہیں، اسی طرح رضاع (دودھ پلانے) کا ایک مسئلہ بڑھا دیا ہے کہ ایک برتن میں میاں بی بی کے دودھ کھانے کو موجبِ حرمت رضاع و فسادِ نکاح سمجھتے ہیں،

اسی طرح ایک حکم مصاہرت میں بڑھا دیا، کہ سوتیلی ساس یعنی بیوی کی سوتیلی ماں سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں، اور اگر کوئی ایسا کر لیتا ہے تو اس پر بے حد طعن و ملامت کرتے ہیں، یہ سب زیادت فی الدین (دین میں زیادتی کرنا) ہے، البتہ سوتیلی ساس کو زندہ بی بی کے ساتھ جو اسکی

سوتیلی بیٹی ہے، نکاح میں جمع کرنا اس کو بعض علماء نے منع کیا ہے، سو اس میں اگر احتیاط کرے افضل ہے، اور باقی صورتیں بالاجماع حلال ہیں، گو بدنامی کی بات نہ کرنا اس نیت سے کہ لوگ طعن کر کے گنہگار ہوں گے احسن ہے، اور ان محللات کو محرمات میں داخل سمجھنے پر علاوہ فسادِ اعتقاد کے ایک اور عملی مفسدہ مرتب ہوتا ہے، وہ یہ کہ مسئلہ سب کا سنا ہوا ہے، کہ محرمات سے پردہ نہیں ہے، پس بے تکلف اُن رشتوں میں بے حجابی (بے پردگی) اختیار کی جاتی ہے خصوص مریدنی تو اگر پردہ کرنے لگے، بعض اقالیم الجہالت (جہالت کے علاقوں) میں اس کی بُری گت بنتی ہے، بلکہ بعض تو بے شرع پیر بھی بُرا مانتے ہیں، سو یاد رکھو ان سب تعلقات سے محرمیت شرعیہ (شرعی حرمت) نہیں ہوتی، اس لئے پردہ واجب ہوگا،

سالی کو بھی پردہ کرنا واجب ہے اسی طرح سالی گو اپنی بہن کے بقاءِ نکاح (نکاح کے باقی رہنے) تک حرام ہے، مگر محرم ابدی (ہمیشہ کے لئے حرام) نہیں، اس لئے بھی پردہ واجب ہے،

بیک وقت چار عورتوں سے نکاح کو حرام سمجھنا سراسر ضلالت ہے ایک مخترع فرد (ایک نئی صورت) اس تحریم حلال کی اس وقت ملاحدہ کی تقلیدِ کور (بے دینوں کی اندھی تقلید) سے پیدا ہوئی، یعنی بعض مریدانِ فطرت نے بعض اقوام یورپ کی دیکھا دیکھی دعویٰ کیا ہے کہ ایک عورت سے زیادہ دوسری تیسری چوتھی عورت سے نکاح جائز نہیں، اور یہ غلطی پوری مقابل ہے، فہرست سابق کی بالکل آخیر غلطی کی کہ وہاں چار سے زائد کو حلال کیا گیا، یہاں ایک سے زائد چار تک کو بھی حرام کہا گیا؛ اور منشاء تو اس قول کا استحسان ہے، آراء، واہواءِ اہلِ یورپ کا، لیکن چونکہ اپنے کو اسلام کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، اس لئے اس دعوے کو زبردستی قرآن میں بھی ٹھونس دیا، کہ دو جگہ سے دو آیتیں لیں اور ہر ایک کے معنی میں تحریف کی، اس طرح سے اپنا مطلب پورا کیا، چونکہ وہ علمی مضمون ہے، اور اس کے جواب سے احقر اپنی تفسیر[1] میں فارغ ہو چکا ہے، اسی لئے یہاں اسی قدر پر اکتفاء کیا گیا، یہ صورتیں تو تحریمِ حلال (حرام کو حلال کرنے) کی اعتقاداً (عقیدے کے اعتبار سے) تھیں،

---

[1] احقر نے یہ تفسیر بیان القرآن سے کتاب ھذا کے رسالہ "الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ" کی ذیلی سُرخی "...... تعددِ ازدواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب" کے حاشیہ میں من وعن مکمل نقل کر دی ہے جسے آپ آگے ملاحظہ فرمالیں گے، (بندہ احقر قریشی غفرلہ)

شوہر سے فسخ نکاح کی خاطر مرتد ہونے سے نکاح باطل ہی نہ ہوگا

ایک صورت اس کی عملی ایجاد کی گئی ہے، وہ یہ کہ کسی عورت کو خود یا کسی ناجائز تعلق کے سبب شوہر کے پاس رہنا منظور نہ ہوا اور وہ طلاق وغیرہ دیتا نہیں، نعوذ باللہ وہ مرتد ہوگئی، جس سے نکاح فسخ ہوگیا، پھر مسلمان ہو کر آزاد رہنے لگی، یا اس ناجائز موقع پر نکاح کر لیا، اللہ تعالیٰ حبائلِ شیطان (شیطان کے پھندے) سے محفوظ رکھے ہمارے فقہاء نے ایک قانونِ شرعی سے اس کا خوب انتظام فرمایا ہے، کہ مسلمان ہونے کے بعد (خواہ اپنی رضا سے ہو جائے ورنہ جبر کر کے مسلمان کیا جائے گا اس کے بعد) جبراً شوہر اول ہی سے نکاح کرایا جائے گا، اور ایک روایت یہ ہے کہ ایسے ارتداد سے وہ نکاح سے خارج ہی نہ ہوگی۔ (کذا فی الدر المختار و رد المحتار ج ۳، ص ۲۹۳)

جوش میں تین طلاق کی قسم کھانے سے تینوں طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں

بعضے لوگ کسی جوش میں قسم کھا بیٹھتے ہیں کہ میں اگر فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس کو تین طلاق، اور اس حلف کے بعد پھر وہ نکاح کرتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس منکوحہ پر تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی، اور اس مسئلہ میں زائد تفصیل ہے، اس سب کے لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں، اگر کسی نے ایسی حرکت کی ہو اس کو چاہئے کہ در مختار کی کتاب الحدود سے قبل کی یہ عبارت حلف لایتزوّج فزوّجه فضولی فاجاز بالقول یحنث (یعنی کسی نے قسم کھائی کہ میں شادی نہیں کروں گا، کسی اور نے بغیر اس کی اطلاع کے اس کا نکاح کرا دیا اور اس نے اس کی اجازت دیدی تو وہ حانث ہوگا[1]) اور اس کے متعلق ردّ المحتار (شامی) کا حاشیہ کسی عالم محقق کے پاس جا کر تحقیق کرلے،

اولاد کی تعداد بیس تک پہونچ جائے تو جاہل عوام کے اعتقاد کے مطابق نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔

ایک صورت تحریمِ حلال کی عوام سے اور سنی گئی ہے، وہ یہ کہ جس عورت کے بیس اولاد ہو جائیں، اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، محض لغو اور باطل ہے،

متبنّیٰ کی بی بی سے نکاح حرام نہیں

اور بعض متبنّیٰ (منھ بولے بیٹے) کی بی بی سے نکاح کو بھی مذموم سمجھتے ہیں، یہ فرد تحریمِ حلال کی خاص اس جاہلیت کا مسلک ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر میں طعن کیا تھا، اور حق تعالیٰ نے اس رسمِ جاہلیت کے ابطال کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا مامور فرمایا؛

---

[1] حانث سے مراد یہ ہے کہ نکاح کے ہوتے ہی اس کی منکوحہ کو طلاق ہو جائے گی، ۱۲ نجیب

بیوہ کے نکاح کے اظہار میں ننگ وعار بالکل لغو ہے ، | آخر میں ایک جزئیہ اس کلیہ کا جس میں اعتقاداً تو نہیں عملاً وحالاً عوام سے خواص تک اور نساء (عورتوں) سے رجال (مردوں) تک سب ہی مبتلا ہیں، اِلَّامَنْ شَاءَ اللہ (مگر جسے اللہ چاہے) اور وہ بیوہ عورت کا نکاح ہے، کہ گو اعتقاد نے تو سب اس کو حلال ہی سمجھتے ہیں، مگر اس سے اس قدر عار وننگ ہے کہ بعض اوقات اس کے اظہار میں کفر تک لازم آجاتا ہے، چونکہ اس کا استحسان بالکل طے شدہ مسئلہ ہے، اس لئے تطویلِ کلام کی حاجت نہیں،

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ،

(" اے اللہ ہمیں راہِ حق دکھلا اور اس پر چلنے کی توفیق بخش اور راہِ باطل واضح کردے اور اس سے محفوظ رکھ")

ضمیمہ فہرست بالا

ایک صورت تحریم حلال کے قبیل سے جو جہلاء کا مذعوم ہے
یہ ہے کہ عنین یعنی نامرد سے نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے؛

نامرد کے ساتھ نکاح بالکل صحیح ہو جاتا ہے، یعنی اس کو مثل عورت کے سمجھ کر عورت کے ساتھ اس کے نکاح کو باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بالکل ہی غلط ہے، صریح دلیل فقہی اس کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ اس صورت میں منکوحہ کے مطالبہ پر اس کو علاج کے لئے مہلت دی جاتی ہے، اور اگر شفاء ہو جاوے تو اس نکاحِ سابق پر اکتفاء کیا جاتا ہے، نکاحِ جدید کا حکم نہیں کیا جاتا، معلوم ہوا کہ پہلا نکاح منعقد و صحیح ہو جاتا ہے،

نامرد کو از خود نکاح کرنا گناہ ہے البتہ ایسے شخص کو جبکہ اس کو علامات سے اپنا عاجز ہونا معلوم ہو تو خود نکاح کرنا ہی گناہ ہے، تو تحریم بمعنی گناہ تو واقع ہے، مگر تحریم بمعنی عدمِ انعقاد نکاح (نکاح صحیح نہ ہونا) واقع نہیں، اسی لئے اس کے لئے احقر نے اوپر یہ عنوان تجویز کیا ہے "تحریم حلال کے قبیل سے" (حلال کو حرام سمجھنے کی قسم سے) کیونکہ یہ ایک درجہ سے تحریم ہے ایک وجہ سے نہیں،

نامرد کے پیچھے نماز پڑھنے سے نماز صحیح ہو جاتی ہے؛؛؛ اور اس شخص کے اسی الحاق بالنساء (عورتوں میں شامل ہونے) کے خیال پر ایک دوسری غلطی جو کہ اس باب سے نہیں ہے، جہلاء مبتلا ہیں، یعنی اس شخص کے پیچھے نماز کو ناجائز یا مکروہ سمجھتے ہیں، جس کی کچھ اصل نہیں،

خصی اور ہیجڑے کی امامت مکروہ ہے، اور یہی حکم ہے خصی و مجبوب کا، یعنی جس کے بیضے نکال دیئے گئے ہوں جسکو خوجہ یا خواجہ سرا کہتے ہیں، یا جس کا خاص اندام (عضو مخصوص) قطع کر دیا گیا ہو جس کو ہمارے محاورہ میں مخنث یا ہیجڑا کہتے ہیں، وہ بھی مرد ہے اور اس کا حکم مردوں کا سا ہے، گو بصورت اس کے فاسق ہونے یا اس سے جماعت کی نفرت کرنے کے اس کی امامت مکروہ ہے، اول صورت میں تحریماً دوسری میں تنزیہاً،

نامرد، خصی اور ہیجڑے وغیرہ سے پردہ واجب ہے

ان ہی احکام .... میں سے یہ بھی ہے کہ اُس سے عورتوں کو پردہ بھی واجب ہے، جس طرح عام مردوں سے، اس میں بھی ناواقف بکثرت مبتلائے غلطی ہیں،

عنینیت مرض ہے اور قطع عضو سخت گناہ ہے !!!

اس میں اور عنین میں اتنا فرق ہے کہ عنینیت مرض ہے جس میں کوئی گناہ نہیں، اور قطعِ عضو سخت گناہ ہے، اگر خود کسی نے اپنے لئے ایسا تجویز کیا وہ فاسق ہے، جب تک توبہ نہ کرے، اور جو اس کے بلا علم یا بلا اختیار کسی اور نے کیا ہے وہ فاسق ہے،

مہلا بھی مردوں میں شامل ہے

اور اسی کے ساتھ حکم سمجھنا چاہئے ایسے شخص کا جس کی چال ڈھال یا بول چال میں زنانہ پن ہو، اس کو ہمارے محاورے میں مہلا کہتے ہیں، سو وہ بالکل مرد ہے، البتہ اگر اس کی یہ مشابہت بالنساء خلقی (عورتوں سے مشابہت قدرتی) ہے تو وہ معذور ہے، اور اگر قصداً (جان بوجھ کر) ہے جس کو تشبہ کہتے ہیں تو حدیث[1] میں ایسے شخص پر لعنت آئی ہے،

نامرد سے عورت کی تفریق کرانے کا خاص قانون ہے

اور ایک غلطی عنین کے متعلق کم واقفیت لوگوں کو واقع ہوتی ہے، کہ وہ تحلیل حرام کی فہرست میں داخل ہوجاتی ہے، وہ یہ کہ اس کے نکاح کو تو منعقد سمجھتے ہیں، مگر شوہر سے اس کی تفریق کردینے کو عورت یا برادری کے اختیار میں سمجھتے ہیں، کہ جب چاہا دوسری جگہ اس کا نکاح کردیا گیا، سو یہ بھی شرع کے خلاف ہے، اس کی تفریق کا شرعاً خاص قانون ہے، جو کتبِ فقہ میں مفصلاً مذکور ہے، اور احقر نے بہت عام فہم اور سلیس عبارت میں اس کو تتمہ[2] امداد الفتاویٰ، ص ۱۶۳ مطبوعہ مجتبائی پر لکھ دیا ہے، اس کا مطالعہ ضروری ہے،

---

[1] چنانچہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لَعَنَ اللّٰہُ الْمُتَشَبِّہِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّہَاتِ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ (یعنی اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی شباہت بناتے ہیں اور اُن عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت بناتی ہیں) احقر قریشی غفرلہٗ

[2] احقر ناکارہ کے پاس امداد الفتاویٰ کی مذکورہ جلد نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی ہی تصنیف "الحیلۃ الناجزۃ للحیلۃ العاجزۃ" کے رسالہ "المرقومات للمظلومات" سے وہ قانون نقل کرتا ہوں جو عام فہم بھی ہے اور مفصل بھی، وہو ھذا:۔ (بندہ احقر قریشی غفرلہٗ) "زوجۂ عنین کے لئے تفریق کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنا معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کرے، قاضی واقعہ کی تحقیق کرے، یعنی اول خاوند سے دریافت کرے

مرض رتقا والی عورت کا نکاح منعقد ہو جاتا ہے،

ایسے ہی ایک غلطی اسی قسم کی اس عورت کے متعلق ناواقفوں کو ہوری ہے جس میں بوجہ حائل (آڑ) ہو جانے کسی ہڈی یا جلد وغیرہ کے خاص موقع پر، ہمبستری کی صلاحیت نہیں ہے، جس کو عربی میں رتقا کہتے ہیں، اس کو ملحق بالرجال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اگر وہ خود اقرار کرے کہ بیشک میں اس عورت سے ہمبستری پر قادر نہیں تو اس کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے، اور اگر وہ اقرار نہ کرے بلکہ جماع کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہے کہ اگر عورت باکرہ ہونے کا دعویٰ کرے تب تو مرد سے حلف لیا جائے گا، اور اگر اس نے حلف کرلیا تو عورت کو تفریق کا حق حاصل نہ ہوسکے گا، اور اگر شوہر نے حلف سے انکار کردیا تو اس کو ایک سال کی مہلت بغرض علاج دیدی جائے گی، اور اگر عورت باکرہ ہونے کی مدعی ہو تو قاضی عورتوں سے اس کی بیوی کا معائنہ کرائے، ایک عادل تجربہ کار عورت کا معائنہ بھی کافی ہے، لیکن احتیاط اس میں ہو کہ دو عادل عورتیں معائنہ کریں، آگے بعد معائنہ کے دو صورتیں ہیں، (۱) ایک صورت یہ کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ یہ عورت باکرہ یعنی کنواری نہیں رہی، تب تو خاوند سے اس بات پر حلف لیا جائے کہ اس نے جماع کیا ہے، اور اگر وہ حلف کرے تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور عورت کو تفریق کا حق باقی نہ رہے گا، اور اگر شوہر حلف سے انکار کردے تو تاجیل یعنی ایک سال کی مہلت کا حکم کردیا جائے، (۲) اور دوسری صورت یہ ہے کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ ابھی تک یہ لڑکی باکرہ (کنواری) ہے، تو پھر قاضی بدون کسی سے حلف لئے ہوئے شوہر عنین کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے، ——— خلاصہ یہ کہ جب کسی دلیل سے متحقق ہوجائے کہ عورت باکرہ نہیں بلکہ ثیبہ ہے، خواہ ثیبہ ہونا اس طرح معلوم ہو کہ وہ بیوہ ہو اور شوہر اول سے اولاد ہوچکی ہو، یا خود عورت کے اقرار سے یا عورتوں کے معائنہ سے، ان تینوں حالتوں میں مرد کا قول حلف کے ساتھ قبول کیا جائیگا کہ وہ ہمبستری کرچکا، اور عورت کو علیحدگی کا حق نہ دیا جائے گا، اور اگر تینوں حالتوں میں مرد حلف سے انکار کردے تو عورت کا دعویٰ درست مان کر مرد کو ایک سال کی مہلت دیدیں، اور اگر عورتوں کے معائنہ سے زوجہ کا باکرہ ہونا ثابت ہو تو بدون حلف ہی ایک سال کی مہلت دیدی جائے، اور اس مدت کے لئے ظاہر الروایۃ میں قمری سال کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن روایت حسن میں شمسی سال کو لیا ہے، اور بعض صحاب ترجیح نے احتیاطاً اسی کو اختیار کیا ہے، اور عموماً متاخرین نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، اور اب بھی عام اہل فتویٰ کا یہی معمول ہے، اور یہ سال حاکم کی مہلت دینے کے وقت سے شروع سمجھا جائے گا، اس سے پہلے خواہ کتنی ہی مدت گذر گئی ہو، معتبر نہ ہوگی، پھر ایک سال بھر کے عرصہ میں اگر شوہر کسی طرح علاج کراکے تندرست اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

(آدمیوں کے مشابہ) سمجھ کر اس سے بھی نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے، یہ بھی محض غلط ہے،

خنثیٰ کا کسی سے نکاح نہیں ہو سکتا، البتہ انسان کی ایک خاص قسم ہے جس میں شبہ الحاق بالنساء... (عورتوں کے مشابہ ہونے) کا بھی ہے، اور الحاق بالرجال (مردوں کے مشابہ ہونے) کا بھی، اس کو شریعت کی اصطلاح میں خنثیٰ کہتے ہیں کہ اس میں تمام علامات ذکورت و انوثت کے (مردوں اور عورتوں کی پوری علامتیں) برابر درجہ میں متعارض ہیں، سو اس کا نکاح کسی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جماع پر قادر ہو گیا، اور ایک مرتبہ بھی ہمبستری کر لی تو عورت کو فسخ نکاح کا حق جاتا رہا بلکہ ہمیشہ کے لئے (یہ) حق باطل ہو گیا، اب کبھی علٰحدگی کا مطالبہ نہیں کر سکتی، اور اگر اس عرصہ میں ایک مرتبہ بھی جماع نہ کر سکا تو عورت کے دوبارہ درخواست کرنے پر قاضی تحقیق کرے، اگر خود شوہر نے اقرار کر لیا کہ بیشک میں قادر نہیں ہوا تب تو عورت کا دعویٰ بلا غبار صحیح ہو گیا، اس صورت میں قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اگر علٰحدگی درکار ہو تو طلب کرو، ورنہ اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کو گوارا کرو، اس پر وہ اگر اسی مجلس میں علٰحدگی چاہے تو خاوند سے طلاق دلوادی جائے، اگر وہ انکار کرے تو قاضی تفریق کردے، (جیسا کہ آئندہ عنقریب آئے گا) اور اگر خاوند اقرار نہ کرے، بلکہ جماع ہو چکنے کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہے کہ مہلت دینے کے وقت اگر عورت کا ثیبہ ہونا ثابت ہو چکا تھا، یا اب عورت اقرار کرے کہ کسی طرح بکارت زائل ہو چکی ہے، مگر ہمبستری نہیں ہوئی، تب تو خاوند سے حلف لیا جائے، اگر وہ قسمیہ کہدے کہ میں نے جماع کیا ہے تو مرد کا قول معتبر ہوگا، اور تفریق نہ ہو سکے گی، اور اگر شوہر نے اس وقت بھی حلف سے انکار کر دیا تو تو عورت کو طلبِ فراقت کا اختیار دیدیا جائے گا، اور اگر مہلت دینے کے وقت سے معائنہ سے باکرہ ہونا ثابت ہوا تھا، اور اگر اب دوبارہ معائنہ میں بھی باکرہ ہونے کی تصدیق ہو تب بھی عورت سے بدون حلف لئے ہوئے قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اپنے خاوند کے نکاح میں رہے، یا تفریق کا مطالبہ کرے۔ اور جن صورتوں میں قاضی عورت کو اختیار دے چکا اُن میں حکم یہ ہے کہ عورت اگر اسی مجلس میں تفریق چاہے تب تو تفریق ہو سکتی ہے ورنہ نہیں، پس اگر عورت نے اسی مجلسِ تخییر (اسی اختیار دیئے جانے والی مجلس) میں یہ کہہ دیا کہ میں اس شوہر سے علٰحدہ ہونا چاہتی ہوں تو قاضی اس کے شوہر سے کہے کہ اس عورت کو طلاق دیدو، اس پر اگر خاوند نے طلاق دیدی تو طلاقِ بائنہ واقع ہو جائے گی، اور اگر وہ طلاق دینے سے انکار کردے تو قاضی خود تفریق کردے یعنی مثلاً یہ کہدے کہ میں نے تجھ کو اس نکاح سے الگ کر دیا، یہ تفریق بھی شرعاً قائم مقام طلاق بائنہ کے واقع ہو جائے گی۔" (الحیلۃ الناجزہ، ص ۲۳۶ تا ۲۲۹)

جائز نہیں، نہ مرد سے کیونکہ شاید وہ بھی مرد ہو اور نہ عورت سے کیونکہ شاید وہ بھی عورت ہو اور کسی دوسرے خنثیٰ مشکل سے کیونکہ شاید دونوں مرد ہوں یا دونوں عورت ہوں اور اس کے تمام احکام میں دونوں شبہوں کا لحاظ کر کے بے حد رعایت کی گئی ہے، جس سے فقہائے اسلام کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے، اور فقہ میں اس کا ایک مستقل باب منعقد کیا ہے، کیونکہ ایسے شخص کا وجود بہت ہی نادر ہے، اس لئے اس کے احکام[۱] کا بیان یہاں ضروری نہیں سمجھا گیا،

ولد الزنا سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے ایک صورت تحریمِ حلال کی بعض عوام سے سُنی گئی کہ ولد الزنا (حرامی اولاد) کے نکاح کو بھی باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اپنے کفو سے بھی درست ہے، اور غیر کفو سے بھی، جہاں کفارت کا شرط ہونا شرعاً ضروری نہ رہے، نیز درست ہے، جس کی تفصیل کے لئے فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے،

نان ونفقہ کی خبر گیری نہ کرنے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا ایک صورت تحلیلِ حرام کی عوام نے ایک اور تراش رکھی ہے، یعنی جو مرد نان ونفقہ کی خبر گیری نہ کرے، یا مقدور (طاقت) نہ رکھے اس کے نکاح کو از خود منفسخ (ختم) سمجھ کر اس کا نکاح دوسری جگہ کر دیتے ہیں، اسی طرح جو عورت شوہر کے گھر سے نکل کر بدکاری کرنے لگے، یا شوہر اس کو نکال کر ایک عرصہ دراز تک اس سے تعلق نہ رکھے اس کو بھی نکاح سے خارج سمجھ کر اس کو نکاح ثانی کی اجازت دیدیتے ہیں، یہ سب بالکل غلط در غلط ہے، البتہ تفریقِ معسر (ناداری کے باعث تفریق) میں امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ مسلمان حاکم جس کو سلطنت سے ایسے مقدمات کا باضابطہ اختیار دیا گیا ہو، اعسار (ناداری) کی حالت میں نکاح فسخ کر دیگا، اور بدون اس شرط کے وہ بھی از خود منفسخ نہیں کہتے، جیسا عوام نے غلط سمجھ رکھا ہے، جس طرح مفقود کی تفریقِ نکاح میں امام مالکؒ کے مذہب پر قضاءِ قاضی شرط ہے جس کو بندہ نے اوپر بھی لکھا ہے، کہ اس اشتراط کی کتبِ مالکیہ میں بھی تصریح ہے، اس وقت اس کا پتہ بھی عرض کئے دیتا ہوں، زرقانی مالکیؒ نے شرح مؤطا میں ایک ہی عبارت میں چار جگہ اس کی تصریح کی ہے، بندہ کے تتمہ ثانیہ امداد الفتاویٰ، ص ۱۶۸ میں وہ عبارت بعینہٖ منقول ہے ضرور ملاحظہ فرمائی جائے، بہرحال حلت وحرمت میں سخت احتیاط درکار ہے،

یہ ضمیمہ ختم ہوا، ۲۶ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

---

[۱] جہاں ایسے مسائل کی ضرورت پڑے تو علماءِ محققین یا کسی معروف دار الافتاء سے رجوع کرنا چاہئے، (قریشی)

ضمیمۂ ثانیہ

در نقل رسالہ

الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ

متعلقہ بعض اغلاط متعلقہ تحریم محللات

کہ خطیکے از کار انست ؛

برادر عزیزم سلمہ ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ ، آں عزیز کے استفساری خط کی رسید اور تعجیل (جلدی) جواب نہ ہوسکنے کا عذر اس خط کے آنیکے بعد ہی جس کو آئے ہوئے تقریبًا پچیس روز ہوگئے ہوں گے، ایک کارڈ پر لکھ چکا ہوں گو مجھ کو بفضلہ تعالیٰ بخار سے نجات ہوگئی ہے، لیکن ضعف ونقاہت سے کسی معمولی سے معمولی کام کی بھی ہمت نہیں ہوتی، مگر ساتھ ہی آنعزیز کے انتظار کے تصور سے اضطراب اور خود اس جواب کا بھی غالبًا بعض مضامینِ مفیدہ کو متضمن ہونا (شامل ہونا) یہ دونوں امر متقاضی ہیں کہ بنامِ خدا جواب شروع تو کرہی دوں، اتمام قبضۂ قدرتِ الٰہیہ میں ہے، اس لئے اختصار کے ساتھ مگر قدرے ضروری تفصیل کے ساتھ جوابِ خط لکھتا ہوں،

آنعزیز نے لکھا ہے کہ اتنا معلوم ہوا کہ اس جدید تعلق سے بھابی صاحبہ کی حالت میں بہت تغیر ہوگیا ہے، اور آپ کو بھی کچھ باعثِ مسرت نہ ہوا،

عزیز من! یہ دونوں امر صحیح ہیں، اس تفصیل کی تو حاجت نہیں کہ کیا تغیر ہوا؟ اور اس تغیر کے سبب مجھ کو کیا تکدر رہا؟ کیونکہ اوّل تو اس کی حقیقت معلوم ہونا مشاہدہ پر موقوف ہے، دوسرے کم شخص ایسے ہوں گے جنھوں نے اس کے نظائر کا مشاہدہ نہ کیا ہو اس لئے یہ تفصیل بیکار ہے،

تغیر کے اسباب البتہ نتیجہ خیز بات اس تغیر کے اسباب کی تحقیق ہے، جس کی تقریر سے خود نتیجہ تک ذہن پہنچ جائے گا، اور ممکن ہو آخر میں اس کی کچھ تصریح بھی کردی جائے، سوان اسباب کا مجموعہ راجع ہے دو امر کی طرف، ایک حد سے زیادہ جاہل ہونا طبقۂ اناث (عورتوں) کا، خواہ جہل علمی یعنی ناواقفی شرائع (علمی جہالت یعنی شریعت سے ناواقفیت ہونا) خواہ جہل عملی جس کو ہمارے محاورہ میں جہالت کہتے ہیں، جس کے شعبوں میں زیادہ تر دخل بدگمانی وبدزبانی وکبر

حسد وحبِ دنیا ونسیانِ آخرت (دنیا سے محبت اور آخرت کو بھلانے) کو ہے، دوسرا حد سے زیادہ محبت ہونا بیبیوں کو شوہروں سے، امرِ اوّل کا ظہور خود منکوحہ اولیٰ سے زیادہ جو کہ صاحبِ معاملہ ہے دوسری عورتوں میں زیادہ معلوم ہوا، چنانچہ ایسے موقع پر جو اقوال ان جہلاء کے سننے میں آئے وہ اس کی بیّن (واضح) دلیل ہیں

خاوند کے دوسری عورت سے نکاح کرنے پر جاہل عورتوں کی مختلف خیالی باتیں

(۱) ہائے بادشاہی چھن گئی (۲) ہائے ایسا ظلم (۳) بس جی مولویوں کا بھی اعتبار نہ رہا (۴) بھلا بدون اجازت منکوحہ اولیٰ[1] کے یہ دوسرا نکاح کب جائز ہوسکتا ہے۔ (۵) اگر عورت بھی دوسرا مرد کو ڈھونڈلے تو مرد پر کیسی گزرے (۶) ہائے بیٹی بیٹی کہا کرتے تھے جورو بنا کر بیٹھ گئے (۷) بیٹی کیا نواسی کی جگہ تھی (۸) ارے بھائی بھانجہ تو بیٹا ہوتا ہے، پھر اس کو بیٹا بنایا بھی تھا، ہائے بیٹے کی بیوی کو لے بیٹھے، یہ غضب (۹) بس جی ایسی عورت کا کیا اعتبار، اس کا تو اگر نانا حقیقی زندہ ہوتا اس کو بھی کر بیٹھتی (۱۰) لو اور پڑھواؤ لڑکیوں کو، ہائے استاد ہو کر شاگردنی کو کر بیٹھے (۱۱) اور مریدنی بھی تو تھی، پیر میں اور باپ میں کیا فرق ہوتا ہے (۱۲) اجی معلوم ہوتا ہے اُن میں پہلے سے ساز باز ہوگی (۱۳) بس جی اب تو سب مرید ایسا کریں گے (۱۴) اجی لڑکی نے بھی ظلم ہی کردیا جو کرنا ہی تھا اور دس تھے، بھلا جس کے پاس بچپن میں رہی، لکھا پڑھا، اسی کی چھاتی پر مونگ دلنا تھا، (۱۵) خدا کرے ان کو آرام ہی نصیب نہ ہو (۱۶) اجی ایسی بے حیا ہے تو ستر کرے گی ستر چھوڑے گی (۱۷) بس اب یہ اس بیچاری غریب کا حصہ رزق میں بھی بانٹ لے گی، (۱۸) اگر اتفاق سے کوئی حادثہ پیش آگیا، مثلاً معاش کی کمی یا بیماری تو یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ اس کا ایسا منحوس پیر آیا تھا کہ رزق اُڑ گیا، صحت اُڑ گئی، ونحو ذٰلک من الخرافات، (اور ایسی ہی بے شمار خرافات ہیں)

بعض اوقات عبادتگذار عورتیں بھی بلا سوچے کلماتِ کفر بک دیتی ہیں،

جن میں بعض اقوال تو صاف شریعت کا رد اور کفر کے قریب ہیں، اس واقعہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ بڑی بڑی لکھی پڑھی تسبیح نفلوں کی پابند، مگر تمام دین ان کا ملمع (ظاہری ٹیپ ٹاپ) ثابت ہوا، نہ یہ تمیز کہ ہم منہ سے کیا بکتے ہیں اسمیں کفر ہوجائیگا یا گناہ ہوجائے گا، نہ یہ ہوش کہ آخر نتیجہ ان خرافات کا کیا ہے،

---

[1] موجودہ دور کے عائلی قوانین میں خلافِ شریعت یہ پابندی بھی عائد کردی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

شعور وفکر کی یہ کافری معاذ اللہ!

فرنگ ترے خیال وعمل کا ہے مسجود

شوہر کے نکاح ثانی کر لینے پر عام عقلاء کے نزدیک اس کی پہلی بیوی کو تلقینِ صبر کرنا اور تسلی دینا

اپنے نزدیک تو صاحبِ معاملہ کے ساتھ ہمدردی کی جاتی ہے مگر سلیقہ نہیں کہ اس سے تو اور دونا غم کو اشتعال ہوتا ہے، ایسے وقت میں سخت ضرورت تسلی دینے کی ہوتی ہے جس کا طریقہ عام عقلاء کے نزدیک تو صبر دلانا ہے، اور جو جو شبہات آئندہ کے متعلق صاحبِ معاملہ کو واقع ہوں مثلاً یہ کہ (۱) میرے ساتھ التفات نہ رہے گا، (۲) میرے حقوق ضائع کر دیئے جائیں گے، (۳) جدیدہ کی چغلیوں سے مجھ کو تکلیف دی جائے گی، ان سب شبہات کو خوبصورتی سے رفع کرنا، اور میرے نزدیک ایسے موقع پر تسلی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مصیبت ہی تسلیم نہ کیا جائے کہ صبر کی ترغیب دی جائے، اور یہ جو میں نے کہا کہ "ایسے موقع پر تسلی کا طریقہ یہ ہے" مراد ایسے موقع سے وہ موقع ہے جہاں اس کا نعمت ہونا بھی ثابت کر سکے، جیسے :-

حضرت حکیم الامتؒ کا طریقۂ عمل

بفضلہٖ تعالیٰ اس ناکارہ کی حالت ہی، وہ یہ کہ میں نے قدیمہ (یعنی پہلی بیوی) کی دل جوئی میں بے حد بیشی (پہلے سے بہت زیادتی) کر دی، گو میں نے کوئی گناہ کا، یا عیب کا کام نہ کیا تھا، لیکن اُن کے عین فورانِ شکایت (شکایت کے دوران خون کا جوش مارنے) میں اُن کے تجاوز عن التہذیب (تہذیب کی حد سے گذرنے) کو غلبۂ حال پر محمول کر کے اُن کو معذور قرار دیا، اور اس طرح سکون و سکوت و ضبط سے کام لیا، جیسے کوئی عیب کر کے خجل و شرمندہ ہوتا ہے، اور تمام تر جوش و خروش کا جواب ان الفاظ سے دیا کہ خیر میں نے دل سے سب معاف کیا، اللہ تعالیٰ تمھاری اصلاح فرمائے، میں بوجہ پختگیِ سن و کثرتِ مشاغل خدمتِ خلائق ان سے بالکل بے فکر ہو گیا تھا بعض اوقات دن دن بھر گھر جانے کی نوبت نہ آتی تھی، عشاء کی نماز پڑھ کر فوراً سو رہتا، بات کی بھی فرصت نہ ملتی تھی، مگر اب اُن کی دلجوئی کا خاص اہتمام شروع کر دیا، ذرا ذرا... بات میں ان کی رعایت ملحوظ کرنے لگا، چونکہ میرا مزاج فطرۃً تیز ہے اور عورتوں میں کجی (ٹیڑھا پن) لازم ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، اکثر جب کبھی ایسا موقع پیش آتا تھا اس میں تحمل (برداشت) نہ کرتا تھا قولاً (زبان سے) بھی تیز الفاظ کہتا، اور عملاً بھی، بعض اوقات کھانا چھوڑ کر گھر سے مدرسہ میں چلا آتا تھا، ایسا اتفاق بکثرت ہوتا تھا، جب سے یہ واقعہ ہوا اُس برتاؤ کا نام و نشان نہیں رہا، اور اُدھر سے کتنی ہی کجی ہوئی اِدھر سے بہت زیادہ نرمی اور راستی (سیدھا پن) برتی گئی، خلاصہ یہ کہ اس قدر نرم برتاؤ اختیار کیا گیا کہ بعض لوگ تو مجھ کو بے غیرت کہنے لگے، بعضے بیوی سے ڈرنے والا، دبنے والا کہنے لگے، بعض نے یہ رائے قائم کی کہ یہ نرمی ہی سبب ہے دوسری جانب کی دلیری کا، البتہ یہ تو ہوا کہ جب کبھی شریعت پر

اعتراض پہنچنے لگا، گو صاحبِ اعتراض کو اس کا احساس نہیں ہوا یا بیہودگی کو زیادہ امتداد ہونے لگا، اول تو نرمی سے فہمائش کردی، اگر پھر اصرار ہوا تو دوبارہ فہمائش (سمجھانے) میں قدرے آواز بلند ہوگئی، مگر اس میں بھی الفاظِ خشن (درشت) اور تیز سے زبان کو نہایت تکلف کے ساتھ روکا

غرض یہ خلاصہ تھا اور ہے میری حالت کا، تو اس میں غور کر کے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ میرا برتاؤ پہلے سے زیادہ اچھا ہوگیا، اور سبب اس کا وہی دل شکنی کے احتمال پر دلجوئی اور اس دلجوئی کا سبب یہی واقعۂ جدیدہ، تو اس صورت میں کیا شک رہا، کہ اس واقعہ کا قدیمہ کے حق میں نعمت ہونا بھی نہایت آسانی سے ثابت کیا جاسکتا ہے، بس طریق تسلّی کا یہ تھا، اور اگر یہاں تک ذہن نہ پہنچتا تو خیر صبر ہی کی تعلیم دی جاتی، اگر دو چار عاقل عورتیں بھی اس طرف توجہ کرتیں تو ان کے رنج وغم کی یہاں تک نوبت نہ پہنچتی، مگر جو آئی ان کے خیالات کی جن میں اکثر بلکہ کُل کے کُل لغو اور بے بنیاد تھے تصدیق ہی کرتی آئی۔ کسی نے تکذیب نہیں کی، اِلّا ماشاء اللہ، اور تصدیق بھی صرف خوشامد میں اور اس مصلحت سے کہ یہ یوں نہ کہیں کہ فلانی کو میرے ساتھ ہمدردی نہیں، بس اس تصدیق سے اُن کے اوہام اور خیالات اور پک گئے، اور وہ مثال ہوگئی جیسے کسی میانجی کو اس کے مکتب کے لڑکوں نے باہم متفق ہو کر بیمار ڈال دیا تھا کہ جو آتا ہے ”خیر ہے؟ چہرہ اُداس کیوں ہے؟ آخر بیچارہ بیمار پڑ گیا،

جو شخص اپنی اصلاح خود نہ چاہے نبی بھی اس کی اصلاح نہیں کرسکتا،

میں نے اس دلجوئی کے علاوہ اصلاحِ باطن کے طریقوں سے اس قدر کام لیا کہ شاید بیس پچیس برس کی مدت میں کسی کے لئے نہ لیا ہوگا، ان میں بعض طریقے منقول تھے اور بعضے بزرگوں کے کلام سے مستنبط کئے ہوئے، اور ایسے لطیف لطیف کہ اگر ان کی کوئی قدر کرتا تو ضبط کرنے سے تو ایک بے نظیر رسالہ سلوک کا بنتا، اور عمل کرنے سے انسان کامل بن جاتا، مگر تجربہ سے معلوم ہوا اور پہلے سے بھی معلوم تھا مگر اب اور زیادہ معلوم ہوگیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے اس کی اصلاح کوئی مخلوق نہیں کرسکتا حتّٰی کہ نبی بھی،

اپنے مصلح کے ساتھ اصلاح کے لئے اعتقاد اور انقیاد ہونا ضروری ہے،

دوسرے یہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلاح کے لئے مصلح (اصلاح کرنیوالے پیر و مرشد) کے ساتھ اعتقاد اور عظمت کا ہونا شرط ہے، اور شوہر کے ساتھ یہ دونوں امر ضعیف ہیں، بہرحال میں نے تھک کر حق تعالیٰ سے التجا اور دعا شروع کی ہے، اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قول کے موافق:-

وَلَمْ أَكُنْ بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ (مریم: آیت ۴) "اور اس کے قبل کبھی میں آپ سے مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں"

امید قبول رکھتا ہوں اور غالباً پہلے کی نسبت سکوت و سکون دونوں کی رفتار ترقی پر ہے، اور جب مرض میں روزانہ انحطاط ہوا امید قوی وہاں صحت کی ہی ہوتی ہے، یہ تو خلاصہ تھا ان کے غم اور اس غم میں ان کے ساتھ میرے معاملہ کا،

اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے تو کلفت بھی مسرت ہے، اس سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ آپ کو بھی کچھ باعثِ مسرت نہ ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کیا مسرت ہو سکتی ہے، جبکہ اسبابِ مسرت پر اسبابِ کلفت غالب ہوں، مگر یہ نفی مسرت کی جو میں نے تسلیم کر لی یہ ظاہری مسرت کے اعتبار سے ہے، ورنہ باطناً تو اگر اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے یہ کلفت بھی مسرت ہے، کیونکہ مسرت کے جو منافع ہیں اس کلفت میں اس سے کم نہیں، بلکہ بہت زیادہ حاصل ہیں، گو اس زیادہ پر نظر کر کے نہ کلفت کی تمنا کرے اور نہ اس کے رفع کی دعاء کو ترک کرے، حق تعالیٰ سے برابر عافیت مانگتا رہے، لیکن جب تک عافیت ظاہری نہ ہو اس میں مصلحتیں و حکمتیں سمجھ کر دل سے راضی اور ثواب کا متوقع (امیدوار) رہے، چنانچہ الحمد للہ کچھ کچھ اس پر عمل ہے، جس سے زخم پر مرہم رکھا جا رہا ہے، ورنہ ع

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

اسبابِ تغیر جہالت اور محبت ہیں ہاں میں نے اسبابِ تغیر میں ایک امر جہل بتلایا تھا، دوسرا امر محبت بی بی کو شوہر کے ساتھ مسرت کے جواب سے اس کو ترتیب میں مقدم لکھنا چاہئے تھا، مگر خیر اول کا ذکر ابھی دور نہیں ہوا، گویا دوسرا اس اول کے ساتھ مذکور ہے، اس امر ثانی کی سببیت اس طرح ہے کہ چونکہ بی بی کو شوہر سے خصوص ہندوستان میں یہاں کی آب و ہوا کی خاصیت سے محبت زیادہ ہوتی ہے، اور خاصہ محبت کا یہ ہے ۔

با سایہ ترا نمی پسندم ⁂ عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں، اسی لئے محبوب کے سایہ کے ساتھ بھی کسی کا ساتھ رہنا عاشق کو پسند نہیں)۔

بس اس سے یہ شرکت کہ اس کے شوہر میں دوسری آکر حصہ دار ہو جائے سخت ناگوار ہوتی ہے، اور گو یہ شرکت دوسری کو بھی کسی قدر ناگوار ضرور ہو لیکن پھر دونوں میں یہ فرق ہے کہ دوسری تو اول ہی سے شرکت کو گوارا کر کے آتی ہے، اور پہلی مدتوں انفراد و اختصاص کی حالت میں رہ چکی ہے، اس کو خلاف

ارادہ وخلافِ توقع وخلافِ رضا یہ شرکت پیش آتی ہے، اس لئے اس کو زیادہ صدمہ ہوتا ہے، اور اس کا خلافِ ارادہ وخلافِ رضا ہونا تو ظاہر ہے، باقی خلافِ توقع اس لئے کہ ہندوستان میں اس کا رواج اس قدر کم ہے گویا کہ ہے ہی نہیں،

رسم کو جذبات میں بڑا دخل ہے

اور رسم کو جذبات میں بہت دخل ہوتا ہے، اور یہاں تک دخل ہوتا ہے کہ جو امر خلافِ ارادہ وخلافِ رضا بھی نہ ہو مگر خلافِ رسم ہونے کے سبب خلافِ ارادہ و.... رضا ہونے کا بھی اثر نہیں رہتا، چنانچہ بعض جگہ سنا گیا ہے کہ منکوحہ اولی خود ہی دوسری کو اپنی رغبت وکوشش سے لائی، اور پھر آنے کے بعد ناگواری اُسی درجہ تک پہونچ گئی جیسے اُس کی لائی ہوئی نہ ہوتی، بہرحال یہ محبت بھی اس کا سبب ہے،

امرِ طبعی میں انسان معذور رہتا ہے

اور گو اس درجہ سے کہ محبت امرِ طبعی ہے تو اس کا مسبب یعنی ناگواری بھی امرِ طبعی ہوگا، اور امرِ طبعی میں انسان معذور رہی، اس لئے منکوحہ اولی نفسِ ناگواری میں معذور رہے، لیکن اگر محبت کے ساتھ علم ہوتا تو یہ ناگواری حدِ اعتدال سے نہ بڑھنے پاتی، اور بلاشک وہ قابلِ ملامت نہ ہوتی،

شہوت وغضب وحسد وکبر کا صدور جہالت کے سبب ہے

لیکن چونکہ محبت کے ساتھ مجموعۂ سبب کا ایک جزو جہل بھی ہے، جو کہ اختیاری ہے، بایں معنی کہ اس کا ازالہ اختیاری ہے، اور پھر شرعاً وعقلاً مذموم ہے اس لئے اس مجموعۂ سبب پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں، ان میں جس قدر آثار جہل کے حصّہ کے ہیں اس میں نقلاً وعقلاً معذوری نہیں ہوگی، اس لئے یہ رائے کہ علی الاطلاق ان امور میں سوتیاڈاہ (سوتن ہونیکا جلاپا) کے سبب معذور سمجھا جائے محض غلط ہے، ورنہ اس کیفیتِ غیظیہ (غصہ کی حالت) سے زیادہ اکثر اوقات کیفیاتِ شہوت وغضب وحسد وکبر جن سے صدورِ معاصی کا ہوتا ہے غالب ہوتی ہیں، تو چاہئے کہ گناہ کوئی چیز ہی نہ ہو، اور بطلان (غلط ہونا) اس کا ظاہر ہے، یہ تحقیق تھی ناگواری کے دونوں سببوں کی، اب اسی تقریر سے ان اسباب کے متعلق جو بات نتیجہ خیز ہے وہ بھی معلوم ہوگئی،

ملکات اور جذبات کی اصلاح تعلیم دین اور تربیت روحانی سے ہو سکتی ہے،

پس امرِ اوّل کے متعلق، تو وہ بات یہ ہے کہ تعلیم واصلاحِ نفس کی کمی جب سبب ان پریشانیوں کا ہے جن کا واسطہ در واسطہ دور... پہنچتا ہے، تو اس کا تدارک سب عقلاء کو متفق ہو کر کرنا چاہئے، مگر یہ جان لینا چاہئے کہ تعلیم وتہذیب سے مراد تعلیمِ دین وتربیتِ روحانی ہے نہ کہ تعلیم وتہذیبِ جدید کہ اس کو ملکات وجذبات (عادات وخصائل) کی اصلاح میں جس کی کہ ضرورت ہے، کوئی دخل نہیں، چنانچہ ظاہر ہے بلکہ وہ تو اس میں بالعکس مضر ہے، چنانچہ تجربہ شاہد ہے اگر عورتوں کو علمِ دین وحالِ باطنی ہو چکا،

طریقہ ضروریاتِ دین وحالاتِ اہل اللہ پر عبور اور وقتاً فوقتاً ان ناقصات العقل (کم عقل رکھنے والیوں) کے اقوال وافعال پر روک ٹوک کرتے رہنا ہے، توان بیہودہ اقوال میں سے ایک قول زبان پر تو کیا قلب میں بھی نہ آنے پائے، اور یوں حزن طبعی ہونا عجیب نہیں، تو اگر اس میں اعتدال ہو تو موجبِ اجر ہے، اور صبر کرنے سے بتدریج (آہستہ آہستہ) خود سکون بھی ہوجاتا ہے،

اور امرِ ثانی کے متعلق وہ بات یہ ہے کہ حالتِ موجودہ میں بدونِ اضطرارِ شدید (بغیر سخت ضرورت) کے جس کا فیصلہ نفس سے نہ کرانا چاہئے، بلکہ عقل سے کرانا چاہئے، بلکہ عقلاء کے مشورہ سے کرانا چاہئے، بدون اضطرار کے ہرگز نکاح ثانی نہ کرنا چاہئے، خصوص پختگیِ سن کے بعد کہ منکوحۂ اُولیٰ کو بعد بے فکر ہوچکنے کے فکر میں ڈالنا ہے، اور جہل اس کا لازمِ حال ہے وہ اپنا رنگ لائے گا اور اس رنگ کے چھینٹے سے نہ نا کح بچے گا نہ منکوحہ ثانیہ بچے گی، خواہ مخواہ دریائے غم میں بلکہ دریائے خون میں سب غوطے لگائیں گے، خصوص جبکہ مرد بھی عالم اور متحمل نہ ہو،

ازداجِ متعددہ والے عموماً ظلم وستم کے معاصی میں مبتلا ہیں،

علم نہ ہونے سے وہ حدودِ عدل کو نہ سمجھ سکے گا، اور تحمل نہ ہونے سے ان حدود کی حفاظت نہ کر سکے گا، اس وجہ سے وہ ضرور ظلم میں مبتلا ہوگا، چنانچہ عموماً ازواجِ متعددہ (کئی بیویوں) والے جور (ظلم (ظلم وستم) کے معاصی میں مبتلا ہیں، کیوں کہ حقوق اس تعدد (ایک سے زیادہ ہونے) کے اس قدر نازک ہیں کہ ہر ایک کا نہ وہاں ذہن پہنچ سکتا ہے اور نہ اُن کی رعایت کا حوصلہ ہوسکتا ہے،

تعددِ ازداج کی صورت میں باہم عدل رکھنے کے چند فقہی مسائل

چنانچہ باوجودیکہ شب کو رہنے میں اور ملبوس وماکول (لباس اور کھانے پینے) میں برابر رکھنے کا وجوب (واجب ہونا) سب جانتے ہی ہیں، مگر اس تک کا اہتمام نہیں، باقی ان مسائل کا تو کون خیال کرتا ہے، کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک بی بی کے پاس بعد مغرب آجاتا ہے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، تو اس نے عدل کے خلاف کیا، اور لکھا ہے کہ ہر ایک کی باری میں دوسری سے صحبت جائز نہیں، اگرچہ دن ہی ہو، اور لکھا ہے کہ ہر ایک کی باری میں دوسری کے پاس جانا بھی نہ چاہئے، اور لکھا ہے کہ اگر مرد بیمار ہوگیا اور اس وجہ سے دوسری کے پاس نہیں جاسکتا اس لئے ایک ہی کے پاس رہا تو بعد صحت کے اتنی مدت دوسری کے پاس رہنا چاہئے، اور دینے لینے میں برابری کرنے کی جزئیات بھی اس قدر دقیق (باریک) ہیں کہ انکی رعایت ہر شخص کا کام نہیں،

تعددِ ازدواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب ہے

مجھ کو اس قدر دشواریاں اس میں پیش آئیں کہ اگر علمِ دین اور حسنِ تدبیر حق تعالیٰ نہ عطا فرماتے تو ظلم سے بچنا مشکل تھا، سو ظاہر ہے کہ اس مقدارِ علم اور اس قدر اہتمام کا عام ہونا بعید بلکہ ابعد (زیادہ دور) ہے، نیز ہر شخص کو نفس کا مقابلہ کرنا بھی کارے دارد (مشکل کام)۔ اب تعددِ ازدواج بجز اس کے کہ اضاعتِ حق (حق ضائع کرکے) عاصی (گنہگار) ہو کیا نتیجہ ہو سکتا ہے،

اور یہ تو حقوقِ واجبہ تھے، بعضے حقوق مروت کے ہوتے ہیں گو واجب نہیں ہوتے، مگر ان کی رعایت نہ ہونے سے دل شکنی ہوتے ہیں، جو کہ حقوقِ رفاقت کے خلاف ہے، ان کی رعایت اور بھی رقیق اور غامض (   ) ہے، غرض کوئی شخص ہر وقت کے واقعات و معاملات کے جزئیات کو خیال رکھے اور مستحضر کرے، پھر ان واقعات کے احکام علماء سے پوچھے پھر اُن پر عمل کرے تو نانی یاد آجائے گی، اور تعددِ ازدواج سے توبہ کرے گا، اِلَّآ اَنْ تَضْطَرَّ اِلٰی ذٰلِكَ بِوَجْهٍ مِّنَ الْوُجُوْهِ الْقَوِیَّةِ (مگر کوئی شخص کسی قوی سبب سے مجبور ہو وہ مستثنیٰ ہے) اسی لئے حق تعالیٰ نے اجازتِ تعدد کے بعد اس احتمال کو صراحتًا ارشاد فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً،	"بس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔"

خود حق تعالیٰ کا اس کو اس طرح فرمانا صریح دلیل ہے کہ یہ احتمال بہت ہی غالب اور قوی ہے، پھر اکتفاء علی الواحدہ (ایک پر کفایت کرنے) کی نسبت اَدْنٰٓی اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا فرمانا یہ اس احتمال کی جانب وجود کو جانبِ عدم پر صاف ترجیح دے رہا ہے، اس لئے ؏

اگر خواہی سلامت بر کنار است

کا اختیار کرنا اسلم ہے، نتیجۂ مقصودہ جس کو میں بعد ذکر اسباب کے ذکر کرنا چاہتا تھا اور جس پر میں مزید زور دینا چاہتا ہوں، اور کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ خود کیوں اس مشورہ کے خلاف کیا، بات یہ ہے کہ خلاف کرنے ہی سے یہ مشورہ سمجھ میں آیا، ؏

من نکردم شما حذر بکنید

میں نے طبقۂ اناث سے وعدہ کیا تھا کہ میرے فعل کو تم سبب سمجھتی ہو مردوں کی جرأت کا تعددِ ازدواج پر، میں اپنے فعل کے نتائج بتلا کر اس فعل کو سبب بنا دوں گا مردوں کے رک جانے کا تعددِ ازدواج سے، کیونکہ اس فعل سے مجھ کو تجربہ ہو گیا، اور تجربہ کار کا قول زیادہ ماننے کے قابل ہے

پس میں اپنے تجربہ کی مدد سے اپنے احباب اور بھائیوں کو اس تعدد سے مشورۃً منع کرتا ہوں، اگر میں اگر میں اس تعدد کو اختیار نہ کرتا تو میرے اس منع کی زیادہ وقعت اس وقت خواہ آپ لوگ نہ کرتے تو بعید نہ تھا، لیکن اب اس ممانعت کی خاص وقعت اور اس ممانعت پر عمل کرنا چاہیے، مگر ساتھ ہی احکامِ شرعیہ میں تحریف نہ کی جائے۔

بعض نے آیت فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا (پس اگر تم کو احتمال ہو اس کا کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو) اور وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ (اور تم سے یہ بھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو) میں النساء کو جمع کر کے معنوی تحریف کی ہے، جس کی تفسیر بیان القرآن میں کر دی گئی ہے[1]:

تعددِ ازواج اختیار نہ کرنا ہی اسلم ہے،	بہرحال حکم شرعی تو یہی ہے کہ تعددِ ازواج میں نکاح تو منعقد ہرحال میں ہو جاتا ہے، خواہ عدل ہو یا نہ ہو لیکن عدمِ عدل (انصاف نہ کرنے) کے وقت گناہ ہوگا، اس لئے اسلم یہی ہے کہ تعدد اختیار نہ کیا جائے، ایک ہی پر قناعت کی جائے اگرچہ ناپسند ہو،

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء، آیت ۱۹)	"اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دی ہو۔"

إِلَّا اضْطِرَارًا استثنیتہ من قبل (مگر اضطراری حالت نے اس سے قبل کے بیان میں مستثنیٰ کر دی)،

---

[1] یہاں اس تفسیر کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوا، وہو ہذا: "بعض ہواپرستوں نے دنیوی غرض سے آیاتِ الٰہیہ کے مضمون میں تحریف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت بالکل کثرتِ ازواج کی نفی کر رہی ہے اس طرح سے کہ یہاں فرمایا کہ جب عدل نہ ہو سکے تو ایک پر اکتفا کرو اور دوسری آیت میں فرمادیا کہ تم سے کبھی عدل ہی نہ ہوگا، وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ، دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ جائز نہیں، فقط، یہ محض مغالطہ باطلہ ہے، کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل جدا جدا معنوں میں ہے اس آیت میں تو عدل فی الحقوق الواجبہ ہے، جب حضرت نے تصریح بھی کر دی، اور یہ قدرت میں ہے اور اس کے اعتبار سے واحد اور کثیر کے اختیار میں تفصیل فرمائی ہے اور اس آیت میں عدل فی المحبت ہے، اور وہ عادتاً قدرت میں نہیں، اس لئے اس کی نفی فرمائی، پس اس ہواپرست کے دعویٰ سے اس کو اصلاً مَس نہیں، بلکہ اس آیت میں بعد نفیِ عدل کے ارشاد ہے: فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ عدل فی المحبت نہ ہو سکے گا، بلکہ قلب کو ایک طرف میلان رہے گا، اور اس میلان پر ملامت نہیں، بالکلیہ میلان تو نہ ہو کہ قالب کے بھی، اور معاملات اور حقوق میں بھی، پس دونوں آیتوں کے مجموعہ سے یہ حاصل ہوا کہ عدل فی المحبۃ واجب نہیں، عدل فی المعاملہ واجب ہے،" (تفسیر بیان القرآن صہ ۱۵۹ ج ۱ تاج کمپنی)

حضرت حکیم الامتؒ کے نکاح ثانی کے اسباب

آگے آنعزیز لکھتے ہیں کہ بناء کار کی بابت معلوم ہوا کہ مشیت پر مبنی تھا اور چند مصلحتیں شرعی تھیں، ورنہ ضرورت کا سوال نہ تھا، عزیز من یہ دونوں بالکل صحیح ہیں، لیکن عنوان ان کا مجمل ہے، تفصیل نہ ہونے سے محبین و معتقدین کے بڑھا لینے کا احتمال ہے، کیونکہ اس کے یہ معنیٰ سمجھائے جائیں گے، کہ کوئی الہامی حکم ہوا ہوگا، اس وجہ سے اسکو اختیار کیا گیا جو غلو فی نفسہٖ بھی ناپسندیدہ ہے، پھر تلبیس (ملاوٹ) اس میں اور بھی زیادہ مذموم ہے، اس لئے میں نے اصلی حالت کو منکشف (ظاہر) کرتا ہوں،

سب سے اوّل اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میرا یہ فعل کسی مصلحت کی نیت سے یا کسی اشارۂ غیبیہ پر عمل کرنے کے قصد سے نہیں ہوا، سبب قریب اس کا محض طبیعت کا تقاضا تھا، گو اس تقاضے میں کسی امر غیبی کو دخل ہو، اور گو پھر اس پر بہت سی مصلحتیں بھی مرتب ہو گئی ہیں، بلا تشبیہ (بغیر مشابہت کے) ایسی مثال جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر تشریف لے جانا بہ قصدِ عطاءِ نبوّت (نبوّت عطاء ہونے کا ارادہ) نہ تھا، آگ کی ضرورت پر طبعی تقاضا تھا، مگر وہاں جانے پر خاص عطاء مرتب ہو گئی،

قصہ اس کا یہ ہے کہ میں نے مدّت ہوئی ایک خواب دیکھا تھا، کہ مجھ سے نکاح کے لئے کہا جا رہا ہے میں بطور تردد کے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر میں کا کیا حال ہوگا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن شریف پڑھا کریں گی، میں بیدار ہوا تو قرآن شریف پڑھنے کے معنی تو یہ سمجھا کہ یہ مشاغلِ دینیہ میں مشغول ہو کر اس غم کو بھول جائیں گی (چنانچہ اس کا سامان بھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے) لیکن خواب کو کچھ زیادہ باوقعت نہیں سمجھا، بلکہ اس کے اتباع کا خیال تو کیا کرتا، اس کی کوشش کی کہ ایسا موقع نہ ہو، چنانچہ اپنے بھلنجے سے پہلا نکاح کر دیا گیا، اور طبیعت خالی ہو گئی، خدا کی قدرت وہ بیوہ ہو گئی، تو اس کی کوشش کی کہ اس کا کہیں نکاح کر دیا جائے، چنانچہ متعدد مواقع پر اس کی تدبیر و تحریک کی گئی، لیکن کہیں سامان نہ ہوا، نیز میں نے بڑی تدبیروں سے اس کو اپنے سے پردہ کرا دیا، اپنے مکان میں تدبیر لطیف (نرم تدبیر) سے اس کی آمد و رفت، بود و باش اس قدر کم کرا دی کہ قریب قریب منقطع کے کر دی، تاکہ وہ احتمال کلیۃً مدفوع و مسدود (ختم اور بند) ہو جائے، نیز میں اس امر کو خود اپنی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ میرا زمانہ ان باتوں کا نہیں رہا، آزادی کے بعد پابندی سخت امر ہے، اور منکوحۂ اولیٰ کی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ اُن کی سخت دل شکنی و دل آزاری بھی ہو گی، اور اس منکوحۂ ثانیہ کی مصلحت کے

خلاف بھی سمجھتا تھا کہ اس کی عمر کو ضائع کرنا ہے، اسی طرح ایک زمانہ گذر گیا، اس اثناء میں ایک ذاکر صالح کو مکشوف (کشف) ہوا کہ احقر کے گھر حضرت عائشہ رضؓ آنے والی ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا، میرا ذہن مثلاً اس طرف منتقل ہوا، اس مناسبت سے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے نکاح کیا، حضورؐ کا سن شریف پچاس سے زیادہ تھا اور حضرت عائشہ رضؓ بہت کم عمر تھیں، وہی قصہ یہاں ہو، مگر میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، پھر میرے ایک دوست نے ایک بہت بڑے شیخ کامل کو جو اس وقت افادۂ خلائق (مخلوق کو فائدہ پہنچانے) میں مشغول ہیں، خواب میں دیکھا کہ وہ میری آمدنی کی تقسیم کا ایک خاص طریقہ بتلا رہے ہیں، کہ جس طرح گاہ گاہ میرے ذہن میں بطور احتمال خطور کیا کرتا تھا، کہ اگر ایسا امر ہوا تو آمدنی کو اس طرح تقسیم کیا کروں گا، اور میں نے اس کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا تھا، تو خواب میں وہی طریقہ یا اس کے قریب قریب (مدت گزرنے سے اچھی طرح یاد نہیں) وہ بزرگ بتلا رہے ہیں، اُن دوست نے جو عالم ہیں مجھ سے ذکر کیا، میں اس سے بھی وہی واقعہ سمجھا، مگر باوجود ان سب منامات و مکاشفاتِ صلحاء (نیک لوگوں کے خواب اور کشف) کے میں نے اس قصہ کو اپنے دل میں زیادہ جگہ نہیں دی، اور اس کی مدافعت (روک تھام) کی کوشش کی، یہاں تک کہ اس رمضان ۱۳۳۴ھ کے نصف کے بعد پھر میں نے خواب دیکھا کہ خواب اوّل سے زیادہ مؤثر (اثر والے) عنوان سے مجھ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منکوحۂ اُولیٰ سے ڈر لگتا ہے،

اس خواب کے بعد طبیعت میں وہی تقاضا جو مٹا دیا گیا تھا یا دبا دیا گیا تھا پہلے سے بہت زیادہ قوت کے ساتھ پیدا ہوا، اور وہ اپنی قوت سے ایسا غالب آیا کہ میں اس کی مخالفت نہ کر سکا، اور سب مصالح و موانع (مصلحتیں اور رکاوٹیں) مغلوب ہو گئے، یہاں تک کہ میں نے ایک عزیز کو اس پیام لے جانے کے واسطے تجویز کیا، اور ان سے ذکر کیا، انھوں نے ایک بڑے شیخ کا جو کہ ظاہری و باطنی افادہ میں بفضلہ تعالیٰ مشغول ہیں نام لیا، کہ انھوں نے مجھ سے تصریحاً فرمایا تھا کہ ایسا ہو جانا بہتر ہے مگر لحاظ اس کے اظہار سے مانع رہا تھا اس کو ظاہر کر دیا، چونکہ اہل اللہ کے قلب میں بوجہ نورانی ہونے کے اکثر امر صواب وارد ہوتا ہے، اس سے کسی قدر اپنے خوابوں کا اور دوسرے صلحاء کے مکاشفات وغیرہا کا محض اضغاثِ احلام (پراگندہ خواب) نہ ہونا راجح ہونے لگا، آخر اس عزیز کا پیام لے کر روانہ کر دینا طے کر لیا گیا، ہنوز (ابھی) وہ روانہ نہ ہوئے تھے، میں ایک بار خلوت میں بیٹھا تھا دفعۃً (اچانک) خیال آیا کہ ظاہر میں یہ معاملہ بے ربط سا معلوم ہوتا ہے، معلوم نہیں

اس قدر قلب میں اس کا تقاضا کیوں ہے، فوراً ہی قلب میں بیساختہ یہ واقع ہوا کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوطِ جاہ و بدنامی پر جن سے تو اب تک محروم ہے، کیونکہ تیرا جاہ ہر پہلو سے انتہا کو پہونچ گیا ہے پس اس واقعہ میں حکمت یہ ہے کہ تو بدنام ہوگا اور حق تعالیٰ وہ درجات عطا فرمادیں گے، بس یہ تھی وہ مشیتِ خاص جس پر یہ قصہ بھی تھا، اور یہ تھیں وہ خاص مصلحتیں جو اس .... قصہ پر مرتب تھیں،

خلاصہ یہ کہ میری تحریک تو طبیعت کے تقاضے سے تھی، باقی یہ تقاضا خواہ ان واقعات ہی سے ہوا اور پھر اس میں حکمتیں بھی ہوں، غرض وہ پیام منکوحہ کے اور اس کے والدین کے پاس گیا، اس کے والد نے سنتے ہی اپنے خواب اس کے متعلق بیان کرنے شروع کر دیئے، اور بعد نکاح مجھ کو معلوم ہوا کہ پیام سے ایک روز قبل خود اس نے بھی خواب دیکھا تھا، اور وہ پیام باوجود مخالفتِ ... عرف کے نہایت خلوص اور عالی ہمتی سے منظور کرلیا گیا، اتفاق سے منکوحہ کے باپ یہاں آئے تھے، اُن سے درخواست کی گئی کہ مجھ کو رمضان میں سفر سے بچالیا جاوے، انھوں نے بوجہ اس کے کہ اس عزیز پیغام رساں کی معیت میں اختیارِ شرعی حاصل کرلیا تھا نکاح پڑھوادیا، یہ خبر گھر پہونچی تو ہوا جو کچھ ہوا جس کا اثر قلب پر اس درجہ تھا کہ اس وقت مجھ کو موتِ محبوب معلوم ہوتی تھی، اُدھر گھر میں کا صدمہ نہ دیکھا جاتا تھا، اِدھر کچھ علاج نہ تھا، گھر میں کے ساتھ سختی کرنا اس لئے گوارا نہ تھا کہ ضبط سے اندیشۂ امراضِ صعبیہ (دشوار بیماریوں کا) تھا، اور نرمی سے شکایت کا لب و لہجہ حدِ تہذیب سے گذر جاتا تھا، ان اسباب سے بے حد تنگی معلوم ہوئی اس وقت دین کی قدر معلوم ہوئی، کہ:-

دل کو سنبھالنے والی چیز سوائے دین کے کچھ نہیں

بجز دین کے کوئی چیز اس وقت دل کو سنبھالنے والی نہ تھی، اور منجملہ اُن مصالح کے جو اس واقعہ میں مضمر (پوشیدہ) تھیں اور بعد میں ظاہر ہوئیں، دین کے اس اثر کا مشاہدہ تھا جو پہلے سے علم الیقین کے درجہ میں تو تھا مگر اب عین الیقین ہوگیا،

حضرت حکیم الامتؒ کو نکاح ثانی سے موت کی محبوبیت نصیب ہونا

ایک مصلحت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ اس کے قبل موت کی محبوبیت کی دولت مجھ کو نصیب تھی، عقلاً گو محبوب تھی، مگر طبعاً محبوب نہ تھی، بلکہ ایک گونہ (ایک طرح) حیات سے دل چسپی تھی، الحمدللہ کہ اس واقعہ سے یہ دولت بھی نصیب ہوئی، اور گو ابتداءً اس کی دل تنگی کے سبب ہوئی، مگر الحمدللہ کہ پھر باوجود رفع سبب (باوجود وجہ ختم ہوجانے کے) بھی وہ مسبّب باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھے،

نکاح ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کو آخرت کی رغبت بڑھ جانا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو ثوابِ آخرت سے طبعاً رغبت کم تھی، امتثال اور رضاءِ الٰہیہ کو جنت سے بھی افضل سمجھتا تھا، مگر اس کے مزہ میں

ثواب کا تصور کم ہوتا تھا، صرف رضائے حق و طلبِ نجات مرکزِ خیال تھا، اور اب معلوم ہوا کہ یہ ایک قسم کی کمی تو صورتِ استغناء تھی، الحمدللہ کہ اس کوتاہی کا بھی تدارک ہو گیا، اور تنگی کے پیش آنے کے وقت صرف احکام کے ضروری ہونے کے خیال نے طبیعت میں قوت نہ بخشی، استحضارِ ثواب نے پورا کام دیا، … والحمدللہ علیٰ ہذہ النعمۃ،

نکاحِ ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کا صبر اور رضا بالقضاء و تفویض الی اللہ کی حقیقت کا مشاہدہ کرنا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو اس وقت تک صبر اور رضا بالقضاء و تفویض الی اللہ (صبر اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور اپنے آپ کو حق شانہٗ کے سپرد کرنے) کی حقیقت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا، الحمدللہ کہ ان محبوبوں کا جمال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا،

نکاحِ ثانی سے حلم و تحمل کی دولت نصیب ہونا!!!

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ حلم و تحمل کا مجھکو ذوق نہ تھا، خدا تعالیٰ کا احسان ہے یہ کام بھی مجھ سے بوجہِ احسن (اچھے طریقہ سے) لیا گیا جس سے آئندہ بھی کام لے سکنے کی امید توکلاً علی اللہ رکھتا ہوں،

نکاحِ ثانی سے رسمِ جاہلیت کا ابطال ہونا

ایک مصلحت یہ بھی ہوئی کہ رسمِ جاہلیت کا ابطال ہو گیا،

نکاحِ ثانی سے تعددِ ازواج کی حکمتوں کا انکشاف

اسی ضمن میں خود تعددِ ازواج کی بعض حکمتیں بھی ظاہر ہوئیں، مثلاً صفتِ عدل کا استعمال بطرزِ عجیب، تفصیل اس کی یہ ہے کہ آدمی کسی پر حاکم ہی نہ ہو یا حکومت سے استعفاء دیدے، اس کو اس صفت کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، دوسرے یہ کہ حاکم ایسے لوگوں پر ہو جن کے ساتھ استعمالِ عدل میں سیاست و ضابطہ کا برتاؤ کر سکے، یہ بھی آسان ہے، اس لئے کہ اس شخص کو صرف ایک حکومت کا حق ادا کرنا پڑتا ہے جس میں کوئی امر مزاحم (روکنے والا) نہیں،

دو بیویوں کے مابین عدل کرنا سلطنت میں عدل کرنے سے مشکل ہے،

بخلاف صاحب ازواج متعددہ کے، کہ اس کے ماتحت ایسے ذو محکوم ہیں جو اس کے محبوب بھی ہیں، اور اس محبوبیت کے سبب ایک درجہ میں معنیً اس پر حاکم بھی ہیں، پھر محکوم بھی کیسے جن میں انصاف و عدل کرنا صرف اسی حالت کے ساتھ خاص نہیں جبکہ ان دونوں میں جھگڑا واقع ہو بلکہ اگر وہ خود بھی نہ جھگڑیں تب بھی اس حاکم پر ہر وقت کے برتاؤ میں ان میں برابری رکھنا واجب ہے، پھر جب جھگڑا پڑے اس وقت یہ کشاکشی ہوگی کہ اُن کی محکومیت کے حق ادا کرتا ہے تو محبوبیت کے حقوق فوت ہوتے ہیں،

ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین الاضداد مخالف چیزوں کے جمع ہونے سے) کم نہیں، اور نہایت ہی عقل اور دین کی اس میں ضرورت ہے، کوئی کر کے دیکھے تو معلوم ہو، اور اگر حکومت سے سبکدوش (علیحدہ ہونا چاہئے تو وہ اس لئے مشکل ہے کہ حقیقت اس کی زوجیت کو قطع کرنا ہے، سو اوّل تو زوجیت کا یہ فطرۃً بھی محتاج، دوسرے محجوبیت سے استعفیٰ، تیسرے شریعت اس کو مبغوض ٹھہرا رہی ہے، پھر اس اجلاس کا کوئی وقت نہیں، ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہنا چاہئے، پھر استغاثہ (دعویٰ کرنے) کا انتظار نہیں، ورنہ خود دست اندازی لازم، تو جو شخص اس نازک موقع پر عدل کو استعمال میں لے آیا وہ اعلیٰ درجہ کا عادل ہوگا، اور دوسری جگہ اس صفت سے کام لینا اس کو بالکل پانی ہو جائے گا، اور مثلاً اس کی قدر بڑھ جانا کہ جس طرف جاتا ہے اس طمع میں کہ مجھ سے اس کو زیادہ التفات ہو، اسکی بہت قدر کی جاتی ہے، خاص طور سے خدمت کی جاتی ہے بشرطیکہ دونوں زوجہ (بیویوں) میں زی شیطنت نہ ہو، ورنہ مجاہدۂ عظیمہ (بہت بڑا مجاہدہ) ہے، کہ یہ بھی ایک مصلحتِ عظیمہ ہے تعدد کی، مثلاً صحت کا اچھا ہونا، کیونکہ ہر یوم میں ایک جدید چیز اس کو میسر ہے، اور جدت کے لئے نشاط اور نشاط کے لئے درستیِ صحت عادۃً لازم ہے،

تعددِ ازواج کی ایک مصلحت زیادتِ تعفیف ہے

اور ایک مصلحت تعدد میں زیادتِ تعفیف (پاکدامنی) ہے، اور بھی مصالح متعددہ (بہت ساری مصلحتیں) اس تعدد میں ظاہر ہوئیں، مگر یہ مصالح ان خطرات وخلجانات (وساوس وشبہات) مذکورہ سابقہ کے ساتھ ایسے ہیں جیسے جنت کے رستہ میں پُل صراط کہ بال سے باریک تلوار سے تیز، جس کو طے کرنا سہل کام نہیں، اِلَّا مَنْ یَّسَّرَ اللّٰہُ تعالیٰ، اور جو طے نہ کر سکا وہ سیدھا جہنم میں پہنچا، اس لئے ایسے پُل پر خود چڑھنے کا ارادہ نہ کرے بقول سعدیؒ ؎

بدریا در منافع بے شمار است ؎ دگر خواہی سلامت بر کنار است

(دریا کے منافع بے شمار ہیں، مگر سلامتی اسی میں ہے کہ کنارے پر ہی رہو!!!)

ان خطرات ومہالک کو عبور کرنے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ ارزاں نہیں ہیں، دین کامل، عقل کامل، نور باطن، ریاضت سے نفس کی اصلاح کر چکنا ومثل ذلک، چونکہ یہ مجموعہ شاذ ہے، اس لئے تعددِ ازواج میں پڑنا یا اپنی دنیا برباد وتلخ کرنا ہے، اور یا آخرت ودین کو تباہ کرنا ہے

ہرگز بگندم گوں لا تقربا کہ زہر است ؎ حالِ پدر بہ یاد از اُمّ الکتاب دارم

(حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ملا تھا کہ گندم کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ زہر ہے، میں اپنے باپ (حضرت آدم علیہ السلام) کا حال لوح محفوظ سے یاد رکھتا ہوں!!)

سقوطِ جاہ اور بدنامی میں بہت سے درجات موقوف ہیں ،

خلاصہ یہ کہ کچھ مصلحتیں خاص اس نکاح میں ظاہر ہوئیں، جو پہلے سے قلب میں واقع ہوئی تھیں، جن کو مختصراً میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوطِ جاہ پر الیٰ قولہ توکلاً علی اللہ رکھتا ہوں، اور کچھ مصلحتیں مطلق تعددِ ازواج میں ظاہر ہوئیں، ان مصالح میں سے مصلحت سقوطِ جاہ کی بہت مجمل مذکور ہوئی، اب اس کی کسی قدر تفصیل کرتا ہوں، کیونکہ اعظم مصالح اس واقعہ میں یہی ہے،

سو بیان اس کا یہ ہے کہ واقعی بدنامی اور ملامت واقعہ میں اس قدر ہوئی کہ شاید تمام عمر بھی اگر میں خدانخواستہ واقعی عیب کرتا تب بھی اس قدر نہ ہوتی، اس واقعہ کے تین مواقع تھے، ہر موقع پر میری قسمت میں یہ دولت لکھی تھی، چنانچہ اوّل موقع نکاح کا تھا، اس میں جو کچھ ہوا اس کا مختصر بیان بضمن اقوالِ جہلاء کے اوپر کرچکا ہوں، دوسرا موقع یہ ہوا کہ جب گھر کے لوگوں پر زیادہ صدمہ دیکھا اور اندیشہ ہوا کہیں زیادہ نوبت نہ پہونچے، ادھر اپنے قلب کو تحمل سے عاجز پایا، آخر تنگ آکر ایک مختصر مجمعِ احبابِ عقلاء سے مشورہ کرکے اس جدیدہ کو قطعِ تعلق بواحدۃ صریحہ (ایک طلاق صریح ذکر قطع تعلق کرنے) کا مضمون اسی عزیز کے ہاتھ جو نکاح کا پیام لے کر گئے تھے لکھ بھیجا، اس فعل سے گھر میں مجھ کو روکا بھی، مگر میں نے یہ سمجھا کہ بدون اس کے اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں،

اُدھر میں مردوں سے مشورہ کرچکا تھا، عورت کی رائے کو میں نے ناقص سمجھ کر بھی عمل نہ کیا،

اس تحریر و پیام کا جو اثر دوسری طرف ہوا، اس کو سُن کر دوسرا صدمہ پہنچا، مگر بجز برداشت کرنے کے اس کا کوئی علاج میرے ہاتھ میں نہ تھا، اب یہ دوسرا موقع ہوا بدنامی و ملامت کا۔ کسی نے کہا خواہ مخواہ دل شکنی کی، کسی نے کہا بیوی سے اتنا دبنا نہ چاہئے، کسی نے کہا یہ جائز کہاں تھا، اوّل موقع پر عوام نے زیادہ بدنام کیا تھا، اس دوسرے موقع پر اہلِ فہم (سمجھدار لوگوں) نے زیادہ بدنام کیا،

اب تیسرا موقع سب سے زیادہ عجیب ہوا کہ جب وہ عزیز پیام پہنچا کر واپس آگئے، تو اب منکوحۂ اُولیٰ کو یہ خیال غالب ہوا کہ افسوس میرے سبب انھوں نے اپنے ایک رغبت کے معاملہ کو قطع کیا اب ان کو عمر بھر قلق و رنج رہے گا، اور مجھ کو سخت شرمندگی رہے گی، اور لوگ بھی یہ سمجھیں گے کہ اس کے سبب ایسا ہوا، غرض ان خیالات نے اس قدر غلبہ کیا کہ اصل واقعہ سے زیادہ صدمہ کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور ارادہ کیا کہ اب میں خود جاکر پھر نکاح کی تجدید (نئے سرے سے نکاح کرنے) میں کوشش کردں، میں نے انجام سوچ کر ہرچند منع کیا، اپنے ایک مخلص دوست صالح عالم سے

بطور وعظ کے فہمائش بھی کرائی، مگر اُن کا یہ خیال قوی ہوتا گیا حتیٰ کہ خود وہاں جاکر سب کو راضی رضا کر کے مجھ کو یہاں سے بلاکر تجدید کرادی، اس تجدید میں قوی قوی رکاوٹیں پیش آئیں، کہ جن میں بعض کا مجھ پر بار ڈالنے کی تجویز بھی تھا جس کو میں برداشت کرنا پسند نہ کرتا تھا، اور بدون اس کے ظاہرًا تجدید دشوار تھی، اس وقت بیساختہ میرے قلب میں آیا کہ اب تک تو منامات ومکاشفات (خوابوں اور کشفوں) سے احباب استدلال (دلیل دیا) کرتے تھے، کہ یہ من الغیب (غیب سے) ہے، مگر میرے قلب میں ان چیزوں کا زیادہ اثر نہ تھا اب میں اس کے من الغیب ہونے نہ ہونے پر اسی سے استدلال کرتا ہوں، کہ میں کسی شرط زائد کو قبول نہ کروں گا، اگر پھر بھی اس کا وقوع ہوگیا تو میں من الغیب سمجھوں گا، ورنہ اس بارسے بچا رہوں گا، چنانچہ باوجود اس کے حق تعالیٰ نے سب کے قلوب کو دفعۃً (اچانک) بدل دیا کہ سب شرطیں محذوف (ختم) ہوگئیں، اور تجدید ہوگئی، مزاحمات کا اس طرح بلا کوشش دفع ہوجانا میرے نزدیک ایک باوقعت دلیل ہے، اور اس سے بڑھ کر دلیل خود مزاحم کا کوشش کرنا یعنی منکوحۂ اولیٰ کا اس طرح سعی کرنا ہے، اب اس سے ان منامات ومکاشفات کا صدق راجح ہوتا ہے،

یہ تیسرا موقع تھا اس میں بھی بے حد ملامت کی گئی، کسی نے کہا طلاق کے بعد بلا حلالہ تجدید کہاں جائز ہے، کسی نے کہا واحد صریحہ (ایک صریح طلاق) میں تجدید کی کون حاجت تھی، کسی نے کہا بس مسئلے مولویوں کے قبضہ میں ہیں، جس چیز کو دل چاہا اس کو درست کرلیا، کبھی نکاح کو کبھی طلاق کو وغیر ذلک من الجہالات،

غرض تینوں موقعوں پر مختلف عنوانات سے اطراف ونواح میں آگ لگنے کا سا غل تھا کہ جس کو دیکھیے یہی قصہ یہی چرچا، دُکانوں پر یہی تذکرہ، نشستگاہوں (بیٹھکوں) میں یہی مشغلہ، کوئی میرے احباب کو چھیڑتا ہے، کوئی احباب ہونے کے دعوے کے بعد شبہات واعتراض کرکے اپنے دوست ہونے کا ثبوت دیتا ہے،

نکاحِ ثانی میں حضرت حکیم الامت کی بفضلِ تعالیٰ اضطرارًا موافقت سنت کی بہت سی باتیں ہوئیں،

ان کے مقابل اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت اہل فہم کی بھی قائم کردی، جو ان سب واقعات کو سنت کے موافق سمجھ رہے تھے اور ان کی محبت زیادہ بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ سب سے پہلا واقعہ خواب کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ ہوئی، کہ اس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صورت ایک حریر کے ٹکڑے پر دکھلائی گئی، کہ یہ آپ کی زوجہ ہیں دوسرا واقعہ بھانجے کی بیوی سے نکاح کرنے کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ تھی کہ اسی طرح

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جو آپ کے متبنیٰ (منہ لے بیٹے) کی بیوی تھیں اُن کے طلاق دینے کے بعد نکاح فرمایا، تیسرا واقعہ وہ تھا جو جہلاء کے اقوال میں یہ قول نقل کیا گیا کہ اجی معلوم ہوتا ہے ان میں پہلے سے ساز باز ہوگا، اسی طرح نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا گیا تو بہ توبہ حضرت زینبؓ پر عاشق ہوگئے تھے، استغفراللہ،

چوتھا واقعہ تفاوتِ عمر میں نکاح تھا، اس میں موافقت سنت کی یہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اور حضرت عائشہ رضؓ کی عمر میں اس سے زیادہ تفاوت تھا، پانچواں واقعہ منکوحہ اُولیٰ کی دل جوئی کیلئے ثانیہ کو جواب دیدینے کا تھا، اس میں سنت کی دو موافقتیں ہوئیں، ایکؔ وجہ اس آیت میں مذکور ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ

(التحریم، آیت ۱)

"یعنی اے نبیؐ! جس چیز کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے آپ (قسم کھاکر) اس کو اپنے اوپر کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے"!

دوسری وہ جو اس آیت کا شانِ نزول ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ (الطلاق، آیت ۱)

"یعنی اے پیغمبرؐ (آپ لوگوں سے کہدیجئے کہ) جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو"!

یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو آپؐ نے ایک طلاق دیدی تھی، پھر بحکم الٰہی آپؐ نے رجعت فرمائی، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وابن المنذر،

چھٹا واقعہ تجدیدِ نکاح کا تھا، اس میں سنت کی موافقت ابھی مذکور ہوئی، کہ حضرت حفصہؓ سے بعد طلاق کے رجعت فرمائی تھی،

ساتواں واقعہ مہر کے خفیف (کم) ہونے کا تھا، اس میں موافقتِ سنت قولاً وعملاً ظاہر ہے غرض اہلِ فہم کو خدا تعالیٰ نے اس طرح سمجھادیا، میں یہ جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے یہ سب کام اتباعِ سنت کی نیت سے کئے ہیں، بلکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ اضطراراً سنت کی موافقت ہو جاوے، جس سے زیادہ برکت کی امید ہوتی ہے، چنانچہ امید برکت کی مزید تائید دو واقعوں سے اور ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس واقعہ کی خبر سُن کر ایک شیخ کامل نے جن کا میں نے اوپر اس عنوان سے

ذکر کیا ہے کہ اس وقت افادۂ خلائق میں مشغول ہیں، مجھ کو خط لکھا اس میں یہ تھا کہ حق تعالیٰ اس عقد کو موجب ترقی درجاتِ سامیہ (بلند درجات کی ترقی کا سبب) فرمائے،

دوسرا یہ کہ ایک دوسرے شیخ کامل نے جن کا میں نے اوپر اس عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ظاہری و باطنی افادہ میں بفضلہٖ تعالیٰ مشغول ہیں میری اس درخواست کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اس میں برکت فرمادیں، یہ فرمایا کہ ہم کو تو برکات کی توقع ہے،

بس یہ خلاصہ ہے مضمونِ مشیت اور مصلحتوں کا جس کا بنا پر کار معلوم ہونا آنعزیز نے لکھا کر

حضرت حکیم الامتؒ نے نکاح ثانی اولاد ہونے کے خیال سے نہیں کیا،

اسی سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی نکل آیا، کہ اس زمانہ میں جب تمام اعزاء کی تمنا تھی کہ اولاد ہو اور اس کے سبب زور دیا کہ نکاحِ ثانی ہو جائے، تو آپ نے نہ مانا، جب اس کی عمر تھی، اور طبعاً اولاد کی خواہش ہوگی، لیکن وہ زمانہ گذر گیا، تو اب کیا وقت تھا، تقریر جواب کی ظاہر ہے کہ اس وقت بھی میں نے اولاد کے خیال سے نہیں کیا، اور نہ اقتضائے عمر (عمر کے تقاضا) سے کیا، اسباب مذکورۂ بالا سے طبیعت میں ایک قوی تقاضا پیدا ہوا جس میں بلا قصد (بغیر ارادہ کے) بہت سے دقیق مصالح بھی پیدا ہو گئے، اور عجب نہیں کوئی اولاد بھی ہو جائے، چنانچہ میں نے اس تقاضہ کے قلب میں آنے کے وقت دعائے استخارہ کے ساتھ دینی کتابوں سے تفاؤل (نیک فال کا حصول) بھی کیا، گو میں تفاؤل کو مؤثر نہیں سمجھتا، اور نہ ایسا سمجھنا جائز ہے، مگر محض تقویتِ رجاء (تقویت امید) کے لئے تفاؤل چند بار کیا، اس آیت کا مضمون ہر بار میں نکلا:-

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ (الانبیاء، آیت ۸۹)

"اے میرے رب مجھ کو لاوارث مت رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیدیجئے کہ میرا وارث ہو) اور سب وارثوں سے بہتر آپ ہی ہیں"

واللہ اعلم، اتفاقی بات ہے، یا اشارہ ہو عطاءِ اولاد کی طرف، چنانچہ اس کے بعد کی تحریر میں آنعزیز کو اس بات کا احساس ہو گیا چنانچہ لکھا ہے، لیکن ان شرعی مصلحتوں اور حکم خداوندی کی باریکیوں کو دنیاوی امور پر ترجیح دینا بڑا کام ہے جو دنیاداروں سے اور خاص کر مستورات سے ممکن نہیں، چنانچہ اس میں احسانِ جواب کے ساتھ دنیاداروں اور مستورات کی ایک درجہ میں معذوری بھی بیان کی ہے، اس کی نسبت یہ ہے کہ درجۂ حال میں ترجیح دینے کا کسی کو مکلف بھی نہیں بنایا، یہ تو ایک موہبتِ الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی عطاء) ہے جس کو عطا ہو،

حدودِ شرعیہ میں قولاً و فعلاً تجاوز نہ کرنے کا سبب کو حکم ہے،

لیکن اس قدر کاسب کو مکلف بنایا ہے کہ حدودِ شرعیہ سے قولاً و فعلاً تجاوز نہ کریں، اور تجربہ سے ثابت ہے کہ اس تحفظِ حدود میں حق تعالیٰ نے یہ اثر دیا ہے کہ حزن و تشویشِ طبعی (طبعی فکر و غم) بھی اس قدر ضعیف ہوجاتا ہے کہ بالکل کالعدم ورنہ وہ کمبخت برابر ہی تازہ ہوتا چلا جاتا ہے، جہلاء اس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور تجاوز عن الحدود (شرعی حد سے بڑھنے) کو اپنے مرض کا علاج سمجھتے ہیں، جو ان اشعار کا مصداق ہوتا ہے ؎

هرچہ کردند از علاج و از دوا ⁂ رنج افزوں گشت و حاجت نارَوا
بے خبر بودند از حالِ درون ⁂ استعیذ اللہ مما یفترون
گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ⁂ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(یعنی ہر قسم کی دوا اور علاج کیا مگر ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، وہ باطنی حال سے غافل ہیں، اللہ کی پناہ جو وہ جھوٹ بولتے ہیں، کہا کہ انھوں نے ہر قسم کی دوا دارو کی ہے مگر اس بیماری کو ختم نہیں کیا، (گویا طبیبوں کے نزدیک یہ مرض لاعلاج نہیں ہے)۔"

حضرت حکیم الامتؒ کا نکاح ثانی سے اہلیہ کو مطلع نہ کرنے کا سبب

آگے آنعزیز نے لکھا ہے تاہم جس قدر حالات (نام عزیزے) کی تحریر سے معلوم ہوتے، "میری ناقص رائے میں اتنی کسر (کمی) رہ گئی کہ ان امور کو اول اگر بھابی صاحبہ کے سامنے پیش کر دیا جاتا تو شاید اُن کو اتنا خیال نہ ہوتا، اب جو ہونے والا تھا ہوگیا۔" آس کا اگر یہ مطلب ہو کہ ان واقعات کی جو کہ بنا بکار ہیں اُن کو خبر دی جاتی، سو یہ تو میں چند موقعوں پر کرتا رہا جس کا اُن پر ہمیشہ گہرا اثر ہوا، کیا میں نے ان سے اپنا پہلا خواب کہہ دیا تھا، ایک بزرگ کا مکاشفہ متعلق مضمون حضرت عائشہ رضؓ وہ بھی کہہ دیا تھا، باوجودیکہ انھوں نے تعبیر میں میرے ساتھ اختلاف کیا، مگر پھر بھی اُن پر کئی کئی ماہ تک اثر رہا جس کو دیکھ کر میں نے سچی بات دل کی کہہ دی کہ میرا اس وقت تو بالکل آئندہ کیلئے بھی ارادہ نہیں، یہانتک کہ میں نے کہا لاؤ میں عمر بھر کے لئے ایسی قسم کھالوں کہ نکاح ہی نہ ہوسکے۔ لیکن مجھ کو تقدیر کی خبر نہیں نہ یہ میرے قبضہ میں ہے، کہ حق تعالیٰ نے اگر دل کو بدلنا ہے تو بدلنے نہ دوں، انھوں نے ایسی قسم کھانے سے اسی بنا پر ہمیشہ منع کیا، کہ خدا جانے تقدیر میں کیا لکھا ہے، بہرحال اُن کو یہ احتمال ہمیشہ ستاتا رہا، اور میں اپنے ارادہ کے موافق اطمینان دلاتا رہا اور واقعی میرا ارادہ کوسوں بھی نہ تھا، اور اگر یہ مطلب ہو کہ ارادہ ہونیکے بعد ان کو ارادہ کی اطلاع نہ کی، اور بہت سے اہل الرائے بھی

یہ کہتے ہیں، سو اس میں میرا یہ خیال ہوا، اب خواہ وہ غلط ہو یا صحیح کہ یہ قیامت تک موافقت کریں گی اور صریح مخالفت (کھلی مخالفت) کے بعد پھر مجھ کو مناسب نہ ہوگا، کہ اسمیں زیادہ دل شکنی ہے، اور اگر بلا اطلاع کر لیا تو آخر مجبور ہو کر ساکت و ساکن (خاموش) ہو جائیں گی، بس اس خیال سے میں نے اپنے ارادہ کی اطلاع نہیں کی، اور بعد کے واقعہ تجدید سے تو یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ اطلاع تو کیا معنیٰ اگر مشورہ و اجازت بھی حاصل کر لیتا تب بھی کچھ نفع نہ ہوتا، چنانچہ خود سعی کرنا تو مجھ کو اجازت دینے سے بڑھ کر اس رضاء و سکون میں مؤثر ہے، مگر کوئی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا، اب تو آنعزیز کا یہی جملہ تسلی بخش ہو سکتا ہے کہ جو ہونے والا تھا ہو گیا، اس کے ساتھ اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ دعاء و التجا آخیر علاج ہے اور اکسیر علاج ہے،

تجدیدِ قلبیہ کے بعد پریشانی اور رنج و غم کہاں؟	آنعزیز نے اپنی محبت سے لکھا ہے "لیکن مجھ کو اس کا صدمہ ہوتا ہے کہ جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ کے عیش و آرام میں فرق پڑ گیا۔"

یہ آنعزیز کی محبت کا مقتضا ہے اور ہونا بھی چاہیے، اور حقیقی بھائی کے ساتھ تو کیوں نہ ہوتا، ہر نوعی بھائی کے ساتھ ہونا چاہیے ؎

چو از محنتِ دیگراں بے غمی ٭ نشاید کہ نامت نہند آدمی

"یعنی اگر دوسروں کے رنج و غم سے تم بے خبر ہو تو مناسب نہیں کہ تمھارا نام آدمی رکھیں"

مگر میں آنعزیز کو بے فکر اور مطمئن کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس عیش سے زیادہ مجھ کو عیش عطا فرمائی، یعنی وہ عیش دنیا کا تھا اور واقع میں مجھ کو اس سے ایک گونہ دلچسپی ہو گئی تھی، اور کبھی کبھی سوچ کر ڈرتا تھا کہ خدا نہ کرے اس آیت کا مضمون تو مجھ پر صادق نہیں آنے لگا:۔

رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (یونس آیت ۷)

"(اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہوگئے (اور آخرت کی فکر اصلا نہیں کرتے) اور اسی میں جی لگا بیٹھے، (آئندہ کی کچھ فکر نہیں))"

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان واقعات نے اس حدیث کے معنی سمجھا دیئے،

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَة

"(اے اللہ آخرت کے عیش کے سوا کوئی عیش نہیں)"

اوّل اوّل ذرا جی گھبرایا مگر حق تعالیٰ نے دکھلا دیا ؎

درد از یار ست و درماں نیز ہم ٭ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم[1]

---

[1] "درد دوست کی طرف سے ہے اور اس کا علاج بھی انہی کے پاس ہے، دل و جان اس پر قربان ہو"

اور اس آیت کے معنی دکھلا دیئے؛

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ

(التغابن آیت ۱۱) "کوئی مصیبت بدونِ حکمِ خدا کے نہیں آتی، اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے"۔

بس یَھْدِ قَلْبَہٗ کے بعد پریشانی کہاں، کہاں رنج و غم، باقی طبعی اثر خفیف (ہلکا) سا کسی وقت ہو وہ پریشانی نہیں، دوسرے اس سے کوئی خالی نہیں، تیسرے وہ خود علاج ہے بہت سے امراض کا جن میں نفوسِ عامّہ مبتلا ہیں، اس حیثیت سے وہ سب رحمت ہیں، اس لئے میں الحمد للہ پہلے سے زیادہ عیش میں ہوں اور بفضلہٖ تعالیٰ اب تو ظاہراً بھی سکوت و سکون بڑھتے رہنے سے پہلے رنگ کا عیش بھی مع شئے زائد کے عود (واپسی) کرتا آتا ہے،

خط کے جواب میں مکمل رسالہ لکھنے کا سبب

آگے آنعزیز کے خط کے خاتمہ کا جملہ ہے؛ "اس لئے اپنے اطمینانِ خاطر کے لئے میں التجا کرتا ہوں کہ اپنے قلم سے اس کے مفصّل حالات تحریر فرمائیں، زیادہ نیاز مند، فقط"۔ میری بدنی حالت اس وقت بوجہ نقاہت (کمزوری) کے اتنی تفصیل کی متحمل (برداشت کرنے والی) نہ تھی، نیز واقعات کے ساتھ علوم کا منضم (شامل) کرنا شاید بجائے تفصیل کے تطویل (طویل) ہونا معلوم ہو، مگر آنعزیز کے تعلق طبیعت و اثر محبت نے قلب میں ایک جوش پیدا کر دیا جس سے جو بیساختہ قلم میں آتا گیا، پھر اس مجموعی مضمون کی نافعیت (فائدہ مند ہونے) پر نظر کر کے کہ اس کو ایک رسالہ قرار دے کر اس کا ایک بادلالت نام بھی رکھ دوں، چنانچہ یہ نام خیال میں آیا؛ "الخطوبُ المذیبہ للقلوبِ المنیبہ" یعنی وہ واقعات جو خدا کی طرف رجوع ہونے والے قلب کو گداختہ اور نرم کر دیں،

تعددِ ازواج سے بچنے ہی میں سلامتی ہے

اب میں اپنے اس خط کو ایک مناسب مقام و مفید دستور العمل پر ختم کرتا ہوں، جس کے تین جزو ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو میں اصل خط میں مشورہ دے چکا ہوں کہ تعددِ ازواج ایک پُرخطر مسلک ہے، جس طرح قضاء یعنی حکومت کے قبول کرنے میں حدیث میں نہایت تہدید (دھمکی) ہے، یہ بھی اس سے کم نہیں، بلکہ میں نے جو ادبہ مصلحت حصولِ صفتِ عدل کے متعلق بیان کی ہے، اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ بعض وجوہ سے یہ قضاء بھی اشد ہے، جب اس سے تحذیر (ڈرنے کا حکم) وارد ہے تو اس کی جرأت کب زیبا ہے اور مکرر کہتا ہوں کہ میرے اختیار کرنے سے دھوکہ نہ کھایا جائے اس اختیار کرنے سے تو پورا پتہ چلا ہے

ع　من نکردم شما حذر بکنید

لیکن جو شخص اس مشورہ سے قبل اس زنجیر میں بندھ چکا ہو اس کے لئے ضرورت ہے کہ اس کے پورے حقوق ادا کرے، اس طرح ان متعدد بیبیوں پر بھی واجب ہے کہ نفس کا اتباع چھوڑ کر شریعت کو اپنا رہبر بنائیں، احکام شرعیہ کی تفصیل تو علماء کی مراجعت سے معلوم کرنا چاہئے، اس مقام پر میں مشورہ کے درجہ میں ایک دستور العمل جو بعد تفصیل کے تین دستور العمل ہیں تینوں شخصوں کے لئے لکھتا ہوں :۔

پہلا دستور العمل شوہر کے لئے

(۱) ایک بی بی کا راز دوسری سے نہ کہے، (۲) دونوں کا کھانا اور دونوں کا رہنا الگ الگ رکھے، ان کا اجتماع آگ اور بارود کے اجتماع سے کم نہیں (۳) ایک سے دوسری کی شکایت ہرگز نہ سنے (۴) ایک کی تعریف دوسری سے نہ کرے (۵) غرض ایک کا تذکرہ نہ دوسری سے کرے نہ دوسری سے سنے، اگر ایک شروع بھی کرے فوراً روک دے کہ اور کچھ بات کرو (۶) اگر ایک دوسری کی کوئی بات پوچھے ہرگز نہ بتلائے، مگر خشونت (سختی) نہ کرے، لطف سے منع کر دے (۷) دینے لینے میں یہ شبہ نہ ہونے دے کہ ایک کو زیادہ دیدیا ہو، اس کو صاف صاف ظاہر کر دے (۸) باہر سے آنے والی عورتوں کو سختی سے روکے کہ وہ دوسری جگہ کی حکایات یا شکایات بیان نہ کریں (۹) اور نہ خوشامد میں ایک ساتھ کم محبتی کا دعویٰ دوسری کے سامنے کرے (۱۰) اگر موقع ہو ایک سے ایسی روایت کر دے کہ دوسری تمھاری تعریف کرتی تھی (۱۱) لطف سے اس کی تدبیر ہو سکے تو مفید ہے کہ ایک دوسری کے پاس ہدیہ وغیرہ بھی بھیجا کریں،

دوسرا دستور العمل منکوحۂ قدیمہ کے لئے

(۱) جدیدہ پر حسد نہ کرے (۲) اس پر طعن و تشنیع نہ کرے (۳) بہ تکلف جدیدہ کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرے، تاکہ اگر اس کے دل میں محبت نہ ہو تو عداوت بھی نہ ہو، (۴) شوہر سے کوئی ایسی بے تکلف گفتگو نہ کرے کہ شوہر کو اس جدیدہ کے سامنے اس کا ہونا اس لئے ناگوار ہو کہ اس کو یہ احتمال ہو کہ یہ جدیدہ بھی ایسی بے تمیزی نہ سیکھے، (۵) شوہر سے جدیدہ وغیرہ کا کوئی عیب بیان نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے محبوب کی عیب گوئی خصوص رقیب کی زبان سے پسند نہیں کرتا، (۶) جدیدہ سے ایسا برتاؤ رکھے کہ اس کی زبان اس قدیمہ کے سامنے ہمیشہ بند رہے (۷) شوہر کی اطاعت و خدمت و ادب میں اور بیشی (اضافہ) کر دے تاکہ اس کے دل سے نہ اُتر جائے (۸) اگر شوہر سے ادائے حقوق میں کچھ کمی بھی ہو جائے تو جو کمی حدِ تکلیف تک نہ پہونچے اس کو زبان پر نہ لائے، اور اگر حدِ تکلیف تک ہو تو جس وقت مزاج خوش پائے ادب سے عرض کر دے،

(۹) جدیدہ کے اعزہ (رشتہ داروں) سے خوش اخلاقی و مدارات (حُسن سلوک) کا برتاؤ رکھے کہ جدیدہ کے دل میں گھر ہو (۱۰) گاہ گاہ (کبھی کبھار) اپنا دن جدیدہ کو دیدیا کرے، تاکہ شوہر کے دل میں قدر بڑھے،

تیسرا دستور العمل منکوحہ جدیدہ کے لئے

(۱) قدیمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے اپنے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں، (۲) شوہر پر زیادہ ناز نہ کرے اس گمان سے کہ میں زیادہ محبوب ہوں خوب سمجھ لے کہ قدیمہ سے جو تعلقات رفاقت ہیں جو کہ دل میں جاگزیں ہو چکے ہیں، یہ نفسانی نیا جوش اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا (۳) شوہر سے خود جدا رہنے کی درخواست نہ کرے (۴) اگر شوہر جدا رکھنے لگے تب بھی گاہ گاہ قدیمہ سے ملنے جایا کرے، قدیمہ کو دعوت وغیرہ کے لئے بلا لیا کرے (۵) شوہر کو سمجھاتی رہے کہ قدیمہ سے بے پروائی نہ کرے (۶) اگر قدیمہ کچھ سختی یا طعن وغیرہ کرے تو اس کو ایک درجہ میں معذور سمجھ کر معاف کردے، اور شوہر سے تو ہرگز شکایت نہ کرے (۷) قدیمہ کے عزیزوں کی خوب خدمت کرے (۸) قدیمہ کی اولاد سے بالخصوص ایسا معاملہ رکھے کہ قدیمہ کے دل میں اس کی محبت و قدر ہو جائے (۹) ضروری امور میں قدیمہ سے مشورہ کرتی رہے کہ اس کے دل میں قدر بھی ہو اور اس کو تجربہ بھی زیادہ ہے (۱۰) اگر اپنے میکے میں جائے قدیمہ سے خط و کتابت بھی رکھے،

اشعار:-

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

ترجمہ:- "ہم نے اپنی جگہ نصیحت کردی اور اسی طرح اپنی زندگی بسر کردی اگر کسی کو اس میں رغبت نہ ہو (تو مضائقہ نہیں) کیونکہ قاصدوں کے ذمہ صرف پہنچانا ہے اور بس"

وَالسَّلَامُ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالدُّعَاءُ مَنْ وَّقَى الْهَوٰى وَاَنَا الْحَقِيْرُ

بنام عجیب

۲۶، ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ

دوسرا ضمیمہ ختم ہوا

تیسرا ضمیمہ
فہرست تحلیل بعض محرمات

اس سے پہلے کے دو ضمیمے تحریم بعض محللات کے تھے، یہ تیسرا ضمیمہ اس کے مقابل کی فہرست یعنی تحلیل بعض محرمات (بعض شرعاً حرام برائے نکاح کو حلال سمجھنے) کا ہے، منجملہ ان کے ایک یہ صورت ہے کہ بعض لوگ رضاعی بھائی بہن خاص انہی کو سمجھتے ہیں جو ایک زمانہ میں ایک عورت کا دودھ پئیں، اور مختلف زمانوں میں دودھ پینے والے بچوں کو ایک دوسرے کے لئے حلال سمجھتے ہیں،

سو یہ اعتقاد بالکل باطل ہے، اس حرمت کے لئے زمانے کا اتحاد واختلاف سب برابر ہے، منجملہ اُن کے ایک یہ صورت ہے کہ اکثر لوگ لاوارث لڑکیوں کو جن کا کوئی ولی شرعی نہیں ہے، پرورش کرکے ان کے بلوغ کے قبل اپنی ولایت سے ان کا نکاح کر دیتے ہیں، سو یہ نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا،

تیسرا ضمیمہ ختم ہوا

بعض جزئیاتِ انقلاب مع اصلاح

اصلاح معاملہ متعلقِ ولایتِ نکاح

ولایتِ نکاح سے متعلق چند کوتاہیوں کا بیان

اس ولایتِ نکاح (نکاح کا اختیار رہونا) میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے، اس لئے مختصراً ان پر متنبہ کرنا ضروری ہے، وہی ہذہٖ (اور وہ یہ ہیں) :-

لاوارث نابالغ لڑکی کا نکاح کر دینا

ایک کوتاہی تو وہی ہے جو ابھی قریب اوپر ضمیمہ ثالثہ میں لاوارث نابالغ لڑکی کے نکاح کر دینے کے مضمون میں مذکور ہوئی ہے،

ماں کا حقِ ولایت اس وقت تک ہی جب عصبات میں سے کوئی نہ ہو

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ اتباعِ رسم وعرف کے سبب ولی اقرب (نزدیک کے ولی) کو ولی ابعد (دور کے ولی) کے سامنے بیکار سمجھتے ہیں مثلاً ایک نابالغ لڑکی کا ایک بالغ بھائی ہے، اور ایک چچا، تو چچا اپنے کو بڑا سمجھ کر اس بھائی کا کچھ دخل نہیں سمجھتا اور اپنے کو مختارِ مستقل سمجھ کر اپنی ولایت سے اس کا نکاح کر دیتا ہے، اور اس سے اجازت حاصل نہیں کرتا، بلکہ بعض جگہ اس کی ناراضی کی حالت میں بھی جبراً نکاح کر دیتا ہے، حالانکہ شرعاً اس صورت میں بدون بھائی کی صریح اجازت کے نکاح درست نہیں ہوتا خصوصاً اس رسم کا اثر لڑکی کے نکاح کے بارے میں ماں پر خاص طور پر ہوتا ہے، کہ خود ماں اپنے سامنے کسی کو مختار نہیں سمجھتی، خصوص عصبات (خاص طور پر شوہر کے ددھیائی رشتہ داروں) کو (جو کہ اس کے حق میں ماں پر شرعاً مقدم ہیں) یہ جاہل ماں اپنے سے مقدم تو کیا مؤخر بھی نہیں سمجھتی، یعنی اُن کا بالکل حق ہی نہیں سمجھتی، تو سمجھ لینا چاہئے کہ ماں کا حقِ ولایت اس وقت ہے جب عصبات (ددھیالی رشتہ داروں) میں سے کوئی نہ ہو،

نابالغ بچی کی پرورش میں کوتاہی کے باوجود باپ کا حقِ ولایت باقی رہتا ہے،

ایک کوتاہی جس میں بعضے نیم مُلا بھی گرفتار ہیں یہ ہے کہ باپ کی ولایت کو اس کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں، کہ وہ اس نابالغہ کی خدمت اور پرورش کرتا ہو، ورنہ اگر وہ کسی عذر سے بی بی کے ساتھ ناچاقی (نااتفاقی)

کی وجہ سے اس کی پرورش میں کوتاہی کرے تو اس کی ولایت کو ساقط سمجھتے ہیں، گو بلا عذر اولاد کا حق ضائع کرنا معصیت (گناہ) ہے، لیکن معصیت سے ولایتِ نکاح تو سلب نہیں ہوتی، (چھین نہیں جاتی) اور سوءِ اختیار (بُرے اختیار) کی صورت جو فقہاء نے لکھی ہے وہ اور بات ہے، ہر کوتاہی اس سوءِ اختیار میں داخل نہیں، ہمارے وطن میں ایک زاعمِ علم (خود ساختہ عالم) نے عجیب مضمون لکھا تھا، اور لطف یہ ہے کہ ایک مجمع میں اس کا اعلان بھی کیا، مگر نظرِ رد سے سُنا گیا، اور یہ لکھا تھا کہ جب معصیت سے ولی اللہ کی ولایت زائل ہو جاتی ہے تو ولی النکاح کی ولایت کیوں زائل نہ ہو جائے گی، یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دیکھو نماز ایک تعلق ہے عبد (بندہ) اور رب کے درمیان میں، اور نقضِ وضو (وضو کے ٹوٹنے) سے باطل ہو جاتی ہے، تو نکاح جو کہ ایک تعلق ہے عبد اور عبد میں تو وہ نقضِ وضو سے کیونکر باطل نہ ہو جائے گا، یاد رکھنا چاہئے کہ دین کے لئے محض رائے کافی نہیں، حجتِ شرعیہ (شرعی دلیل) کی حاجت ہے، اور اس تقریر کا حجتِ شرعیہ نہ ہونا ظاہر ہے،

سوتیلے باپ کو حقِ ولایتِ نکاح کسی صورت حاصل نہیں،

ایک کوتاہی اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ جس شخص کو کبھی اور کسی درجہ میں بھی حقِ ولایت نہیں وہ اپنے کو ولی النکاح سمجھتا ہے، چنانچہ اکثر جگہ سوتیلے باپ کو ولایتِ نکاح کا دعویٰ کرتے ہوئے، بلکہ اسی ولایتِ مزعومہ کی بناء پر نابالغہ کا نکاح کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، حالانکہ یہ شخص ولی اَبعَد بھی نہیں، البتہ اگر کسی صورت میں ماں کو حقِ ولایت ہو، یعنی جبکہ عصبات میں سے کوئی نہ ہو، اور ماں اپنی طرف سے اس شوہر کو وکیلِ نکاح کر دینے کا بنادے، تو یہ وکالت کی بناء پر البتہ اس کو اس نکاح کا اختیار حاصل ہو جائے گا، اور بدون اس کے یہ کوئی چیز نہیں،

ولی کے جبراً نکاح کرا دینے سے نکاح درست نہیں ہوتا،

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو ولایتِ نکاح تو حاصل ہے، مگر ولایتِ جبریہ (زبردستی کے اختیار کی ولایت) نہیں ہے، صرف یہ ولایت ہے کہ اس کے استیذان (اجازت مانگنے) پر منکوحہ کا سکوت (خاموشی) اذن (اجازت) سمجھا جاتا ہے، یعنی لڑکی بالغہ ہے، مگر یہ شخص جبراً اس کا نکاح کر دیتا ہے، یعنی وہ تصریحاً انکار اور رد کرتی ہے، مگر اس کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ظلم اور زور کر کے اس کو بیوی بناتا ہے اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے، اور افسوس کہ عام لوگ بناء بر جہل (جہالت کی وجہ سے) ان ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی عاقبت برباد کر دیتے ہیں، لوگوں کے خیال میں نکاح کے چند الفاظ ایسے مؤثر (اثر

رکھنے والے ہیں کہ ان کی تاثیر کی کوئی شرط نہیں،

باکرہ بالغہ کا سکوت ہی اذن ہے ایک کوتاہی جو کہ بہت ہی عام ہے خاص ولی جائز سے صادر ہوتی ہے، وہ یہ کہ مسئلہ شرعیہ یہ ہے کہ باکرہ لڑکی جب بالغہ ہو تو اس سے استیذان یعنی اجازت لینا صحتِ نکاح کے لئے ضروری ہے، اتنا فرق ہے کہ اگر ولی جائز یا اس کا وکیل یا اس کا رسول یعنی جس کو اس نے بھیجا ہو یہ لوگ اس بالغہ سے اذن چاہیں تب تو اس کا سکوت اذن ہے، اور اگر کوئی اور شخص اذن چاہے تو جب تک وہ زبان سے اجازت نہ دے محض اس کا سکوت (خاموش رہنا) اذن نہ ہوگا، البتہ اگر قبل اذن ولی نے نکاح کر دیا اور بعد نکاح اس منکوحہ بالغہ کو خبر پہونچی تو اگر یہ خبر پہنچانیوالا ولی کا فرستادہ (بھیجا ہوا) ہو، یا اگر فرستادہ نہیں تو وہ خبر پہنچانے والا اگر ایک ہو تو عادل اور دیندار ہو، یا کم از کم دو شخص ہوں، اگرچہ ثابت العدالت (عادل ثابت) نہ ہوں مگر مستور الحال ہوں، (جن کا حال چھپا ہوا ہو) تو اس صورت میں بھی اس کا سکوت اذن ہوگا، اور اگر ایک شخص غیر عادل ہو تو اس وقت اُس کا سکوت کافی نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار، ورد المحتار ج ۲ صفحہ ۴۸۹، ۴۹۰)

اور جن صورتوں میں اذن نہیں ان صورتوں میں صحتِ نکاح اُس وقت ہوگی جبکہ وہ زبان سے اجازت دے یا اس سے کوئی فعل صادر ہو جو اس کی رضا پر دلالت کرے، مثلاً وہ اپنا مہر یا نفقہ مانگنے لگے، یا ہمبستری کے وقت انکار نہ کرے، اور جب تک یہ امور نہ پائے جائیں نکاح موقوف (رُکا ہوا) رہے گا،

نکاحِ موقوف کے احکام نکاحِ موقوف کے احکام میں سے یہ امور ہیں:۔

(۱) اگر قبل نفاذِ نکاح کے احد الزوجین (میاں بیوی میں سے کوئی ایک) مرجائے نکاح باطل ہو جائے گا، نہ مہر واجب ہوگا اور نہ ایک کی میراث دوسرے کو پہنچے گی، (۲) قبل نفاذِ نکاح کے اس عورت سے بوس و کنار یا صحبت کرنا حرام ہے، کیونکہ نفاذ خود ان افعال سے معلل (علت والا) ہے، تو یہ افعال نفاذ پر مقدم ہوے، اور ظاہر ہے کہ بدونِ نکاح کے یہ افعال حرام ہیں، اگرچہ پھر انہی افعال سے نفاذ ہو جاتے، کذا فی رد المحتار (عن البحر، ج ۳، ص ۲۱۱ سطر ۹ قولہ وکتقبیلها الخ) یہ تو مسئلہ کی تفصیل ہوئی،

قبل نکاح باکرہ منکوحہ سے اذن نہ لینے سے نکاح موقوف رہے گا، اب اس کوتاہی کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس وقت عموماً عادت ہے کہ قبل نکاحِ باکرہ (کنواری کے نکاح سے پہلے) منکوحہ سے اذن نہیں لیا جاتا، اور بعض اوقات خبر بھی بطریق مذکورہ اس کو نہیں پہونچتی، اور وہ اسی

حالت سے رخصت کردی جاتی ہے، تو یہ رخصت ایسی حالت میں ہوتی ہے کہ اس کا نکاح نافذ نہیں ہوتا موقوف رہتا ہے، پھر جب شوہر کے ساتھ اس کی خلوت ہوتی ہے اور وہ اظہار ناراضی کا نہیں کرتی تب نکاح نافذ ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ بوس وکنار یا ہمبستری سب حرام ہوتا ہے، گو اس کے بعد نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اور پھر یہ سب افعال حلال ہوتے ہیں، مگر اول بار کا بوس وکنار وغیرہ سب حرام ہوا جس میں زوجین تو مبتلا ہوئے ہی خود وہ ولی صاحب بھی جو سبب اس ارتکاب محرم (حرام کاری) کے ہوئے اس ذیل میں شریک ہوئے،

نکاح سے قبل منکوحہ سے اذن حاصل کرنا ضروری ہے،

اور اس کا بہت آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے، کہ قبل نکاح اذن حاصل کریں، یا نکاح کر کے فوراً خود جا کر اطلاع کردیں، نیز اگر اتفاق سے زوجین میں سے کوئی مرگیا تو مہر اور میراث کے احکام میں بوجہ جہل کے اختلال واختلاف (جہالت کی وجہ سے خرابی اور اختلاف) ہوگا، گو ایسا واقعہ کم پیش آتا ہو مگر پیش آتا بھی ہے،

نکاح موقوف کی صورت میں شب زفاف میں عورت اظہار ناراضی کردے تو نکاح نافذ ہی نہیں ہوگا

اور ہمبستری کی حرمت (حرام ہونے) کی خرابی تو سب ہی جگہوں پر پیش آتی ہے، اور اگر ایسی صورت میں کہ نکاح نافذ نہ ہو ہمبستری کے وقت بھی ناراضی ونفرت کا اظہار کرے جیسا کہ زفاف (پہلی مرتبہ کی ہمبستری) کے وقت بعض عورتیں کرتی ہیں تو وہ نکاح نافذ بھی نہیں ہوتا، پس تمام عمر حرام ہوتا رہتا ہے، انہی وجوہ سے بہت ضروری ہے کہ کم از کم نکاح خواں قاضی (نکاح پڑھانے والا قاضی) عالم ہونا چاہئے تاکہ ان امور کا انتظام پورے طور سے کرے،

بارہ برس کی عمر کی لڑکی کی اجازت معتبر نہیں

ایک کوتاہی مسئلہ ولایت کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ عموماً لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں لڑکا اور لڑکی بالغ ہوجاتے ہیں، پس بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی بارہ برس کی ہے اور واقع میں وہ نابالغ ہے، اور ولی قریب موجود ہے، مگر باوجود اس کے ولی بعید یا اجنبی غیر ولی اس لڑکی کو بالغ سمجھ کر اس کے منہ سے اجازت لے کر اور اس کو کافی سمجھ کر کہیں اس کا نکاح کر دیتا ہے، حالانکہ بوجہ نابالغ ہونے کے اس کی اجازت اصلاً معتبر نہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بارہ برس میں بالغ ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کا بالغ ہونا حیض کے آنے سے ہے، البتہ اگر پندرہ برس پورے ہو کر بھی حیض نہ آئے تو پھر اس کے بلوغ (بالغ ہونے) کا حکم کردیا جائے گا،

اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی ولی جائز نے کرایا ہو تو بعد بلوغ لڑکی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا۔

ایک کوتاہی ولایت کے متعلق ایک اور مسئلہ میں ہوتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر بجز باپ اور دادا (باپ اور دادا کے علاوہ) کوئی دوسرا ولی جائز نابالغ لڑکی کا نکاح کفو سے مہر مثل[1] پر کردے تو نکاح تو صحیح ہوجاتا ہے، لیکن اس لڑکی کو بالغ ہونے کے وقت جبکہ اس کو پہلے سے خبر نکاح کی ہو یا بعد بالغ ہونے کے جب اول بار اس کو نکاح کی خبر ہوا اختیار ہے اس نکاح کے فسخ (ختم) کردینے کا اور یہ خیارِ فسخ دخول (ہمبستری) کے بعد بھی باقی رہتا ہے، لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ یہ لڑکی اِس وقت تک باکرہ ہو تب تو اس فسخ کی شرط ہے کہ بالغ ہونے کے ساتھ ہی یا خبر پہونچنے کے ساتھ ہی زبان سے کہے کہ میں اپنا نکاح فسخ کرتی ہوں، اگر فوراً نہ کہا تو یہ اختیار باطل ہوگیا، اور اگر یہ ثیبہ (کنواری نہیں) ہے، خواہ تو اس نکاح سے پہلے ہی ثیبہ تھی، مثلاً یہ نکاح ثانی تھا یا اس نکاح کے بعد اس کے ساتھ دخول ہوا ہو تو یہ اختیار اس وقت تک باقی رہے گا کہ صراحۃً (وضاحت سے) زبان سے رضا ظاہر کرے یا دلالۃً رضا پائی جائے مثلاً لمس وقبلہ (چھونے اور بوسہ لینے) وغیرہ پر انکار نہ کرے،

خیارِ فسخ کے مؤثر ہونے میں قضاءِ قاضی شرط ہے

اور ایک شرط اس خیار فسخ کے مؤثر ہونے میں اور بھی ہے کہ قضاءِ قاضی (شرعی حاکم کا فیصلہ) اس کے ساتھ متصل ہو، یعنی یہ عورت قاضی یعنی حاکم مسلم کے یہاں دعویٰ فسخ کا کرے، اور وہ حاکم تفریق کا حکم کردے تب نکاح فسخ ہوگا، ورنہ نہیں، یہ تو مسئلہ کا بیان تھا،

نکاح فسخ ہونیکے چند شرائط

اب کوتاہی اس میں یہ ہوتی ہے کہ ناتمام مسئلہ سن کر صرف عورت کے اس کہہ دینے کو کہ میں نے نکاح فسخ کیا ہر حال میں کافی سمجھتے ہیں، خواہ وہ مجلسِ بلوغ و مجلسِ وصولِ خبر (بالغ ہونے اور خبر پہونچنے کی مجلس) کے بعد ہی کہے اور اگرچہ اس کے ساتھ قضاءِ قاضی نہ ہو، تو یہ سخت غلطی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت مسائل ہیں جن میں قضاءِ قاضی شرط ہے جن کو اس کا علم نہیں، اُن کو تو یہ دینی ضرر ہوتا ہے، کہ وہ بدون قضاءِ قاضی کے ان احکام کو نافذ

---

[1] مہر مثل، خاندانی مہر یعنی اس عورت کے باپ کے گھرانے میں دوسری عورت جو اس کے مثل ہو (یعنی وہ عورت عمر، خوبصورتی، کنوارے پن، مالداری، وطن، دینداری، ہوشیاری اور سلیقہ شعاری میں اس عورت کے مانند ہو) اس عورت کا مہر مقرر ہوا تھا اس کے برابر "مہر مثل" کہلاتا ہے، بندہ احقر قریشی غفرلہٗ

سمجھتے ہیں اور جن کو اس کا علم ہے ان کو ان بلاد میں یہ دنیوی ضرر ہے کہ قاضی مسلم نہ ہونیکے سبب ان کو ان کلفتوں سے نجات پانے کا بخوبی ذریعہ نہیں، اس لئے احقر کی رائے مدت سے یہ ہے کہ اگر عامۂ اہلِ اسلام گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ہر ضلع میں ایک عالم بہ انتخاب (ایک عالم کو منتخب کرکے) اہلِ اسلام ایسے مقدمات کی سماعت وفیصل (ایسے مقدموں کو سننے اور فیصلہ کرنے) کے لئے مقرر کردیئے جائیں اور اُن کی تنخواہ کے انتظام کے لئے مالگذاری کے ساتھ فی سینکڑہ کچھ مختصر سی رقم مسلمان زمینداران سے وصول کرلی جاوے، کیونکہ جمہور اہلِ اسلام کو اس کا نفع پہونچے گا تو جن مسائل میں قضاءِ قاضی شرط ہے، ان میں مسلمانوں کو آسانی ہوجاوے،

بعض مقامات پر ولیِ اقرب کا لڑکی کے ساتھ ظلمِ عظیم

ایک کوتاہی ولایت کے باب میں یہ ہے کہ بعض اوقات ولی اقرب اپنے اختیارات کے زعم (گمان) میں لڑکی کو بہت دق (تنگ) کرتا کر کبھی سالہاسال بے نشان (لاپتہ) ہوجاتا ہے، کبھی اس انتظار میں نکاح نہیں کرتا کہ بہت سا روپیہ ہو جس سے سامانِ تفاخر (فخر کا سامان) کیا جاوے تب نکاح کروں، کبھی اچھی اچھی جگہوں کے پیغاموں کو رَدّ کرکے ترفع (خوش حالی) کی طلب میں غلو کرتا ہے، اور ان افعال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی یوں ہی بیٹھی رہتی ہے، بعض جگہ ننگ وناموس (عزت ووقار) برباد ہوگیا، بعض جگہ غایت صبر وضبط (بہت زیادہ صبر وضبط کرنے) سے لڑکی کو امراض صعبہ (پیچیدہ امراض) لاحق ہوگئے، یہ ولی صاحب سمجھ رہے ہیں کہ میرے سامنے کوئی بااختیار نہیں ہے، سو جس طرح چاہوں گا کروں گا اس کا ظلمِ عظیم ہونا تو معلوم ہی ہے، لیکن اس شخص کے اس خیال کا غلط ہونا بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اسی پر دارومدار ہے،

غیبت منقطعہ ہونے سے ولایت ولیِ ابعد کی طرف منتقل ہوجاتی ہے

سو سمجھ لینا چاہیئے کہ ان دونوں مذکورہ صورتوں میں یعنی جب کہ وہ بے نشان ہوجاوے اور بہت دور دراز چلا جاوے اور مدتوں تک نہ آوے اور نہ کسی بات کا جواب دے، یہ بھی بے نشان ہونے کے حکم میں ہے، اس کو غیبتِ منقطعہ (مستقل غائب ہونا) کہتے ہیں، پس جب وہ بغیبتِ منقطعہ غائب ہوجاوے، یا باوجود اچھا موقع ملنے کے محض جاہلانہ خیالات کی وجہ سے ٹالتا ہو تو ان دونوں صورتوں میں ولایت اس ولیِ اقرب سے ولیِ ابعد کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، اور اس ولیِ ابعد کو اس لڑکی کے نکاح کردینے کا مثل ولیِ اقرب کے اختیار حاصل ہوتا ہے، پھر وہ ولیِ اقرب کچھ نہیں کرسکتا،

بالغ لڑکی ولی کی غفلت اور لاپرواہی کی صورت میں خود نکاح کرسکتی ہے

اور اگر وہ لڑکی بالغ ہو تو پھر خود وہ لڑکی اختیار رکھتی ہے کہ مناسب موقع پر اپنی زبان سے اجازت دے کر نکاح کرلے، البتہ غیر کفو میں نہ کرے، کہ اس میں ایک قول میں ولی کو حقِ فسخ حاصل ہے بشرط القضاء، اور ایک قول میں نکاح ہی صحیح نہیں ہوتا، اس لئے غیر کفو میں کرنے سے ممانعت کی جاتی ہے،

یہ مختصر بیان ہے ولایت کے متعلق کوتاہیوں کا۔

اصلاحِ معاملہ متعلقہ بہ کفارت

شرع نے کفارت (برابری) میں چند اوصاف کا اعتبار کیا ہے، جن میں ایک نسب بھی ہے، اس کے متعلق خاص ہندوستان میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں:۔

کفارتِ نسب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب میں ماں کا بھی اعتبار کرتے ہیں، یعنی اگر ماں کسی کی نجیب (شریف) نہ ہو تو اس کو نجیب نہیں سمجھتے، اور اس لئے اس کو اپنا ہمسر نہیں جانتے، حالانکہ شریعت نے کفارتِ نسب کے باب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں کیا، اسی طرح دوسرے احکامِ نسبیہ میں بھی ماں کا اعتبار نہیں کیا، مثلاً ایک شخص کی ماں صرف بنی ہاشم میں سے ہو اس کو زکوٰۃ حلال ہے، پس صرف نجیب الاب ہمسر ہی نجیب الطرفین کا،

ماں کی طرف سے سیادتِ نسبیہ صرف حضرتِ فاطمہ رض اور اُن کی اولاد کے لئے ثابت ہے

البتہ اس کلیہ سے صرف ایک جزئیہ مستثنیٰ (ایک جز علیحدہ) ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادتِ نسبیہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے بھی ثابت ہو کر آپ کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ بھی سید ہیں اور افضل ہیں دوسرے بنی ہاشم سے، حتیٰ کہ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں بھی ہوں مگر حضرت فاطمہ رض کے بطن سے نہ ہوں وہ سید نہ ہوں گے، بلکہ علوی ہوں گے، اور یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض نسب ناموں میں علویوں کے ناموں کے ساتھ "سید" ملا ہوا ہے یہ صحیح نہیں، اور علویوں کا دعویٰ سیادت محض غلط ہے، البتہ بنی ہاشم میں سے ہیں، اور بنی ہاشم کے جو فضائل ہیں وہ ضرور اُن کے لئے حاصل ہیں،

نسب میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب پر فخر کرتے ہیں اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، حالانکہ نسب کوئی فخر کی بات نہیں، البتہ حق تعالےٰ کی نعمت ہے جس پر شکر کرنا چاہئے نہ کہ کبر و تحقیر (تکبر اور دوسروں کو حقیر سمجھنا) جو کہ پوری ناشکری ہے، خصوص جبکہ خود اس پر کوئی دلیل کافی نہیں کہ یہ مفتخرین (فخر کرنے والے) جس

جدِ(دادا) کی طرف انتساب (منسوب ہونے) کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دعویٰ صحیح بھی ہے، بلکہ بعض قرائن (دلائل) سے اس کے خلاف کا شبہ ہوتا ہے چنانچہ ایک شبہ احقر نے بعض بڑے بڑے مجامع (مجلسوں) میں جہاں ایسے حضرات کا اجتماع تھا بیان کیا، وہ یہ کہ اکثر جگہ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ چند صحابہؓ کی طرف اپنے کو منسوب کرتے ہیں، مثلاً حضرات خلفائے اربعہ حضرت عباسؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ،

ہندوستان کے نسب ناموں میں ایک قوی اشکال، اب خلجان (شبہ) اس میں یہ ہے کہ ہندوستان میں فتوحات وغزوات کے لئے خاص انہی حضرات کی اولاد منتخب ہوکر آئی یا اوروں کی نسل منقطع ہوگئی، اور یہ دونوں امر عادۃً مستبعد (ناممکن) ہیں، اس سے صاف یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید دوسروں نے انہی حضرات کی طرف افتخار (فخر کرنے) کے لئے منسوب کردیا ہے، تو ایسے شبہ کے ہوتے ہوئے اس قدر فخر کرنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے[1]؟

شرافتِ نسبیہ کا شریعت نے اعتبار کیا ہے ،،، ایک کوتاہی اس کے مقابلہ میں بعض لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ عرفاً شریف نہیں ہیں، مگر زبردستی اپنے کو اصطلاحی شریفوں میں داخل کرتے ہیں، اور اپنے لئے نسب غیر معروف وغیر ثابت بالدلیل کا محض مجازفت (تخمینہ اور اٹکل) سے دعویٰ کرتے ہیں، حدیث میں ایسے مدعی کو (دعویٰ کرنے والے) پر لعنت آئی ہے، ان عرفی غیر شریفوں میں سے بعض نے اپنے اوپر ایک اور طریق سے یہ دھبہ دھونا چاہا ہے، وہ یہ کہ شرافتِ نسبیہ ہی کی سرے سے نفی کرنے لگے، کہ سب بنی آدم برابر ہیں، کسی کو کسی پر نسباً شرف نہیں، سو اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ ایسا شرف نہیں جس پر دنیوی فخر کیا جائے، یا اس کو اخروی نجات میں کچھ دخل ہے تو تو ٹھیک ہے، اور اگر یہ مطلب ہے کہ شرفِ نسب میں تفاوت (فرق) کا بالکلیہ کسی حکم میں اعتبار نہیں تو محض غلط ہے، خود شریعت نے نکاح کفاءت کا اعتبار کیا ہے، امامتِ کبریٰ میں قریشیت کو شرط ٹھہرایا ہے، امامتِ صغریٰ میں اشرفیۃ نسبیہ (خاندانی شرافت) کو مرجحات (ترجیح ہونے) میں سے کہا ہے،

---

[1] حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔ (الحجرات، آیت ۱۳) "یعنی اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرسکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے"، واقعی سچ ہے ؎ بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ؛ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست (جعفر قریشی)

شرافتِ نسب میں پردیسیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھنا صحیح نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض قصباتی دیہاتی لوگ تمام پردیسیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک شرافت محصور (بند) ہے چند قریٰ (بستیوں) میں، جس پر کوئی دلیل نہیں، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص باہر سے کوئی نکاح کر کے لے آئے، برادری کی عورتیں ہرگز اس کو اپنے برابر نہیں سمجھتیں، پھر اس کی اولاد کی شادی برادری میں مصیبت ہو جاتی ہے،

کفارتِ نسبیہ میں افراط وتفریط مذموم ہے،

دو کوتاہیاں اس باب میں کفارتِ نسبیہ میں اور وقوع میں آتی ہیں، ایک افراطی دوسری تفریطی، افراطی (حد سے آگے بڑھنا) تو یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً پرانے زمانے کے اس کو اس قدر مہتم بالشان سمجھتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ناکح کے کسی وصف کو نہیں دیکھتے، نہ لیاقت کو نہ دین کو نہ صحت کو نہ عمر کو نہ وسعتِ مالیہ کو، اور اپنے اس خیال پر اس عنوان سے افتخار کرتے ہیں کہ میاں ہڈی بوٹی اچھی ہونا چاہیئے، کسی ظریف نے اس عنوان کا جواب نہایت لطیف دیا ہے کہ ہم تو کتے نہیں جو فقط ہڈی بوٹی کو دیکھیں، اور واقعی اس خیال کا لغو ہونا ظاہر ہے، نکاح سے جو اصل مقصود ہے یعنی مصالح خاصہ، اس کے لئے سب ہی امور پر نظر کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ صرف ایسے وصفِ اضافی (زائد خوبی) پر جو کہ خود ناکح کے کسی وصفِ حقیقی کی طرف راجح نہیں، محض آباء واجداد کی طرف انتساب اس کا منشاء ہے، اس پر مفاسد یہ مرتب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ناکح محض نالائق، بددین، یا مریض، بے کار یا بہت بوڑھا، یا بالکل بچہ یا فاقہ زدہ ہوتا ہے، اور منکوحہ کے لئے عمر بھر کا جیل خانہ ہو جاتا ہے،

اور تفریطی (کمی کرنے والے) یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً نئے زمانہ کے دوسرے اوصاف کے ہوتے ہوئے نسب کا ذرا لحاظ نہیں کرتے، کہیں حبِّ دین (دین کی محبت) کے غلبہ کے سبب اور کہیں حبِّ دنیا (دنیا کی محبت) کے غلبہ کے سبب، امرِ ثانی تو کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والا) ہے، امرِ اول کا بھی ہم نے ایک مادہ تحقیق دیکھا ہے، کہ دو نوجوانوں میں دوستی تھی، جو کہ دونوں نیک بخت، دیندار تھے، جن میں ایک عالی نسب سید زادہ (اونچے خاندان کے سید کا لڑکا) اور دوسرے برہمن زادہ نومسلم (برہمن کے بیٹے نومسلم) تھے اور وہ سید زادہ اپنی یتیم ہمشیرہ کا عقد اس اپنے دوست سے کرنے کی فکر میں تھے، اور وہ دوست اپنے لئے اس امر میں بیحد کوشاں (بے انتہا کوشش کرنے والے) تھے، مجھ کو اطلاع ہوئی، چونکہ دونوں شخصوں کو مجھ سے دینی خصوصیت تھی میں نے دونوں کو خصوصاً خاطب (نکاح کا پیغام دینے والے) کو بہت سختی کے ساتھ روکا،

اور کہہ دیا کہ اگر وہ لڑکی بالغ ہے تب تو گو بھائی کے بعد استیذان (بھائی کے اجازت حاصل) کرنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن حمیّت و مصلحت (غیرت اور مصلحت) کے خلاف ہے، کہ شریفہ کو فراش (بیوی) بنایا جاتا ہے دنی (کم مرتبہ والے) کا، نیز اکثر ایسے موقع پر عورت کی نظر میں زوج (خاوند) کی وقعت بھی نہیں ہوتی جس سے تمام مصالح نکاح فوت ہو جاتے ہیں، اور اگر وہ نابالغ ہے تو چونکہ نکاح کرنے والا باپ اور دادا نہیں اس لئے یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار ور دالمحتار، ج ۲، ص ۵۰۰) چنانچہ بفضلہ تعالیٰ ایک مدت کے بعد دونوں اس خیال سے باز آگئے، البتہ اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے،

عجمی عالم بھی عربیہ کا کفو نہیں

چنانچہ ابھی تازہ ایک واقعہ ہوا ہے کہ ایک غریب شیخ زادہ نے اپنی نابالغ دختر کا نکاح ایک ذی وسعت عجمی النسل مگر دیندار شخص کے فرزند سے کیا ہے، اور گو بعض نے عجمی عالم کو عربیہ کا کفو کہا ہے، مگر در مختار میں تصریح ہے:

العجمی لا یکون کفوا للعربیۃ ولو کان العجمی عالما او سلطانا وھو الاصح فتح عن الینابیع وادعی فی البحر انہ ظاھر الروایۃ (ج ۲ ص ۵۲۹)	"عجمی مرد عربی عورت کا کفو نہیں ہو سکتا اگر چہ وہ عجمی عالم اور بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اور یہ زیادہ صحیح ہے جسے فتح القدیر نے ینابیع سے نقل کیا ہو اور ظاہر روایت پر حیرانگی کا اظہار کیا ہے۔"

کفو کا اعتبار مرد کی جانب سے ہوگا عورت کی جانب سے نہیں

اور بعض نے اس افراط و تفریط کے درمیان بزعم خود (اپنے گمان کے مطابق) ایک معتدل فیصلہ اختراع (وضع) کیا ہے، وہ یہ کہ کم ذات کو خواہ لڑکی دیدے مگر کم ذات کی لڑکی لے نہیں، اور اپنے ذہن میں اس کا مبنیٰ ایک نکتہ نکالا ہے، وہ یہ کہ اگر کم ذات کی لڑکی آئی اور اس سے اولاد ہوئی تو اپنے خاندان کی نسل بگڑتی ہے، اور اگر کم ذات کے گھر لڑکی چلی گئی تو اس کی نسل سنورتی ہے، اس شخص نے خود حکم میں بھی اور اس کی بناء میں بھی شریعت کے ساتھ مزاحمت کی ہے، حکم میں..... یہ مسئلہ فقہ ہے کہ:-

الکفاءۃ معتبرۃ من جانبہ ای الرجل لان الشریفۃ تابی ان یکون فراشا للدنی ولا تعتبر من جانبھا لان الزوج مستفرش	"کفاءت اس کی طرف سے یعنی مرد کی جانب سے معتبر ہے، کیونکہ شریف عورت کم درجہ کے مرد کی فراش (بیوی) بننے سے انکار کرتی ہے، اور اس عورت کی طرف سے

فلا تغیضه وتأتة الفراش وهذا عند الکل فی الصحیح، الخ

معتبر نہیں کیونکہ خاوند صاحبِ فراش ہو تو وہ فراش کے استعمال میں کراہت نہیں کرتا، اور یہ صحیح ہی سب کے نزدیک ،،

البتہ بعض نے ناکح صغیر میں اس کا اعتبار کیا ہے، کما فی رد المحتار تحت القول المذکور صفحہ ۵۲ ج ۲ اس فیصل کنندہ (فیصلہ کرنے والے) نے خلاف شریعتِ منکوحہ کا وضیع (کمتر) ہونا تو جائز نہ رکھا، اور ناکح کے وضیع (کمتر) ہونے کو جائز رکھا، اور اس حکم کی بنا میں شریعت کے ساتھ یہ مزاحمت کی کہ اس شخص نے نسب میں ماں کا اعتبار کیا ہے، دوسری مزاحمت یہ کی کہ اصل حکمت اس اعتبارِ کفاءت کی وہ ہی جو درمختار کی عبارتِ بالا میں مذکور ہے، لان الشریفة تأبی، اور اس شخص نے اس کے مقابلہ میں خود ایک غلط بناء گھڑی، پس اس شخص کا یہ فیصلہ ہر طرح بناء الفاسد علی الفاسد (فاسد کی بنیاد فاسد پر) ہے، یہ تو قانونِ شرعی کی تفصیل تھی جس میں لوگوں کی کوتاہیاں مذکور ہیں

غیر کفو کی منکوحہ لانے سے اس کیلئے چند دشواریاں، باقی اقرب الی المصلحت (مصلحت کے زیادہ قریب) یہ ہی کہ منکوحہ بھی اپنی ہی کفو کی لائے، کیونکہ غیر کفو کے اخلاق و عادات اکثر اپنے موافق نہیں ہوتے، تو ہمیشہ باہم ناچاقی رہتی ہے، نیز وہ منکوحہ مرد کے خاندان میں بے قدر رہتی ہے، تو ایک مسلمان عورت کو بے وجہ مدت العمر کے لئے بے قدر کرانا کیا ضرور، نیز عرفاً اس کی اولاد کی شادی میں دشواریاں پیش آتی ہیں، تو بلاضرورت ان کلفتوں میں کیوں پڑے، یہاں تک تو اوصاف معتبرہ عند الشرع (شریعت کی نظر میں اعتبار کی گئی خوبیوں) میں سے کفاءتِ نسبیہ کا بیان تھا،

شرع نے کفاءت میں دین کا بھی اعتبار کیا ہے، اور منجملہ ان اوصاف کے جن کا شرع نے کفاءت میں اعتبار فرمایا ہے، ایک دین بھی ہے اور اس میں بھی مثل کفاءت فی النسب (خاندان میں برابری) کے عورت کا مرد سے کم ہونا مضر نہیں، مرد کا عورت سے کم ہونا مضر ہے، اس میں بھی چند کوتاہیاں ہو رہی ہیں، جو ایک تحقیق کے ضمن میں مذکور ہوتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ :-

مرد کی بد دینی کی تین قسمیں مرد کی بد دینی تین طرح کی ہے، ایک اعتقادی اصولی، دوسری اعتقادی فرعی، تیسری اعتقادی عملی،

قسم اوّل : جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلمان ہو، خواہ کتابی ہو مثل یہودی و نصرانی کے، خواہ غیر کتابی ہو، مثل مجوسی و بت پرست، و دہری کے، اس کا حکم تو ظاہر ہے کہ نکاح صحیح نہ ہوگا،

البتہ مرد اگر مسلم اور عورت کتابیہ ہو تو نکاح درست ہو جاتا ہے، گو مناسب نہیں، وجہ مناسب نہ ہونے کی یہ ہے کہ اختلاط کافرہ کا (کافر عورت سے میل جول) لازم آتا ہے، اور یہ درست ہونا بھی جب ہے کہ عورت باعتبار عقائد کے یہودی یا عیسائی ہو، اور اگر صرف قوم کے اعتبار سے ہو جیسے آجکل بہت سے نام کے عیسائی ہیں اور عقیدہ میں دہریے، اس کا حکم کتابی کا سا نہیں، ایسی عورت سے نکاح اصلاً درست نہیں، اور اگر عورت غیر کتابیہ ہو تو بھی نکاح درست نہیں،

قسم ثانی:۔ جیسے عورت سنیہ ہو، اور مرد مبتدع جیسے شیعی وغیرہ ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حدِ کفر تک پہنچ جاوے، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگانا یا وحی لانے میں جبرئیل علیہ السلام کو غلطی کی طرف منسوب کرنا وغیرہما (اور انہی جیسے دوسرے عقائد) یا اس زمانہ میں مرزا[له] کی نبوت کا قائل ہونا، تو اس شخص کا حکم بھی مثل قسم بالا کے ہے، یعنی ایسے شخص سے سُنّیہ کا نکاح جائز نہیں، اور اگر اس کی بدعت حدِ کفر تک نہیں پہنچی، تو وہ شخص مسلمان تو ہے، لیکن سنیہ کا کفو نہیں، اس عورت کا نکاح اگر ایسے مرد سے کیا جاوے تو اس کا حکم بوجہ غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے کے ویسا ہی ہے جیسا اوپر غیر کفو نسبی کے بیان میں ذکر کیا گیا، اس عبارت میں کہ "اگر وہ لڑکی بالغ ہے تب گو بھائی کے الیٰ قولہ اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے،، فقط،

بعض مبتدع فرقوں کے کفر میں اختلاف ہے

ایک صورت اس میں اور ہے وہ یہ کہ بعض مبتدع (بدعتی) فرقوں کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے، جیسے شیعہ کے باب میں فتووں کا مختلف ہونا مشہور ہے، سو مکفرین (کافر قرار دینے والوں) کے نزدیک تو سنیہ کا نکاح ایسے شخص سے باطل ہے، اور غیر مکفرین (کافر نہ کہنے والوں) کے نزدیک یہ نکاح غیر کفو میں ہے، اس لئے اس میں وہی تفصیل ہے جو ابھی غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے میں مذکور ہوئی، اور راحقر کا معمول اس صورت مختلف فیہا (اختلاف والی) میں یہ فتویٰ دینے کا ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوا ہو بطلانِ نکاح (نکاح باطل ہونے) کے قول پر عمل لازم ہے، کہ اس میں احتیاط ہے، کہ ایک خوش اعتقاد (اچھے عقیدہ والی) عورت ایک بد اعتقاد (غلط عقیدہ والے) مرد سے اور

له مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد ماننے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اس کا نکاح سُنی مسلمان عورت سے نہیں ہو سکتا ۱۲ احقر قریشی غفرلہٗ

بد اعتقاد بھی ایسا کہ جس کی بد اعتقادی بعض کے نزدیک حدِ کفر تک پہنچتی ہے، اور جب نکاح ہو چکا تو صحتِ نکاح کے قول کو اخذ کرنا (نکاح کے صحیح ہونے کو لینا) لازم ہے کہ اسی میں احتیاط ہے کیونکہ اس صورت میں اگر بطلان (باطل ہونے) کا قول لیا گیا، اور اس بناء پر دوسرے شخص سے نکاح کر دیا جائے تو احتمال (شبہ) ہے کہ واقع میں وہ پہلا نکاح صحیح ہو گیا ہو تو یہ دوسرا عقد ہمیشہ کے لئے زنا ہوا کرے گا، تو ایک متدینہ (پرہیزگار عورت) کا عمر بھر مبتلائے زنا ہونا لازم آئے گا، اور صحتِ نکاح کے قول پر اس احتمال کا اعتبار نہیں کیا گیا، کہ اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (یعنی اسلام غالب آتا ہے مغلوب نہیں ہوتا)

قسمِ ثالث:۔ فاسق مرد عورت صالحہ کا کفو نہیں، جیسے عورت صالحہ ہو اور بقول بعض فقہاء دخترِ شخصِ صالح (نیک آدمی کی بیٹی) بھی بحکم صالحہ ہے، اور مرد فاسق ہو اور بقول بعض فقہاء معلن (جس کا فسق علانیہ ظاہر ہو) ہونا بھی شرط ہے، تو یہ مرد اس عورت کا کفو نہیں ہے، اور غیر کفو کے ساتھ نکاح نہ ہونے کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی ہے،

غرض یہ تین قسمیں ہیں غیر کفو کی، ان میں جو کوتاہیاں ہیں اُن کا مختصر بیان یہ ہے کہ:۔

بلادِ یورپ کی لامذہب عورت سے نکاح صحیح نہیں،

بعضے لوگ بلادِ یورپ سے ایسی عورت نکاح کر کے لاتے ہیں جو صرف قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب، سو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی عورت سے ہرگز نکاح صحیح نہیں ہوتا، بعضے گو لاتے ہیں عیسائی ہی عورت مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے محض اجنبی ہو جاتے ہیں، اور اس کا واجب التحرز (پرہیز کا ضروری) ہونا بھی ظاہر ہے،

خاندانی مصالح موہومہ سے بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کرنا ظلمِ عظیم ہے،

بعضے لوگ محض طمعِ مال یا جاہ میں یا براہِ کم شفقتی بحالِ اولاد (اپنی اولاد کے حال پر کم شفقت کرنے) یا دیگر خاندانی مصالح موہومہ (خاندان کی خیالی مصلحتوں کے گمان) کے سبب اپنی لڑکیوں کا کسی بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں، تو وہ بد اعتقادی حدِ کفر تک پہنچی ہوتی ہے، تو عمر بھر کے لئے علاوہ ظاہری کلفت کے بحالتِ عدمِ توافق فی الدین (دینداری میں موافقت نہ ہونا) لازم ہے، یہ خرابی ہوتی ہے کہ ارتکابِ زنا لازم آتا ہے، پھر اگر اولاد ہوئی وہ بھی غیر حلالی اور اگر حدِ کفر تک بھی نہ پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہانِ روح (روحانی عذاب) نقدِ حال رہتا ہے،

نکاح سے قبل ناکح کے عقائد کی اچھی طرح تحقیق اور رجحان معین کرلینا ضروری ہے

اس باب میں سخت احتیاط لازم ہے، خصوص اس کی تحقیق قبل نکاح نہایت ضروری ہے کہ ناکح کسی فرقہ ضالّہ (گمراہ فرقہ) کے عقائد کا معتقد تو نہیں، اور قدیم گمراہ فرقوں میں سے نہ ہونے پر بھی قناعت نہ کی جائے کیونکہ آجکل روزانہ نئے نئے فرقے نکل رہے ہیں، اور زمانہ آزادی کا ہے، اس لئے اس شخص کی ان نئے فرقوں میں سے نہ ہونے کی مستقل تحقیق ضروری ہے، اسی طرح اگر وہ انگریزی خواں ہے تو دیکھ لیا جائے کہ جدید تعلیم کے اثر سے اس کی آزادی استخفافِ دین (دین کو ہلکا سمجھنے) یا انکارِ ضروریاتِ دین تک تو نہیں پہونچ گئی، ورنہ اگر ایک کلمہ بھی کفر کا منہ سے نکل گیا، تو بدون تجدیدِ اسلام و تجدیدِ نکاح رنئے سرے سے اسلام لانے اور نکاح پڑھائے بغیر) حرام کا ارتکاب ظاہر ہے، جس کو نہ غیرتِ انسانی قبول کرتی ہے نہ حمیتِ اسلامی،

یہ بیان ہے کفاءتِ دینیہ کے بارے میں کوتاہیوں کا،

ایک اہم علمی فائدہ

اوپر ابھی کفاءت فی الدین کے شروع میں بیان ہوا ہے کہ عورت کا مرد سے (مرتبہ ونسب میں) کم ہونا مضر نہیں، یعنی نکاح ہو جائے گا، اور مرد کا عورت سے (مرتبہ ونسب میں) کم ہونا مضر ہے، یعنی بعض صورتوں میں نکاح نہ ہوگا، سو آجکل چونکہ قرآن مجید کا ترجمہ سمجھنے عوام بھی (جو کہ اس کے سمجھنے کے اہل نہیں) دیکھتے ہیں ایسے لوگوں کو آیت سے احکامِ مذکورہ میں شبہ واقع ہونے کا احتمال تھا، اس لئے اس کو رفع کرنا مناسب معلوم ہوا، وہ آیت یہ ہے:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ
مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا
اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اس کے ظاہر ترجمہ سے شبہ ہوتا ہے کہ زانیہ اور زانی سے علی الاطلاق (مطلقاً) نکاح جائز نہیں، اور اس عدمِ جواز (جائز نہ ہونے میں) زانیہ وزانی کا مشرکہ اور مشرک کے ساتھ جمع ہونا قرینہ (دلیل) ہے کہ یہ عدمِ جواز بمعنی بطلان وعدمِ صحت (باطل ہونے اور درست نہ ہونے کے معنی میں) ہے، اور یہ تحقیق بالا کے خلاف ہے، اور جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں تحریم عام ہے بطلان

اور معصیت کو، بس مشرک و مشرکہ سے نکاح تو باطل ہے، اور زانیہ و زانی سے نکاح گو منعقد ہو جاتا ہے مرد عفیف (پاکباز مرد) کا زن غیر عفیفہ (بدکار عورت) سے علی الاطلاق (مطلقاً) اور زن عفیفہ (پاکباز عورت) کا مرد غیر عفیف (بدکار مرد) سے علی التفصیل (کچھ شرائط کی تفصیل کے ساتھ) لیکن جبکہ مقصود محض آب ریزی (شہوت رانی) ہو، اور تحصین (عزت کی حفاظت) مقصود نہ ہو، حتی کہ اگر دوسری جانب سے بدون نکاح ہی کے یا باوجود قیام مانع یعنی شرک کے رضامندی ہو جاتی تو نکاح بھی نہ کیا جاتا، اور اب نکاح کے بعد اس کے ارتکاب زنا کی پرواہ نہ ہو، اور یہی مراد ہے آیت میں تو اس مقصود کے لئے نکاح کرنا بنا بر قاعدہ "العزم علی الحرام حرامٌ والرضاء بالحرام حرام ومعصیۃ (جیسے امر حرام کا ارتکاب حرام ہے، اسی طرح کسی حرام کے ارتکاب پر رضامندی بھی حرام اور گناہ ہے)، اب دونوں شبہے زائل ہو گئے، اور اگر بسط (تفصیل) کا شوق ہو میری تفسیر (بیان القرآن) دیکھ لیجئے:

کفارت سے متعلق ایک عمدہ بحث

اختلافِ جنس ہونے کی صورت میں نکاح صحیح نہ ہوگا

جب باوجود اتحاد فی النوع (نسلی اتحاد) کے محض اختلاف اصناف یا اوصاف (قسموں یا صفتوں کے اختلاف) سے بعض صورتوں میں کفارت ایسی فوت ہو جاتی ہے جس سے نکاح صحیح نہیں ہوتا، تو اختلافِ نوع کی حالت میں جس کو فقہاء اختلافِ جنس کہتے ہیں کفارت کیوں نہ مفقود ہو جائے گی، اور نکاح کیسے جائز ہوگا، کیونکہ جو عدمِ کفارت فی الوصف (صفت میں ہم مثل نہ ہونا) مانع صحتِ نکاح سے ہے، یہ عدمِ کفارت فی الجنس (نسل میں ہم مثل نہ ہونا) اس سے بدرجہا اقوی ہے مصداق ممکن الوقوع اس قاعدہ کا نکاح ہے: درمیان جن مرد اور انسان عورت کے یا درمیان انسان مرد اور جن عورت کے، جس کو ہمارے فقہاء نے اسی اختلافِ جنس کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ درمختار میں ہے:-

مخرج الذکر والخنثی المشکل والوثنیۃ لجواز ذکورتہ والمحارم والجنیۃ وانسان الماء لاختلاف الجنس واجاز الحسن بشھود قنیۃ

"اس سے مذکر نکل گیا اور خنثیٰ مشکل نکل گیا، ممکن ہے وہ مذکر ہو، اس طرح جنیہ نکل گئی، اور دریائی انسان مختلف جنس ہونے کی وجہ سے نکل گیا، (یعنی ان سے نکاح جائز نہ ہوگا) اور

امام حسنؒ نے گواہوں کی موجودگی میں جنیہ کا نکاح جائز قرار دیا ہے، جسے قینہ سے درمختار نے نقل کیا ہے،

ردالمحتار میں ہے:

لان قوله تعالیٰ واللّٰه جعل من انفسكم ازواجاً بين المراد من قوله فانكحوا ما طاب لكم من النساء وهو الانثیٰ من بنات اٰدم فلا يثبت حل غيرها بلا دليل،

(فرمانِ الٰہی "اللہ نے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں" کی اصل مراد کو اللہ کے اس قول نے اس طرح واضح فرمایا کہ "نکاح کرو اپنی پسند ہو عورتوں سے" اور وہ اولادِ آدم ہی میں سے عورتیں ہیں، پس ان کے علاوہ غیر سے نکاح کا حلال ہونا بغیر دلیل شرعی کے ثابت نہیں ہوتا)

یہ تو دلیل نقلی سے استدلال کیا تھا، اور اس کے بعد ایک لطیف دلیل عقلی سے استدلال کیا ہے:

ولان الجن يتشكلون بصور شتى فقد يكون ذكرا التشكل بشكل انثیٰ رضـ۲۲۲) وفيه بعد اسطر فی الاشباه عن السراجية لا تجوز المناكحة بين بنی اٰدم والجن وانسان الماء لاختلاف الجنس اھ و مفاد المفاعلة ان لا يجوز للجنی ان يتزوج انسية ايضا وهو مفاد التعليل؛

"اس لئے کہ جن مختلف شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مذکر جن مونث کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے، اس کے کچھ سطروں بعد اشباہ النظائر میں سراجیہ سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی اولاد، جنات اور دریائی انسان کا آپس میں نکاح جائز نہیں، جنس کے اختلاف کی وجہ سے، اور (المناکحۃ میں) باب مفاعلہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جن کا نکاح بھی انسان عورت سے جائز نہیں، اور علت بیان کرنے کا یہی فائدہ ہے"

پھر چند سطر کے بعد حسنؒ کے قول مذکور کے مقابل نقل کیا ہے:-

عن شرح الملتقى عن زواهر الجواهر الاصح انه لا يصح نكاح اٰدمی جنية كعكسه لاختلاف الجنس فكانوا كبقية الحيوانات،

"شرح الملتقی نے زواہر الجواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ انسان مرد کا نکاح جن عورت کے ساتھ صحیح ہی نہیں، جیسا کہ اس کے برعکس ہے، (یعنی جن مرد کا نکاح انسان عورت سے درست نہیں) اختلافِ جنس کی بنا پر، جنوں کا حکم وہی ہے جو دیگر حیوانات کا ہے"

جن عورت کا انسان مرد سے اور جن مرد کا انسان عورت سے نکاح صحیح نہیں،

اور ہر چند یہ صورت نادر الوقوع (کبھی کبھار واقع ہونے والی) ہے لیکن ممتنع الوقوع (واقع ہونے میں ناممکن) نہیں ہے، اور حکم اس کا عوام میں مشہور و معلوم کم ہے، تو امکانِ وقوع.... (واقع ہونے کا)... احتمال تھا، کہ شاید کسی کو اتفاق پڑتا، اور وہ حکم معلوم نہ ہونے سے اس میں مبتلا ہو جاتا، جیسا کہ چند سال ہوئے ایک طالب علم جن کو احقر نے بھی دیکھا تھا ایک مدرسے سے غائب ہو گیا، کئی روز

کے بعد سہارنپور کے جنگل میں پایا گیا، اس نے اپنا سارا قصہ بیان کیا، کہ مجھ کو کچھ لوگ ہوا میں اٹھا کر لے گئے اور کسی اجنبی جگہ پہنچا دیا، وہاں ایک نفیس شاہانہ مکان میں ایک لطیف الوضع (بہترین) مجمع تھا، اور ایک جوان لڑکی بھی موجود تھی، جس نے اپنا تعشق (عشق ہونا) اس سے ظاہر کر کے نکاح کی درخواست کی، اس نے مسئلہ کی بنا پر تو نہیں، کیونکہ اس کو معلوم ہی نہ تھا، بلکہ محض توحش (گھبراہٹ) کے سبب رونا شروع کر دیا، آخر وہ لوگ اس کو پھر ہوا میں اڑا کر سہارنپور کے جنگل میں چھوڑ گئے، تو بہت ممکن تھا کہ اگر اس کو یہ توحش نہ ہوتا تو مسئلہ معلوم نہ ہونے کے سبب نکاح پر راضی ہو کر قبول کر لیتا خصوص جس شخص کے کان میں ایسے قصے پڑے ہوں کہ حضرت بلقیس کے باپ آدمی اور ماں جنیہ تھیں، یا جیسا جہلاء نے مشہور کیا ہے کہ حضرت محمد بن علی کی والدہ خولہ حنفیہ جنیہ تھیں، تو ایسے قصے سُن کر کچھ عجب نہیں کہ کوئی شخص ایسے موقع پر ایسے نکاح کو جائز ہی سمجھ جائے، اس لئے اس پر تنبیہ کر دی گئی،

جنیہ سے صحتِ نکاح کے سلسلہ میں بلقیس کے قصہ سے استدلال صحیح نہیں،

رہا استدلال (دلیل لانا) مذکورہ قصوں سے، سو گو پہلے قصہ میں احتمالِ صحت کا بھی ہے، لیکن اول تو ان لوگوں کا کسی شرع کا تابع ہونا ثابت نہیں بلکہ بلقیس کے اولاً شمس پرست (پہلے سورج کی پوجا کرنے والوں میں سے) ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ طریقہ ان کا آبائی ہو، پھر اس سے قطع نظر یہ ضرور نہیں کہ سب شریعتوں کے احکام فرعیہ (فروعی احکام) یکساں ہوں تو ان کا فعل ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتا،

بنی حنفیہ کی بنو جنیہ کی طرف نسبت من گھڑت ہے

اور دوسرا قصہ تو بالکل ہی غلط ہے، وہ تو قبیلہ بنی حنفیہ سے ہیں، جو یمامہ میں سکونت رکھتا تھا، میں نے اپنے استاد[1] علیہ الرحمہ سے سُنا کہ فرماتے تھے کہ یہ خاندان کرم اور شجاعت میں ممتاز ہونے کے سبب موافق محاورۂ عرب کے بنو جنیہ کہلاتا ہوگا، عوام نے اس کا حقیقی ترجمہ کر کے ان کی طرف منسوب کر دیا،

احقر کہتا ہے کہ جس طرح ایک شاعر نے کسی قبیلہ کی مدح کی ہے ؎

بنو جنية ولدت سيوفا

(ایک جنیہ عورت کی اولاد ہیں جنہوں نے تلواریں جنی ہیں)

---

[1] یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، پہلے صدر مدرس دار العلوم دیوبند، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہرات یعقوبی، حصہ اول صفحہ ۰، مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد، ضلع بہاولنگر،

باقی رہا حسنؒ کا اختلاف، سو دلیل صحیح کے مقابلہ میں وہ غیر معتبر ہے، باقی اُن پر اگر مخالفتِ نص کا شبہ ہو تو اس کو اس طرح دفع کیا جائے کہ شاید منشاء اُن کے قول کا یہ ہو کہ قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے کہ انسان و جن دونوں کو عام ہے، پس قولہ تعالیٰ

مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا، (النحل: ۲۷)	("اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں میں سے تمہارے لئے بیبیاں بنائی ہیں")

دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہوگا، پس دونوں کا ایک حکم ہوگا، رہا پھر جمہور کا مسلک اس کا کیا جواب دیں گے؟ سو جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جمع مقابل ہے جمع کے، پس آحاد (اکائیاں) منقسم ہوں گی آحاد (اکائیوں) پر، گو یہ آحاد جزئیات حقیقیہ (اکائیاں حقیقی جزئیات ہیں) نہ ہوں جزئیات اضافیہ (اضافی جزئیات) ہوں یعنی رجال الانس (انسانی مردوں) کے لئے نساء الانس (انسانی عورتیں)، اور رجال الجن (جن مردوں) کے لئے نساء الجن (جن عورتیں)۔

بہر حال ظاہر اور منصور (مدلّل و محقق) قول جمہور ہی کا ہے، لیکن حسنؒ کے قول کو قطعاً بالکل نص کے خلاف نہ کہا جائے گا، اور چونکہ مسئلہ ظنیہ ہے، اس لئے غیر قطعی ہونا جمہور کو بھی مضر نہ ہوگا اور عجب نہیں کہ جس طرح قول حسنؒ کا یہ منشاء نقلی ہو جو ابھی مذکور ہوا، اسی طرح ایک دوسرا منشاء عقلی ہو، مگر اس منشاء کی بناء پر یہ حکم جواز مخصوص ہوگا، اس صورت کے ساتھ جبکہ وہ جن بشکلِ انسان ہو، سو کچھ بعید نہیں کہ حسنؒ کے نزدیک یہ قید بھی ملحوظ ہو، گو اُن کے قول کے ساتھ یہ قید منقول نہیں ہوئی، لیکن بہت اقوال ناتمام بھی منقول ہو جاتے ہیں، اور وہ منشاء یہ ہو کہ

آدمی کی شکل میں جن صحبت کرے تو غسل واجب ہے	ہمارے فقہاء میں سے بعض اس طرف گئے ہیں گو بحثاً سہی روایۃً نہ سہی کہ اگر آدمی کی شکل میں ہو کر جن کسی آدمیہ (انسان عورت) سے یا

آدمی کسی جنّیہ (جن عورت) سے جو کہ آدمیّہ (انسانی عورت) کی شکل میں ہو صحبت کرے اور انزال نہ ہو تب بھی غسل واجب ہوگا، چنانچہ درمختار کے اس قول :۔

ایلاج حشفۃ آدمی احتراز عن الجن واذ لم یظھر لھا فی صورۃ الآدمی کما فی البحر،	("درمختار میں ہو کہ آدمی کا حشفہ داخل کرنا یہ جن سے احتراز ہے جب تک انزال نہ ہو اور جب تک جن انسان عورت کے لئے آدمی کی صورت میں ظاہر نہ ہو، جیسا کہ بحر الرائق میں ہے")

کے تحت ردّ المحتار میں ہے :۔

هو بحث لصاحب البحر وسبقه اليه صاحب الحلية لكنه تردد فيه فقال اما اذا ظهر في صورة آدمي وكذا اذا ظهر للرجل جنية في صورة آدمية فوطئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصورية المفيدة لكمال السببية، اللّٰهم الا ان يقال هذا انما يتم لو لم توجد بينهما مباينة معنوية في الحقيقة ومن ثم علل به بعضهم حرمة التناكح بينهما فينبغي ان لا يجب الغسل الا بالانزال كما في البهيمة والميتة نعم لو لم يعلم ما في نفس الامر الا بعد الوطء وجب الغسل فيما يظهر لانتفاء ما يفيد تصور السببية ج ۱ ص ۱۶۸،

(یہ بحث بحرالرائق والے کی ہے، اور اسی کو اسی طرح صاحب الحلیہ نے بھی لیا تھا، مگر ان کو اس میں تردد ہوگیا ہے، اور اس میں تفصیل کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ جیسے جن آدمی کی شکل میں ظاہر ہو اسی طرح انسانی مرد کے لئے کوئی جنّیہ (جن عورت) انسانی عورت کی شکل میں ظاہر ہو، اس (انسانی مرد) نے اس جنّیہ کے ساتھ وطی (ہمبستری) کی تو غسل واجب ہو جائے گا شکلوں کی مجانست کے سبب جو کمالِ سببیت کا فائدہ دینے والی ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو تب ہوگا جبکہ ان دونوں کے درمیان حقیقت میں معنوی تضاد نہ پایا جائے، اور اسی وجہ سے ان دونوں کے درمیان بعض فقہاء نے نکاح کے حرام ہونے کے لئے معنوی تضاد کو علت ٹھیرایا ہے، چاہئے تو یہ کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہ ہو جیسا کہ جانور اور (مُردار کے بارے میں حکم ہے، ہاں اگر اس کی حقیقت واقعی سے لاعلم ہے تو پھر وطی کے بعد غسل واجب ہو جائے گا، جیسا کہ سبب غسل میں کوتاہی کی مفید چیز کے معدوم ہونے سے معلوم ہو رہا ہے)

اس فرع وجوبِ غسل میں صرف مجانستِ صوریہ (شکل کی مشابہت) کا اعتبار کیا گیا ہے تو گنجائش ہے کہ جس طرح احکامِ وطی میں مجانستِ صوریہ (شکل کی مشابہت) کو معتبر قرار دیا گیا اسی طرح احکام سببِ وطی یعنی نکاح میں بھی اسی مجانستِ صوریہ کو کافی قرار دیا جائے،

جنسِ مخالف سے نکاح جائز ہونے کی ایک صورت

رہا مرد کا تشکّل (شکل اختیار کرنا) بصورتِ زن (عورت) یا بالعکس جو کہ قولِ حسنؒ پر وارد کیا گیا ہے تو اس کے حدوث نکاح (نکاح ہو جانے) سے مانع ہونے کا تو التزام کر لیا جائے، جس طرح ردالمحتار کی عبارتِ قریبہ کے اخیر یعنی لو لم یعلم

مانی نفس الامر الخ میں اس کو مؤثر سمجھا گیا ہے، لیکن لبقاءِ نکاح میں اس کو مانع (روکنے والا) نہ سمجھا جا جس کا راز یہ ہے کہ قوالب مختلفہ (مختلف شکلیں) جن کے لئے ایسی ہیں جیسے البسۂ مختلفہ (مختلف لباس) انسان کے لئے، پس اگر منکوحہ مرد کا لباس پہن لے یا سحر (جادو) سے مرد کی شکل بن جائے، پھر خواہ وہ شکل واقع میں ہو جائے یا محض متخیّل (خیالی) ہو جائے، کیونکہ سحر میں دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں تو نکاح باقی رہتا ہے، اسی طرح ما نحن فیہ (ہمارے زیرِ بحث مسئلہ) میں کہا جائے، رہا اس کا مقتضا کہ حدوثِ نکاح میں بھی مانع نہ ہو تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ متشکل بہ شکلِ مرد (آدمی کی شکل اختیار کرنے والا) واقع میں جنّیہ انثیٰ (جن عورت) ہے، تو نکاح کا محل (موقع) ہونا ہی مشکوک ہے، اور پہلے سے نکاح منعدم (غیر موجود) ہے، فلا ینعقد بالشک، (پس شک کی وجہ سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا) اور ایک بار جب حدوث ہو چکا تو تبدّل بہ شکل (شکل تبدیل کرنے) سے تیقنِ انعقاد (منعقد ہونے کے یقین) کے بعد زوال (زائل ہونا) مشکوک ہو گیا، فلا یزول بالشک (پس شک سے زائل نہیں ہوتا)

جنسِ مخالف سے نکاح کے مسئلہ میں احتیاط کی راہ اور ایک شبہ کا ازالہ

اور احقر کا وجدان ان احکامِ مذکورہ کے منشا کے باب میں یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان تمام احکام میں دلائل متعارض (ایک دوسرے سے ٹکرانے والے .....) ہیں، کما ظہر من تقریرنا فی کل مسئلۃ (جیسا کہ ہر مسئلہ میں ہماری تقریر سے ظاہر ہے) پس ہر مسئلہ میں احتیاط پر عمل کرنا چاہئے، چنانچہ غسل کے باب میں احتیاط وجوب میں ہے، اور نکاح کے باب میں احتیاط عدمِ جواز (جائز نہ ہونے) میں ہے، ولعلّ ہذا اقرب واصوب انشاء اللہ تعالیٰ،

اور اس قولِ جمہور یعنی مانعیت اختلاف الجنس عن التناکح (نکاح میں اختلافِ جنس کے مانع ہونے) پر جنت میں حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ نہ کیا جائے کہ وہ بھی جنس میں متخالف (انسانوں سے مختلف) ہیں، تو ان سے نکاح اور استمتاع (ہمبستر... ہونا) کیسے حلال ہوگا جس کی خبر قرآن مجید میں فرمائی گئی ہے،

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ط الطور، آیت ۲۰)	"اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں (یعنی حوروں) سے بیاہ کر دیں گے!"

دنیا اور آخرت کے احکام متماثل نہیں،

جواب شبہ کا ظاہر ہے کہ دنیا و آخرت کے احکام کا متماثل (یکساں) ہونا ضروری نہیں، یہاں مردوں کے لئے حریر ناجائز ہے، اور جنت

میں جائز ہوگا، اور راز اس میں یہ ہے کہ احکام دنیویہ کی جو علت (بنیاد) ہے وہ وہاں مرتفع (ختم) ہو جائے گی، چنانچہ حریر وحلیہ (ریشم وزیور) کی نہی کی علتِ تفاخر (فخر کرنا) ہے، سو جنت میں اس رذیلہ کا مادہ ہی منقطع (ختم) ہو جائے گا، اسی طرح ممکن ہے کہ یہاں اختلاف کا مانع عن النکاح ہونا معلل (نتیجہ) ہو علت عدمِ توافق وعدمِ تناسب (مزاج اور مناسبت میں یکساں نہ ہونے) سے جس کے سبب مصالحِ زوجیت فوت ہو جائیں گے، اور یہ علت جنت میں اس لئے مرتفع ہو جائیگی کہ وہاں خود انسان میں خواصِ بشریہ کی جگہ خواصِ ملکیہ (فرشتوں کے خواص) پیدا ہو جائیں گے، پس خواص میں یہ اور حوریں متکافی (باہم برابر) ہوں گے، اس لئے عدمِ توافق کا احتمال موافقت نہ ہونیکا شک) نہ رہے گا، البتہ جو امور قبیح لعینہ (اپنی اصل کے اعتبار سے برے ہیں) وہ جنت میں بھی نہ ہوں گے، کیونکہ ان کا قبح (برائی) ذاتی ہے، ان سے کسی موطنِ وجود (عالمِ وجود) میں منفک (علیحدہ) نہ ہوگا مثلاً مردوں کو جس غرض سے انعام میں حوریں ملیں گی اسی غرض سے عورتوں کو غلمان (لڑکے) دیئے جاتے، تو یہ انعام کے درجہ میں قبیح لعینہ (اپنی اصل کے اعتبار سے برا کام) ہے، کیونکہ انعام میں اکرام ہوتا ہے، اور فراش بننا اپنے مفضول (کمتر) کا اہانت ہے، اور مؤمنین ومؤمنات اہلِ جنت حور وغلمان سے درجہ میں مطلقاً افضل ہیں، اسی راز کے سبب زوج کا کفارت میں کم ہونا شرعاً معتبر ہے اور عورت کا کم ہونا معتبر نہیں، اس لئے اکرام کے موقع میں اہانت قبیح لعینہ (توہین اپنی اصل کے اعتبار سے برائی) ہے، اور انسیہ (انسانی عورت) کا انسان کے لئے فراش بننا اہانت نہیں، کیونکہ وہ من کل الوجوہ مفضول (ہر اعتبار سے کمتر) نہیں،

جنت میں لواطت نہ ہوگی اسی تقریر سے جنت میں لواطت کا نہ پایا جانا بھی محقق ہو گیا، اور بعض معتزلہ کا خلاف کرنا قابلِ التفات نہیں،

کما نقلہ فی ردالمحتار عن ابی علی بن الولید المعتزلی ونقل ایہ الرد علیہ عن ابی یوسف القزوینی بقولہ المیل الی الذکور عاھۃ وھو قبیح فی نفسہ لانہ محل لم یخلق للواطۃ ولھذا لم یجز فی شریعۃ بخلاف الخمر صفحہ ۲۴

جیساکہ ردالمحتار میں ابو علی ابن الولید معتزلی سے نقل کیا ہے، اور امام ابو یوسف قزوینیؒ سے اس کا رد بھی ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ مردوں کی طرف میلان ایک آفت ہے، اور وہ فی نفسہ ایک برا کام ہے، کیونکہ لواطت کے لئے یہ محل پیدا نہیں کیا گیا، اسی وجہ سے شراب کے برعکس اس کو کسی

وفی الدر المختار عن البحر حرمتها اشدّ من الزنا لحرمتها عقلاً وشرعًا وطبعًا والزنا لیس بحرام طبعا وتزول حرمته بتزوج وشراء بخلافها،

شریعت میں بھی مباح قرار نہیں دیا گیا، (ص ۲۴۰ ج ۳) اور درمختار میں بحرالرائق سے منقول ہے کہ لواطت کی حرمت زنا سے زیادہ سخت ہے کیونکہ لواطت طبعًا، شرعًا اور عقلاً حرام ہے، اور زنا طبعًا حرام نہیں اور اس (زنا) کی حرمت نکاح کے ذریعہ یا باندی خریدنے سے زائل ہو جاتی ہے، بخلاف لواطت کے کہ اس کی حرمت کسی حال میں زائل نہیں ہو سکتی"!

اور اس عبارت سے جنت میں انتفاء لواطت (لواطت کے نہ ہونے) کا ایک اور طریق سے بدلالۃ النص بھی ثابت ہوا یعنی وہ زنا سے اشد ہے، اور جنت میں زنا نہ ہونا یقینی ہے، تو جو حرمت و قبح میں اس سے اشد ہے وہ بدرجۂ اولیٰ منتفی (ناپید) ہوگا،

یہ ایک تفریع تھی اس قاعدہ پر جس سے جنت میں مرد کو حوریں دیئے جانے کا عورت کو غلمان دیئے جانے کے لئے مستلزم نہ ہونا ثابت ہے، اور اصلی مقصود جنیہ سے نکاح کے عدمِ جواز سے حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ کا دفع کرنا ہے، یہ ہے تحقیق قولِ جمہور کی متعلق مسئلہ عدم جوازِ نکاحِ جنیہ کے (جن عورت سے نکاح کے ناجائز ہونے کی)۔

قرآن پاک کو ماننے والا اللہ کی مخلوق جن کا انکار نہیں کر سکتا،

اور ہماری یہ تمام بحث شاید ان صاحبوں کو فضول معلوم ہو جو تعلیم جدید کے غلبہ سے خود جن کے وجود ہی سے منکر ہیں، لیکن جو شخص قرآن مجید کی تصدیق کرے گا، اور روات ثقات کثیر العدد (بے شمار انتہائی معتبر روایت کرنے والوں) کی بھی تکذیب نہ کرے گا، اس کو وجودِ جن کے قائل ہونے سے چارہ نہیں، پس اس حالت میں اس بحث کو فضول کہنا بناء الفاسد علی الفاسد (ایک غلط کی بنیاد دوسرے غلط پر رکھنا) ہے، ہمارے فقہاء نے بھی اس کو محسوس کر کے اس سے قصدًا بھی تعرض فرمایا ہے:

کمافی ردّ المحتار وما قیل من ان من سأل عن جواز التزوج بها الصفح بجهل وحماقة لعدم تصوّر ذلك بعید لان التصور ممکن لانّ تشکلهم ثابت بالاحادیث

(جیسا کہ ردّ المحتار میں ہے اور جو یہ منقول ہے کہ بعض لوگوں کا اس (جنیہ کے) نکاح کے جواز کا سوال کرنا اپنی جہالت و کم فہمی کے باعث اس لئے ہے کہ ان کے نزدیک کوئی شکل اختیار کر لینا ممکن نہیں بعید ہے، اس لئے کہ ان کا متشکل ہونا ممکن

والآثار والحکایات الکثیرۃ ولذٰ ثبت النھی من قتل بعض الحیات کما مرّ فی مکروھات الصلوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۴

. . . .
ہے، کیونکہ حکایات صحابہؓ . . . . اور احادیث سے جنات کا مختلف شکلیں اختیار کرنا ثابت ہے، اسی وجہ سے بعض اقسام کے سانپوں کو مار ڈالنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جیساکہ باب مکروہات صلوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۴ میں مذکور ہے''۔

ایک شبہ کا ازالہ

کیا تجانس امامت میں بھی شرط ہے؟

جس طرح تجانس باہم (ایک ہی جنس ہونا) نکاح میں شرط ہے شاید امامت میں بھی اس کو شرط قرار دیا جائے اور اس بناء پر جن کی امامت کو ناجائز سمجھا جائے، سو تحقیق یہ ہے کہ امامت میں اس کے شرط ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جن کا اقتداء (پیچھے نماز پڑھنا) اور اس پر آپؐ کی تقریر (یعنی اس پر آپؐ کا انکار نہ فرمانا اور باقی رہنے دینا) دلیل عدمِ اشتراط (شرط نہ ہونے) کی ہے، ورنہ عدمِ تجانسِ جانبین سے ہے، اور اس سے جواز اقتداء بالملائکہ (فرشتوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے جائز ہونے) کا شبہ نہ کیا جائے، کہ جبرئیل علیہ السلام فرائض میں امام بنے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، کیونکہ یہ امامت بعد فرضیت (فرض ہونے) کے ہوئی ہے،

جواب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام پر بوجہ مامور (حکمِ خداوندی کا پابند) ہونے کے خود ان دو یوم کی نماز فرض ہوگئی تھی تو وہ بھی مثل انس وجن (انسانوں اور جنوں کی طرح)، اس کے مکلف (پابند) ہوگئے تھے، اور اقتداء مفترض (فرض ادا کرنیوالے) مفترض کیساتھ ہوئی اور مطلقاً ملائکہ پر نمازیں فرض نہیں، اس لئے وہ متنفل (نفل پڑھنے والے) ہوں گے جو مانع اقتداء مفترض (. . . . فرض پڑھنے والے کی اقتداء کے لئے مانع) ہے،

مسئلہ زیرِ بحث میں ایک عجیب نکتہ

منکوحہ جنیہ کی اولاد کو جن اور منکوحہ آدمیہ کی اولاد کو آدمی کہیں گے،

اس تحقیق کا حاصل تو یہ تھا کہ تناکح انسان اور جن میں جائز نہیں لیکن یہ امر قابلِ تحقیق باقی رہا کہ اگر کسی نے باوجود ناجائز سمجھنے کے یا بوجہ مسئلہ معلوم نہ ہونے کے ایسا کرلیا، اور اس نکاح سے اولاد پیدا ہوگئی، گو

ظاہرًا بروئے طب مستبعد (طبی اعتبار سے ناممکن) ہے تو آیا بروئے قواعد شرعیہ (شرعی اصولوں کے مطابق) اس کو انسان کہا جائے گا یا جن، مثلاً خود ایسی اولاد کا نکاح آدمی و آدمیہ سے جائز ہو گا یا نہیں؟

سو حکم اس کا قواعد کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاد نسبًا باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے، لیکن اوصاف و اصناف (صفات اور نسل) میں تابع ماں کے ہوتی ہے، مثلاً اگر مرد آزاد ہو اور عورت مملوکہ (لونڈی ہو) اور ان میں نکاح ہو کر اولاد ہو تو وہ مملوک (غلام) ہو گی یا مثلاً نر ہرن اور مادہ بکری سے بچہ پیدا ہو تو وہ بکری سمجھی جائے گی، مثلاً قربانی اس کی صحیح ہو گی، وعلیٰ ہٰذا،

پس اس قاعدہ کا مقتضا یہ ہے کہ اگر منکوحہ جنیہ ہے تو اولاد کو جن کہیں گے، اور اس کا نکاح آدمی سے درست نہ ہو گا، اور اگر ناکح جن ہے اور منکوحہ آدمیہ تو اولاد کو آدمی کہہ کر اس کے احکام جاری ہوں گے، واللہ اعلم،

ایک علمی نکتہ

کسی پر ظلماً جن آنے کے وقت دوسری عورتوں کو پردہ کرنا چاہئے	اگر کوئی جن ظلماً کسی عورت کے پاس آتا ہو اور وہ اُس کے دفع پر کسی تدبیر مثل تعویذ و عمل وغیرہ سے قادر نہ ہو تو وہ مجبور ہونے کے سبب

معذور ہے، لیکن دوسری عورتوں کو جبکہ اس مظلومہ کے خبر دینے سے یہ اطلاع ہو کہ اس وقت وہ یہاں آیا ہوا ہے اس کے ساتھ مثل اجنبی مردوں کے معاملہ کرنا واجب ہو گا، یعنی اس کے سامنے بے پردہ ہونا درست نہ ہو گا، البتہ اگر مظلومہ کی اعانت یا دفعِ وحشت (مدد کرنے یا خوف دور کرنے) کی ضرورت سے وہاں رہنا ہو تو بجز وجہ و کفین و قدمین (سوائے چہرے، دونوں ہتھیلیوں اور دونوں پاؤں) کے باقی تمام بدن ڈھانکنا واجب ہو گا، یعنی سر و باز و گردن و ساق (پنڈلی) کا ظاہر کرنا درست نہ ہو گا ثقہ و صالحہ عورتیں بھی اس مسئلہ سے غافل ہیں،

واللہ اعلم والحمد للہ العلی الماجد علیٰ تحقیق ھٰذہ اللطائف التی لعلک لاتجدھا فی موضع واحد،

(اور اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، ان علمی نکات کی تحقیق پر جن کا ایک ہی جگہ اس طرح ملنا مشکل ہے اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہی سب تعریفیں ہیں")

کتبہ اشرف علی (نور اللہ مرقدہٗ)

اصلاحِ انقلاب متعلّقِ مہر

اس باب میں بھی متعدد مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں، لبعضہا اشد من لبعض (جن میں سے لبعض لبعض سے زیادہ سخت ہیں)۔

مہر بنصِ شارع حق واجب اور لازم ہے،

ایک کوتاہی جو لبعض وجوہ سے سب سے زیادہ سخت ہے، یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مہر ادا کرنے کا ارادہ ہی دل میں نہیں رکھتے، پھر خواہ جانب ثانی (یعنی بیوی) کبھی وصول کا ارادہ نہ کرے، اور خواہ کسی سبب عارض (پیش آنے والا واقعہ یعنی طلاق یا موت سے وہ (بیوی)، یا اس کے بعد اس کے ورثہ وصول کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہر حال میں زوج (شوہر) کی نیت ادا کی نہ ہو، سو لوگوں کی نظر میں یہ نہایت سرسری امر (معمولی معاملہ) ہے حتی کہ اس کا سرسری ہونا ان کی تصریحات سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ قلّت و کثرتِ مہر (مہر کے کم زیادہ ہونے) کی گفتگو میں بے دھڑک (بلا جھجک) کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے، کون دیتا ہے، خیر یہ بھی ایک بات ہے تو یہ لوگ اپنے اس اعتقاد کا صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے، دینے لینے کو اس سے کوئی تعلق نہیں، سو اوّل تو فی نفسہ بھی یہ دعویٰ غلط اور باطل ہے، مہر بنصِ شارع حق واجب اور لازم ہے، اور مثل دیگر دیون مفترض الاداء (دوسرے ان قرضوں کی طرح ہے جن کی ادائیگی بہرحال میں ضروری ہوتی) ہے، جب تک کہ کوئی مُسقِطُ... (گرانے والا یعنی ختم کرنے والا) اس کا نہ پایا جائے، مثل ابراءِ (معافی) یا اس کے جز یا کُل کا زوج کو میراث میں پہنچ جانا، یا طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے طلاق) نصف مہر کے لئے وغیرہ ذلک من اسباب المذکورۃ فی کتب الفقہ (اور اسی طرح کے دوسرے اسباب جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں)

بہرحال وہ فی نفسہ (اپنی ذات میں) واجب الاداء ہے، دوسرے موقع پر خود یہ مدعی (دعویٰ کرنے والے) ہی اپنے فعل سے اس قول کی تکذیب کرنے لگتے ہیں، یعنی جب اُن کی متعلقہ کا جبکہ وہ معلّقہ یا مطلقہ (ویسے ہی ترکِ تعلق کر رکھا ہو یا طلاق یا فتہ ...) ہو جائے کوئی معاملہ پیش آتا ہے

تو سب سے اوّل یہی مدعی اس مہر کے لزوم (ضروری ہونے) کے مدعی بن جاتے ہیں،

بہرحال اس کے سرسری ہونے کا دعویٰ تحقیقاً والزاماً (تحقیق اور لازم ہونے کی رُو سے) ہر طرح غلط ہے، مگر پھر بھی بمجوائے يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (اپنے مُنہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں) عام طور سے اُس کا سرسری ہونا زبان زد (مشہور) ہو گیا ہے،

دل میں مہر ادا نہ کرنے کی نیت ہو تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا

سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو سرسری سمجھنا اور ادا کی نیت نہ رکھنا اتنی بڑی سخت بات ہے کہ حدیث شریف میں اس پر بہت ہی بڑی وعید آئی ہے، چنانچہ کنز العمال بروایت ابو یعلی وطبرانی ورافعی وابن النجار وابن عساکر وبیہقی کے حضرت صہیبؓ سے بروایت ابن مندہ کے میمون بن جابان البصری عن ابیہ سے باختلاف بعض الفاظ یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کا کچھ مہر ٹھہرائے پھر یہ نیت رکھے کہ اس کے مہر میں سے اس کو کچھ نہ دے گا، یا اس کو پورا نہ دے گا تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا اور اللہ تعالیٰ سے زانی ہو کر ملے گا، (جلد ۸ صفحہ ۲۴۸)

سو ملاحظہ کیجئے کہ کتنی بڑی سخت وعید[1] ہے کہ باوجود صورتِ نکاح پھر اس شخص کا شمار زانیوں میں ہوا تو کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک (تلافی کے قابل) نہیں ہے، اور ہر چند کہ عمل میں اور وعید میں وجہِ تعلّق معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن تبرعًا (بطور بھلائی) ایک ظاہری وجہ پر متنبّہ بھی کرتا ہوں، اس سے پہلے ۲ مقدمے جاننا چاہئے،

نکاح اور زنا میں فرق،

ایک یہ کہ بتصریح حدیث نکاح اور زنا میں مابہ الفرق (فرق کرنے والے) یہ امور ہیں، ولی بعض صورتوں میں اور دو گواہ اور مہر، جاء فی الروایات مصرحاکن انی کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۹ و ۲۹۶ و ۲۹۷ فی شهادة رجل وامرأة بطلها عمر،

کوئی عملِ شرعی بدون نیت عنداللہ معتبر نہیں،

دوسرا یہ کہ مہر مقرر کرنا ایک عمل ہے، اور جب نیت دینے کی نہ ہو تو یہ مقرر کرنا معتبر نہ ہوا، للمقدمة الثانية (اس دوسرے مقدمہ کی رُو سے) پس گویا مہر مقرر ہی نہیں ہے، اور مہر مقرر نہ کرنا خاصہ زنا کا ہے، للمقدمة الاولیٰ (مقدمہ اوّل کے اعتبار سے) پس اس حیثیتِ خاص سے یہ نکاح مشابہ زنا کے ہوا، اس لئے ناکح کو زانی فرمایا گیا، مراد

---

[1] گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ؎ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کے مصداق بننے سے گریز کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہئے ۱۲ احقر قریشی،

یہ کہ مشابہ زانی کے ہے، جس کی وجہ ابھی مذکور ہوئی، اور اس تقریر سے وجہِ وعید بھی معلوم ہوئی، اسی طرح اس حدیث کی شرح اور توجیہ بھی ہوگئی،

مہر ادا نہ کرنے کی نیت رکھنے والا خائن اور چور بھی ہے،

نیز اسی حدیث مذکور میں ایک جزو اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر کسی سے کچھ مال خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے، یا کسی کا کچھ دَین (ذمہ میں واجب) ہو اور وہ اس کے ادا کی نیت نہ رکھے، یا کسی سے کچھ قرض لیا ہو اور اس کو ادا نہ کرنا چاہتا ہو، تو وہ شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خائن (خیانت کرنے والا) اور چور ہوگا، اور ظاہر ہے مہر ایک دین (ذمہ میں واجب حق) ہے، جب اس کے ادا کی نیت نہ ہوئی تو حدیث کے اس دوسرے جزو کے اعتبار سے یہ شخص خائن اور چور بھی ہوا تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوئے، زانی ہونے کا للجزء الاوّل (پہلے جزو کی رُو سے) اور خائن و سارق ہونے کا للجزء الثانی (دوسرے جزو کے اعتبار سے) اور اس عمل میں اور اس کی وعید میں وجہِ تعلق اوّل کی طرح مخفی (پوشیدہ) نہیں، بلکہ ظاہر ہے، کیونکہ کسی کے حق مالی کو ضائع کرنا ظاہر ہے کہ خیانت و سرقہ (چوری) ہے، جب ایک ہی وعید کے ترتب (مرتب ہونے) پر میں نے اوپر کہا ہے کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک نہیں؟ اب تو دو وعیدوں کا ترتب ثابت ہوگیا، اب زیادہ زور کے ساتھ کہا جائے گا کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک نہیں؟

اپنی وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے،

سو اس کا تدارک ظاہر ہے، کہ ادا کرنے کی مصمم نیت (پکی نیت) رکھی جائے مگر تجربہ اور وجدان شاہد ہے کہ بعادت اکثر (اکثر عادت کے مطابق) یہ مصمم نیت اسی عمل ہو سکتی ہے جس پر عادۃً قدرت ہو، ورنہ نیت کا محض تخیّل (خیال) ہوتا ہے تحقق (وقوع) نہیں ہوتا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو سَو روپیہ دینے کی قدرت نہ ہو وہ عادۃً لاکھ سوا لاکھ بلکہ دس ہزار پانچ ہزار دینے پر بھی قادر نہیں، جب قادر (ادائیگی کی طاقت رکھنے والا) نہیں تو بحکم مقدمۂ مذکورہ (مذکورہ مقدمہ کے مطابق) وہ اس کے ادا کی بھی نیت نہ رکھے گا، پس اگر اگر ایسے شخص کا اتنا مہر مقرر ہوا تو وہ ادا کی نیت نہ رکھنے کے سبب لامحالہ (ضرور) اس وعید کا محل (موقع) بنے گا، پس نیت ادا کے تحقق کی صورت میں بناء برتقریر مذکورہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اور چونکہ وسعت اکثر لوگوں کو اکثر زمانوں قلیل (کم) ہے، اس لئے اسلم و احوط طریقہ (زیادہ سلامتی والا اور محتاط طریقہ) یہی ٹھہرا کہ مہر قلیل ہو،

احادیث میں مہر زیادہ مقرر کرنے کی کراہت اور کم مقرر کرنے کی ترغیب آئی ہے ،

پس مہر کا کثیر تعداد میں مقرر کرنا ایک کوتاہی ہے، جس پر پہلی کوتاہی ملزوم عادی (عام طور پر پائی جانے والی)

مرتب ہوتی ہے، اسی واسطے حدیثوں میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہت (ناپسندیدگی) اور کم ٹھہرانے کی ترغیب (پسندیدگی کی طرف توجہ) آئی ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا کہ مہروں میں زیادتی مت کرو، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کی بات یا اللہ کے نزدیک تقوے کی بات ہوتی تو سب زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کسی بی بی کا اور اسی طرح کسی بیٹی کا مہر بارہؔ اوقیہ سے زیادہ نہیں ہوا، (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، اور ایک درہم تقریبًا چار آنہ چار پائی کا) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کا مبارک ہونا یہ بھی ہے کہ اس کا مہر آسان ہو،

اخرجہما فی کنز العمال عن عب ط و والحمیدی ص وابن سعد وابی عبید فی الغریب ش حم والعدنی والدارمی دت وقال صحیح ن ع حب کر قط فی الافراد حل ق، ص ۲۹۷ والثانی عن حم ک ھق، ص ۲۳۹

اور ایک حدیث میں ہے کہ اچھا مہر وہ ہے جو آسان اور قلیل ہو، (کنز العمال، ص ۲۴۸) اور حدیث میں ہے کہ آسانی اختیار کرو مہر میں (کنز ۲۴۹) اور اگر حضرت عمرؓ کی روایت پر کسی کو عجوزہ (بڑھیا) کے معارضہ مشہورہ (مشہور اعتراض) کے بعد حضرت عمرؓ کے رجوع کا شبہ ہو تو جواب اس کا یہ ہو کہ یہ رجوع اس کی ترجیح یا اس کی ضد سے کراہت نہیں ہے، بلکہ پہلے حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہو گئی تھی کہ اس کو ایک قانون بنادیں، کہ مقدار خاص سے زیادہ مقرر کرنا باطل قرار دیا جائے، اور اس کو واجب ہی نہ کہا جائے، سو اس سے آپ نے رجوع فرمالیا، یعنی ایسا قانون نہیں بنایا، اس توجیہ میں روایات مصرح ہیں، وہ روایات ان نمبروں کی کنز العمال میں مذکور ہیں ۵۱۰۶، ۵۱۰۰، ۵۱۰۸، ۵۱۰۹ وغیرہا، ص ۲۹۸ ج ۸)

اپنی ہمت سے زیادہ مہر قبول کرنا شرعًا منع ہے،

غرض دلائل صریحہ مرفوعہ و موقوفہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے اقوال) سے نیز قواعد شرعیہ سے کہ تحمل مالا یطیق (اپنی طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھانے) سے ممانعت آئی ہے، کما فی حدیث :-

رواہ الترمذی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یُذِلُّ	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ وہ اپنے آپ کو کس طرح؛ ہیں

نَفْسَهٗ قَالَ يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَالَا يُطِيْقُهٗ ،

کرتا ہو؟ ارشاد فرمایا ایسی مصیبت کو اٹھاتا ہے جس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا"،

تحمل سے زیادہ مہر کے التزام (مقرر) نہ کرنے کا اور اس کی تقلیل (کم ہونے) کا مطلوب شرعی ہونا ثابت ہوگیا،

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے

اب یہ کلام باقی رہا کہ اس تقلیل کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں؟ سو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو اسکی کوئی حد مقرر نہیں، قلیل سے قلیل مقدار بھی مہر بن سکتا ہے، بشرطیکہ مال متقوم (قیمت والا مال) ہو، خواہ ایک ہی پیسہ ہو، اور احادیث کثیرہ (بہت سی حدیثوں) کے ظاہر الفاظ اس کے موافق ہیں، مثلاً (یتزوج[1] بقلیل او کثیر) اور (ولو بسوط[2])، اور (ولو بخاتم[3] من حدید) اور (ملء[4] کفیه برا او سویقا او تمرا او دقیقا) اور (او بدرهم[5]) اور (ما تراضی[6] به الأهلون ولو قبضة من اراك) اور (ملأ[7] یدیه طعاما) (کنز العمال ص ۲۴۸ و ۲۴۹) اور (تزوج[8] علی نعل ص ۲۹۹)، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس قلیل کی حد دس درہم ہیں یعنی اس سے کم مہر جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر تصریحاً بھی اس سے کم مقرر کیا جائے گا، تو بھی دس درہم واجب ہوں گے، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں یہ حدیثیں مع تضعیف (ضعف کے ساتھ) مشہور ہیں،

عن جابر لا صداق اقل من عشرة دراهم قسطق وضعفاه وعن علی قال اوفی ما یستحل به الفرج عشرة دراهم ق وضعفه وعن علی قال لا صداق دون عشرة دراهم قطق وضعفه ،

"حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ وہ مہر نہیں جو دس درہم سے کم ہو، اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ فرمایا کہ کم از کم جس سے فرج حلال ہو سکتی ہے دس درہم ہیں، اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور حضرت علیؓ سے ہی مروی ہے کہ دس سے کم مہر نہیں اسے بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے"

---

[1] نکاح کرے کم یا زیادہ مہر کے ساتھ۔ [2] خواہ ایک کوڑا ہو، [3] خواہ لوہے کی انگشتری ہو، [4] خواہ دونوں ہتھیلیوں میں گندم یا ستو یا کھجور یا آٹا بھرا ہو، [5] یا ایک درہم ہو، [6] خواہ اس کے قبضہ میں پیلو کے درخت کا پھل ہو، [7] خواہ دونوں ہاتھ کھانے سے بھرے ہوں، [8] یا جوتا مہر مقرر کر کے شادی کی ۱۲

مگر صاحبِ فتح القدیر نے اس حدیث کا ایک طریقِ حسن نقل کیا ہے، اس کی عبارت ہے: رواہ ابن ابی حاتم بسندٍ حسن کما قالہ ابن حجر (ابن ابی حاتم نے سندِ حسن سے روایت کیا جیسا کہ ابن حجر کا قول ہے) اور مزید تحقیق اس کی احیاء السنن اور اس کی تعلیق میں ہے، باقی تمسکات شافعی (امام شافعی کے دلائل) کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ وہ سب مہر معجل (وہ مہر جو نکاح کے بعد مدتِ معین میں ادا کردیا جائے) پر محمول ہیں، چنانچہ بعض روایات کے الفاظ اس کا قرینہ بھی ہیں:

فی کنز العمال عن ابن عباس قال اذا تزوج المرأۃ فان استطاع ان لا یدخل علیہا حتی یعطیہا شیئًا فان لم یجد الا احد نعلیہ فلیخلعہا فلیعطہا ایاھا۔ (ابن جریر، ص ۲۹۹)	(کنز العمال میں حضرت ابو العباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا جب کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے، سو اگر وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے کہ عورت کے پاس اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اسے کوئی چیز نہ دے، اور اس کے پاس دینے

کے لئے سوائے ایک جوتے کے کچھ نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ جوتہ اُتار کر اس عورت کو دیدے)

اور چونکہ متمسک امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے مدلول میں اصرح ہے، بہ نسبت متمسکات شافعیؒ کے، اس لئے صریح میں تاویل مناسب نہیں ہوئی، یہ کلام تو عالمانہ ہے،

موضعِ اختلاف میں احوط پر عمل زیادہ مناسب ہے

باقی عاملانہ تقریر یہ ہے کہ موضعِ اختلاف (اختلاف کی جگہ) میں احوط (زیادہ احتیاط) پر عمل مناسب ہے، تو دس دراہم[1] سے کم کا جواز تو مختلف فیہ (جائز ہونا تو اختلافی مسئلہ) ہے، اور دس درہم کا جواز متفق علیہ (جائز ہونے پر سب کا اتفاق) اس لئے احوط یہی ہے، اور یہ احتیاط ایسی ہے جیسے نصابِ سرقہ (چوری کے نصاب) میں ایک قول ربع دینار یعنی اڑھائی درہم ہے، اور ایک قول دس درہم، پس ربع دینار نصاب مختلف فیہ ہوا، اور دس درہم متفق علیہ، پس دس ہی درہم لینا احوط ہے، اور اس سے کم میں مختلف فیہ ہونے سے شبہ ہوگیا کہ موجبِ حد (حدِ شرعی واجب کرنے والا) ہے یا نہیں؟ اور شبہ دافعِ حدود ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں قطع نہ کرنا (ہاتھ نہ کاٹنا) احوط ہوا، پس مہر میں تو دس درہم کو اقل نصاب (کم از کم نصاب) ٹھہرانا احوط ہوا

---

[1] موجودہ دور میں دس درہم کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ۲ تولہ ۸ ماشے ۵ رتی چاندی کی قیمت لگائی جائے، جو دس درہم کے برابر ہوگی، (بلکہ احتیاطاً اس میں ایک تی ایک ماشا شامل کی گئی ہے)، بندہ احقر قریشی غفرلہٗ

اور دس درہم نصابِ سرقہ ہونا یہ بھی وجداناً مؤید (عقلاً تائید کرنے والا) معلوم ہوتا ہے، قول امامؒ کا، کیونکہ اس سے ایک عضو یعنی ہاتھ کی قیمت کا کم از کم دس درہم ہونا معلوم ہوا، تو بضع زن (عورت کے عضو مخصوص) کی قیمت بھی اس سے کم نہ ہوگی، وتفطن لہ صاحب الہدایہ فی الہدایہ۔ بہر حال احتیاط بہت سے بہت اس سے کم نہ کرنے کو مقتضی ہوگی، لیکن یہاں تک تو کمی کرنے کا بالاتفاق اختیار ہے، پھر زیادتی پر کیا مجبوری ہے؟

مہر زیادہ مقرر کرنے کی دنیوی خرابیاں

اوپر تو بیان تھا کثرتِ مہر کی دینی خرابی کا کہ فی نفسہ (اپنی ذات میں) بھی خلافِ سنت ہے، اور پھر وہ سبب ہو جاتا ہے عدم قصد ادا، (ادا نہ کرنے کا ارادہ) جس پر اس شخص کو گناہ میں زانی سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس کے علاوہ اس میں جو دنیوی خرابیاں ہیں وہ آنکھوں سے نظر آتی ہیں، مثلاً بہت جگہ موافقت نہیں آتی اور زوجہ کے حقوق نہیں ادا کئے جاتے، مگر طلاق اس لئے نہیں دیتے کہ مہر زیادہ ہے، یہ لوگ دعویٰ کرکے پریشان کریں گے، پس کثرتِ مہر بجائے اس کے کہ عورت کی مصلحت کا سبب ہوتا اُلٹا اس کی کلفت کا سبب ہوگیا، بعض عقلاء اس کثرت میں یہی مصلحت سمجھتے ہیں کہ چھوڑ نہ سکے گا، مگر یہ نہیں سمجھتے کہ چھوڑ نہ سکنا ہر جگہ تو مصلحت نہیں، مثلاً اس صورتِ مذکورہ میں اس میں کیا مصلحت ہوئی، اور مثلاً بہت جگہ بعد طلاق یا موت دعویٰ ہوا ہے، اور چونکہ تعداد میں لاکھوں تک ہوا ہے تمام جائداد سب کی نذر ہو جاتی ہے، اور زوج یا اس کے ورثہ اس کی بدولت نان شبینہ (رات کے کھانے تک) کے محتاج ہو جاتے ہیں، پس دینی و دنیوی خرابیوں کے مجموعہ سے وہ مضمون صادق آتا ہے:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج، آیت ۱۱)	"دُنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا یہی کھلا خسارہ ہے۔"

اور یہ سب خرابیاں تو کثرتِ مہر کی اس وقت ہیں جب ادا نہ کیا جائے، یا ادا کا ارادہ نہ ہو، اور اگر مرد پر خدا کا خوف غالب ہوا اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق) سے اُس نے سبکدوش (فارغ) ہونا چاہا اور ادا کا قصد کیا، تو اس وقت یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ اتنی مقدار کا ادا کرنا اس کے تحمل سے زیادہ ہوتا ہے تو اس پر فکر اور تردّد کا بارِ عظیم پڑتا ہے، اور کما کما کر ادا کرتا ہے، مگر مقدار زیادہ ہونے سے وہ ادا نہیں ہوتا، اور تمام تر اس کا ذخیرہ اسی میں کھپتا چلا جاتا ہے اور طرح طرح کی تنگی برداشت کرتا ہے، پھر اس سے دل میں تنگی اور پریشانی ہوتی ہے، یہ تو مرد کی تکلیف ہوئی، پھر چونکہ سبب اس تمام تر تکلیف کا وہ عورت ہے اس لئے انجام کار (نتیجہ میں)

اس مرد کے دل میں اس سے انقباض (کھنچاؤ) پھر انقباض سے تنفّر (نفرت) پھر عداوت (دشمنی) پیدا ہو جاتی ہے، پس جو نکاح کہ موضوع تھا مصالحِ زوجین اور اتحادِ باہمی کے لئے وہ بالواسطہ اس کے ایک حقِ خاص یعنی مہر کے اس طریق پر سبب ہو گیا اس کے ضد یعنی عداوت وکدورت (دشمنی اور نفرت کا) پس یہ صریح قلب موضوع (اُلٹا معاملہ) ہے جس کا سبب کثرتِ مہر کی ہے، پس قلبِ موضوع جب قبیح (خرابی) ہے اس کا سبب بھی قبح (خرابی) سے خالی نہ ہوگا، اس حدیث کا یہی مطلب ہے:۔

تیاسروا فی الصداق فان الرجل لیعطی المرأۃ حتّٰی یبقی ذلک فی نفسہ علیہا حسیکۃ رعب الخطابی من الخرائط عن ابن حسین مرسلاً کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۹ ،	(مہر کے اندر آسانی رکھو، اختیار کرو اس لئے کہ مرد عورت کو (زیادہ مہر دے) بیٹھتا ہے، حتّٰی کہ اس دینے سے اس کے نفس کے اندر عورت سے متعلق دشمنی باقی رہ جاتی ہے) (کنز العمال ص ۲۴۹))

اور اوپر جو خطبہ حضرت عمرؓ کا گذرا اس میں یہ بھی ہے:۔

ان احدکم لیغلی صدقۃ المرأۃ حتّٰی یکون لہا عداوۃ فی نفسہ الخ	(تم میں سے کوئی عورت کو کثیر مہر ادا کرتا ہے، یہاں تک مرد کے دل میں عورت کے لئے عداوت بیٹھ جاتی ہے))

چنانچہ خود مجھ کو اس کا اندازہ ہوا کہ میری ایک اہلیہ کا مہر پانچ ہزار اور دوسری کا پانچ سو تھا، بفضلہ تعالیٰ دونوں ادا کئے گئے، مگر اول مہر کے ادا میں جو کچھ گرانی ہوئی اگر والد صاحب مرحوم کا ذخیرہ اس میں اعانت نہ کرتا تو وہ گرانی ضرور کدورت کی صورت پیدا کرتی، اور دوسرا مہر صرف فتوحاتِ یومیہ کی آمدنی سے بہت آسانی سے ادا ہو گیا، اس کا کوئی معتد بہ (قابلِ ذکر) بار قلب پر نہیں پڑا، پھر اگر اس کوشش پر بھی ادا نہ ہو سکا، تو نفس میں ایک دوسری کم ہمتی جو خلافِ غیرت ہے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ عورت سے معاف کرایا جائے، پس اس سے درخواست کی جاتی ہے، سو اوّل تو اس درخواست کا پورا کرنا اس کے قبضہ میں ہے، اگر وہ پورا نہ کرے اس کو اختیار ہے، دوسرے خود یہ درخواست ہی ذلت سے خالی نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے جہاں برآت (سبکدوش ہونے) کی دو صورتیں فرمائی ہیں:۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ آیت ۲۳۷)	(مگر یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کر دیں یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق ہے (بیان القرآن))

اس کے بعد ہی دوسری صورت کی ترجیح کی تصریح ہے؛

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ، "اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے"،

اور اس کے ساتھ ہی پہلی صورت کی اباحت (جائز ہونا) بھی عام مفہوم سے ارشاد فرمادی ہے؛

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ، "اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو"،

جس کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ پہلی صورت باوجود مباح ہونے کے مرجوع (ناپسندیدہ) ہر لکونہ ابعد من الغیرۃ (کیونکہ یہ غیرت کے خلاف ہے) تو دیکھئے یہی کثرت بعض صورتوں میں اخلاقی کمزوری کا بھی سبب بن گئی، جو کہ پسندیدہ نہیں سمجھی گئی، اور یہ بھی اُس وقت تک ہر جبکہ مرد اس طلبِ معافی میں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا لحاظ رکھے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا الخ

معافیِ مہر میں طیبِ نفس سے معاف ہونا شرط ہے، یعنی طیبِ نفس (دل سے راضی ہونے) کی رعایت کرے، ورنہ اگر غیرت کے ساتھ خشیت (خوفِ خدا) بھی مفقود ہے تو وہ صرف لفظی معافی کی ناجائز تدبیریں نکالے گا، یعنی یا عورت کو دھوکہ دے گا یا اس کو دھمکا دے گا، اس پر جبر کرے گا، جس سے وہ معاف کر دے، مگر یاد رہے کہ ایسی معافی عند اللہ ہرگز معتبر و مقبول نہیں، اس صورت میں یہ عند اللہ علیٰ حالہ مشغول الذمہ (اللہ کے نزدیک اپنی ذمہ داری کے بوجھ تلے) رہے گا، اور اگر اس کو غیرت بھی ہوئی اور خشیت بھی ہوئی مگر وسعت نہ ہوئی تو اس کی پوری مصیبت ہے کہ تمام عمر اسی میں گھلا کیا، کہ میں کس طرح اس حق سے سبکدوش (فارغ) ہوں، دیکھئے اس کثرت سے کیسے پھل پھول کھلے ہیں، گو اس صورت میں اگر یہ نیت مصمم (پکی) رہی کہ جب ہوگا اور جتنا ہوگا ضرور دے گا اور تھوڑا تھوڑا دیتا بھی رہا مگر پورا نہ ہو سکا، تو آخرت میں امید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا، لیکن اس بے چارہ کی دنیوی زندگی تو تلخ ہوگئی، اور جب شوہر کی زندگی تلخ ہے تو بی بی کی زندگی کیا بالطف ہو سکتی ہے، غرض اس میں ہر طرح کی خرابی ہی خرابی ہے،

زیادہ مہر مقرر کرنے کے سب مصالح موہومہ ہیں: اگر کسی شخص کو وسوسہ ہو کہ بعضے مفاسد (کچھ خرابیاں) قلیل میں ہیں، اور بعضے مصالح (کچھ مصلحتیں) کثیر میں ہیں، مثلاً اگر مہر قلیل ہو تو شوہر پر کوئی بار نہیں پڑتا اس کو کوئی امر اس سے مانع نہیں ہوتا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کرلے، تو کثرت میں ذرا رکاوٹ رہتی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ بہت ہی قلیل ہو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتنا کثیر (زیادہ) نہ ہو جو اس کی دینی و دنیوی تباہی کا سبب بن جائے، عدمِ ادا کی نیت میں بھی ادا کی کوشش میں بھی، اور ابراء (بری ہونے) کی تدبیر میں بھی، بلکہ اس میں اعتدال ہو جس میں تمام مصالح محفوظ رہیں، دوسرے جس شخص کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو کوئی چیز کسی امر سے نہیں روک سکتی، کیا ایسے واقعات پیش نظر نہیں ہیں کہ بڑے بڑے مہروں کے مدیون (مقروض) ہیں اور باوجود اس کے منکوحہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتے اور نہ دوسری طرف ملتفت (متوجہ) ہونے سے رُکتے ہیں خواہ وہ حلال ہو یا حرام، ایسے ظالموں کا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا، خواہ اس وجہ سے کہ وہ صاحبِ وجاہت (بارعب شخصیت) ہے، اس سے ڈرتے ہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، اور نرا جیل خانہ کرانے سے کیا ملتا ہے، پھر داماد کے جیل جانے سے اپنی بیٹی کو کیا آرام ملا،

کثرتِ مہر محض رسم پرستی ہے، جس میں کوئی مصلحت نہیں،

بعضے لوگ اس میں مصلحت یہ بیان کرتے ہیں کہ قلت میں ذلت ہے اور کثرت میں عزت، سو اوّل تو مہر قلت میں جب کہ درجۂ اعتدال پر ہو ذلت نہیں، دوسرے اگر یہ مصلحت بھی ہوئی مگر مفاسد بے تعداد (بے شمار) ہوئے تو وہ مصلحت کب قابلِ تحصیل (حاصل ہونے کے قابل) ہوگی، تیسرے اگر تحصیلِ مصلحت تفاخر کے ساتھ قدرت علی الاداء (اظہار فخر کے ساتھ ادا کرنے کی قوت) کی کچھ بھی رعایت نہ ہو تو بقول میرے استاذ[1] علیہ الرحمۃ کے پھر اسی مقدار پر کیوں بس کی جاتی ہے؟ اس سے زیادہ مقدار میں اس سے زیادہ عزت اور فخر ہے، تو بہتر ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا خراج بلکہ اس کا بھی مضاعف (دوچند) یا اضعافاً مضاعفۃً (چند در چند) مقرر کیا جائے کیونکہ نہ دینا نہ لینا، صرف نام ہی نام تو اچھی طرح سے کیوں نہ نام کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رسم پرستی ہے، ورنہ واقع میں مصلحت کچھ نہیں اور مفاسد متنوع (خرابیاں قسم قسم کی) ہیں، لہٰذا اس کے واجب الاصلاح (اس کی اصلاح ضروری) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، پس رسم کو چھوڑو، اور عقل و شرع کا اتباع کرو، البتہ جن صورتوں میں مہر مثل سے کم کا مقرر کرنا ولی کو جائز نہ ہو جیسا فروع فقہیہ (فقہی احکام و مسائل) میں مذکور ہے، وہاں اس پر عمل کی یہ صورت ہے کہ سب متفق ہو کر اپنے عرف کو بدلیں، جس سے خود قلیل ہی مہر مثل بن جائے، بہرحال یہ صورت بھی اشکال کی نہیں جس سے کوئی نیم مُلّا شبہ کر سکے،

---

[1] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۰۲ھ) (جواہرات یعقوبی حصہ اوّل ص۱۱) احقر قریشی

مہر مقرر کرتے وقت مقدار کا تعین کرنا ضروری ہے ،

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ بعضے لوگ بدون ذکر مقدار کے محض شرع محمدی کے عنوان سے مہر ٹھیراتے ہیں، اور پھر اس کے مفہوم کی تعیین میں کوئی اصطلاح بھی بیان نہیں کرتے، تو اس طرح کا ٹھیرانا بجائے نہ ٹھیرانے ہی کے ہے اور مہر نہ ٹھیرانا گناہ ہے، جیسا اوپر مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہونے میں مشابہ زنا کے قرار دینے کی تقریر میں گزر ہوا ہے، پس یہ گناہ کے مرتکب ہوئے، پھر اگر کسی وقت وصول کے لئے نزاع (جھگڑا) ہوا تو کیا مقدار ادا کی جائے گی، اور چونکہ قوم کی قوم میں یہی رسم ہے، اس لئے مہر مثل کی تحکیم (فیصلہ) بھی دشوار ہے، پس اس ابہام میں یہ خرابیاں ہیں، اور اسی قبیل (قسم) سے ہے وہ رسم جو بعض نواح (نزدیکی علاقوں) میں معلوم ہوئی ہے کہ سوا سیر کودوں کے عنوان سے مہر ٹھیراتے ہیں، جس کی شرح تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوئی کہ سوا سیر کودوں کی جس قدر شمار ہے اتنے شمار سے روپے ہوں، سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین (مقررہ) شمار نہیں ہے، اگر سوا سیر کودوں کے دو انبار (ڈھیر) ہوں، یقیناً ان کے شمار میں تفاوت بھی ہوگا، پس یہ بھی مبہم رہا، اور اس میں بھی مذکورہ خرابیاں ہوئیں، اور علاوہ ان کے کثرتِ مقدار کی خرابی مزید برآں (اس کے علاوہ) ہے،

مہر مقرر کرنے کے لئے مال ہونا شرط ہے،

اور ان سب سے بڑھ کر بعض جگہ یہ بیہودگی سننے میں آتی ہے کہ مہر میں مچھر اور پسّو اور کھٹمل کئی کئی مٹکے ٹھیراتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مہر ایسا ہو کہ اس کے ادا پر کبھی قدرت ہی نہ ہو، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے لئے مال ہونا شرط ہے، یہ چیزیں جب مال نہیں ہیں تو واجب فی الذمہ (ذمّہ میں واجب) بھی نہیں ہوتی، ان کا ذکر و عدم ذکر (ذکر کرنا یا نہ کرنا) برابر ہے، اور تغییر شرع (شریعت کو بدلنے) کا گناہ الگ رہا،

بعد وفاتِ شوہر زوجہ کو مہر میں تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ پر قبضہ کرنا شرعاً صحیح نہیں ،

ایک کوتاہی دربارۂ مہر کے زوجہ کی طرف سے یہ ہے کہ اکثر بعد وفاتِ زوج کے اس کی تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ میں سے جس جس سے قبضہ ہو سکے سب پر قبضہ کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتی ہیں کہ یہ سب میں نے اپنے مہر میں رکھ لیا، اگرچہ وہ قیمت میں مہر سے کئی حصّے زیادہ ہو، سو سمجھ لینا چاہئے کہ جب یہ اشیاء جنس مہر سے نہیں ہیں تو اس کو خود مہر میں لگا لینا جائز نہیں، بلکہ اس کے لئے یا تو حکم حاکم کی ضرورت ہے، اور یا دوسرے ورثاء کی رضامندی کی بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو، اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس میں خاص نابالغ کے حصّے کے اعتبار سے پھر بھی شرط ہے کہ جائیداد قیمت میں مہر سے اس قدر زیادہ نہ ہو کہ اس کو سب مقوّمین (قیمت لگانے والے) زیادہ بتلاتے ہوں، البتہ جہاں دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں، کہ

نہ حاکم سے رجوع کرنے کا سامان ہو اور نہ ورثہ اس کا حق دینا چاہتے ہیں، اس خاص صورت میں اگر اس کو قدرت ہو جائداد مہر میں لگا سکتی ہے، بشرطیکہ جائیداد مہر کے برابر ہو، اصل میں یہ عملی فرع ہے خلاف جنس سے اپنا حق لے لینے کی اس میں بھی تفصیل ہے،

مہر سے متعلق شوہر کی کوتاہیاں ایک کوتاہی اس کے مقابل زوج (شوہر) کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ اپنی رائے سے زوجہ (بیوی) کو کوئی چیز خواہ قسم زیور سے یا پارچہ و متاع (کپڑے اور سامان) سے یا مکان اور زمین بی بی کو دیدے اور اس کے نام کر دے اور خود بھی نیت کرے کہ میں مہر میں دے چکا، اور مہر ادا کر دیا، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے عوض (بدلہ) میں یہ چیزیں دینا بیع (خرید و فروخت) ہے، اور بیع میں تراضی جانبین مطلقاً شرط (دونوں طرف سے مکمل شرط) ہے، اور بعض میں تساوی مقدار میں (مقدار میں برابری) بھی شرط ہے، پس اگر ان چیزوں کا دینا مہر میں منظور ہے تو زوجہ سے صریح الفاظ میں پہلے پوچھنا چاہئے، کہ ہم تمھارے مہر میں یہ چیز دیتے ہیں، آیا تم رضامند ہو، پھر اگر وہ رضامند ہو تو اگر وہ چیز جنس مہر سے نہیں ہے مثلاً مہر روپیہ تھا اور یہ چیز مکان یا کپڑا ہے تو بلا شرط قلیل و کثیر کے رضامندی سے یہ مبادلہ جائز ہے، اور اگر وہ چیز جنس مہر سے ہے مثلاً روپیہ تھا، یہ چیز چاندی کا زیور ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دونوں کی مقدار برابر ہو، مثلاً مہر اگر سو روپیہ ہوا اور زیور پچاس روپیہ کے برابر ہوا تو یہ مبادلہ جائز نہیں، البتہ دو صورتیں درست ہوں گی، ایک یہ کہ پچاس میں زیور لگا دے، اور پچاس معاف کر دے، دوسرے یہ کہ صلح کے طور پر لے لے، تو اس کے معنی شریعت خود یہ تجویز کر لیتی ہے کہ پچاس میں زیور لے لیا، اور پچاس معاف کر دیئے،

عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف نہیں کر سکتی ایک کوتاہی مہر کے بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف کر دیتی ہے اور اس معافی سے زوج بالکل بے فکر ہو جاتا ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معافی وصیت للوارث کی فرع (وارث کے لئے وصیت کی ایک صورت) ہے، اور یہ بدون رضا دیگر ورثہ کے ناجائز ہے، پس اس معافی سے مہر معاف نہ ہوگا، البتہ زوج کو جس قدر میراث میں پہنچے گا وہ بے شک معاف ہو جائے گا، باقی اس کے ذمہ واجب الاداء رہے گا، جو دوسرے وارثوں کو دیا جائے گا، البتہ اگر سب ورثہ اس معافی کو جائز رکھیں تو کل معاف ہو جائیگا اور اگر بعض نے جائز نہ رکھا یا بعض نابالغ ہوں تو اُن کے حصہ کے قدر معاف نہ ہوگا،

شوہر کو مرض الموت میں عورت کو مہر معاف کرنے کی رائے نہیں دینا چاہئے ایک کوتاہی اس بارے میں یہ ہے کہ زوج کے مرض الموت میں عورت مہر معاف کر دیتی ہے، اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر

خوشی سے معاف کردے معاف ہوجاتا ہے، اور اگر عورتوں کی زبردستی گھیر گھیری سے معاف کرے عند اللہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) معاف نہیں ہوتا، اور پروالوں کو ایسے موقع پر اس طرح مجبور نہ کرنا چاہئے بلکہ بعض مواقع پر معاف کرنا مصلحت بھی نہیں ہوتا، مثلاً میراث کا حصۂ زوجہ کا اس کی بسر کے لئے کافی نہیں، اور ورثہ سے بھی امید رعایت وکفالت (اخراجات برداشت کرنے) کی نہیں، ایسے موقع پر تو بجائے ترغیب معافی (معاف کرنے کی رغبت دلانے) کے معاف نہ کرنے کی رائے دینا مناسب ہے

زوجۂ متوفیہ کی اولاد کا حصہ میں زوج کو تصرف کرنا حرام ہے،

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ اگر زوجۂ متوفیہ (فوت شدہ بیوی) کے ورثہ اس کے ماں باپ یا بھائی وغیرہ ہوتے ہیں تب تو اُن کے مطالبہ پر زوج ان کا حصہ مہر دیدیتا ہے، اور اگر خود اسی زوج کے اولاد وارث ہوئی تو چونکہ وہ مطالبہ کر نہیں سکتے یہ اُن کا حق ادا نہیں کرتا، یہ فعل سراسر ظلم اور خیانت ہے، ان کا حق امانت ہے، اس اولاد کے نام سے جمع رکھنا چاہئے، اور خاص ان کے مصالح میں صرف کرنا چاہئے، خود دستبرد (کرنا، خرچ کرنا) حرام ہے، اسی طرح اُن بچوں کو جو ماں سے میراث میں پہنچی ہوں ان سب کی حفاظت اس کے ذمہ فرض ہے، اس میں بے جا تصرف (بلاوجہ خرچ کرنا) حرام ہے،

نکاح یا رخصت سے قبل مصارفِ شادی کے لئے شوہر سے کچھ لینا حرام ہے،

ایک کوتاہی بعض بلاد (علاقوں) میں بابِ مہر میں یہ ہے کہ زوج سے قبل نکاح یا قبل رخصت کچھ روپیہ اس غرض سے لے لیتے ہیں کہ مصارفِ شادی (شادی کے اخراجات) میں خرچ کریں گے، اور جب اُن کو منع کیا جاتا ہے کہ یہ رشوت اور حرام ہے تو یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم نے مہر میں لیا ہے، اگر یہ واقعی مہر ہے تو اس کی مالک عورت ہے، اور کسی کے مال میں بدون اس کے اذن بطیب خاطر (بغیر اجازت دل کی رضامندی کے) تصرف کرنا حرام ہے، سو ان لوگوں نے عورت سے کب پوچھا ہے اور اس نے کب خوشی سے اجازت دی ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اذن لاحق (بعد میں اجازت دینا) بھی مثل اذن سابق (پہلے اجازت دینے) کے ہے، اور اذن دلالۃً بھی مثل اذن صراحۃً کے ہے (یعنی عرفِ عام کے اعتبار سے جس کو اجازت سمجھا جائے وہ بالکل واضح طور پر اجازت دینے کے مانند ہوتا ہے) تو جواب یہ ہے کہ یہ بالکل مسلّم ہے (تسلیم شدہ) ہے، لیکن اذن کی حقیقت کا تو پایا جانا ضروری ہے، اور حقیقت اس کی وہاں ہوگی جہاں عدمِ اذن (اجازت نہ دینے) پر بھی قدرت ہے، سو ظاہر ہے کہ یہاں بوجہ اتباعِ رسم کے (رسم ورواج کی پیروی کی وجہ سے) اس کے روکنے یا اس کا ضمان (جرمانہ) اور بدل لینے کی عورت کو قدرت ہی نہیں، پس اذن کہاں پایا گیا؟ خلاصہ یہ کہ اگر

یہ مہر نہیں تو رشوت ہے، اور اگر مہر ہے تو غصب ہے، اور دونوں حرام ہیں،

نابالغ زوجہ کے مہر کی معافی شرعاً معتبر نہیں، ایک کوتاہی اس بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ بعضے لوگ ویسے ہی یا طلاق دینے کے وقت نابالغ زوجہ سے مہر معاف کرا لیتے ہیں، یہ سو یہ معافی معتبر نہیں لانّ تبرع الصغیر باطل (تحقیق بچّہ کا صدقہ وغیرہ کرنا باطل ہے) بعض جگہ اس سے بڑھ کر ہوتا ہے، کہ ولی زوجہ نابالغہ کا طلاق کا مطالبہ زوج سے کرتا ہے، اور یہ ولی ہی مہر معاف کر دیتا ہے، سو اس صورت میں اگر زوج نے طلاق دیدی تو طلاق تو واقع ہو جائے گی، مگر مہر ساقط نہ ہوگا،

عورتوں کا مہر مانگنا شرعاً کوئی عیب کی بات نہیں ایک کوتاہی کہ وہ عملی غلطی ہے اس بارہ میں یہ ہے کہ عورتیں مہر مانگنے کو یا بے مانگے لے لینے کو عیب سمجھتی ہیں، اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کو بدنام کرتی ہیں، سو اپنے حق واجب کا مانگنا یا وصول کر لینا جب شرعاً کچھ عیب نہیں تو محض اتباعِ رسم سے اس کو عیب سمجھنا گناہ سے خالی نہیں،

مہر اور نان و نفقہ دونوں علیحدہ علیحدہ حقوق ہیں، ایک کوتاہی کہ وہ علمی غلطی ہے یہ ہے کہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اگر ہم نے مہر لے لیا تو پھر ہمارا کوئی حق خاوند کے ذمہ نہ رہے گا، یعنی نان و نفقہ اور دیگر حقوقِ معاشرہ سب ساقط ہو جائیں گے، سو یہ اعتقاد محض غلط ہے، سب حقوق الگ الگ ہیں، ایک حق دوسرے پر مبنی نہیں، مہر لینے سے دوسرا کوئی حق ساقط نہیں ہوتا، اور اس اعتقادِ باطل کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ شوہر مہر ادا کرتا ہے اور عورت نہیں لیتی، اور نہ معاف کرتی ہے، ایسی صورت میں اگر زوج پر ادائے حق کا غلبہ ہوا اور مسائل سے ناواقف ہوا تو بے حد پریشان ہوتا ہے، کہ اب میری برأت و سبکدوشی (ذمہ داری سے فراغت) کی کیا صورت ہو سکتی ہے، اس لئے اس کا مسئلہ بتلایا جاتا ہے کہ اس صورت میں اگر شوہر مالِ مہر کا زوجہ کے سامنے اس طرح رکھدے کہ وہ اس کے قبضہ پر قادر ہو اور رکھ کر یہ کہدے کہ یہ تمہارا مہر ہے، اور یہ کہہ کر اس مجلس سے اُٹھ جائے تو مہر ادا ہو گیا، خواہ عورت اٹھالے یا نہ اٹھائے، اگر اس نے نہ اٹھایا اور دوسرا کوئی لے گیا تو وہ زوجہ کا گیا اور اگر بخیال ضائع ہونے کے خاوند اٹھالے گا تو وہ اس کے پاس زوجہ کی امانت رہے گا، شوہر کی ملک نہ ہوگا،

دَینِ مہر مانعِ وجوبِ زکوٰۃ نہیں ایک کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے کہ بعضے لوگ دَینِ مہر کو مانعِ وجوبِ زکوٰۃ (زکوٰۃ کے واجب ہونے کو روکنے والا) سمجھتے ہیں، یعنی جس شخص کے ذمہ مہر واجب ہو وہ یوں سمجھتا ہے کہ چونکہ میں اتنے کا قرضدار ہوں اس لئے مجھ پر اتنے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں، گو اس مسئلہ میں کسی قدر

اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مانع نہیں، یعنی مہر کے لازم ہوتے ہوئے بھی کُل مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی، چنانچہ شامی نے بعد نقلِ اقوال کے کہا ہے :۔

زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع (ص۳۴ ج۲)	"قہستانی نے جواہر سے یہ اضافہ کیا ہے اور صحیح یہی کہ وہ مانع نہیں"

خصوصاً جبکہ ادا کی نیت بھی نہ ہو، تو پھر مانع ہونے کے کوئی معنی نہیں، کیونکہ عازمِ ادا (ادا کرنے کا ارادہ رکھنے والا) جب کسی بار کا التزام ہی نہیں کرتا پھر اس کی رعایت بے وجہ ہے،

مہر کے وصول ہونے تک عورت کے ذمہ زکوٰۃ واجب نہیں

ایک اور کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے، اور وہ عوام کا تو ملتفت الیہ بھی نہیں (یعنی عوام اس طرف توجہ نہیں دیتے) اُن سے گذر کر خواص کو پیش آئی ہے وہ یہ کہ جس طرح اموالِ تجارت میں تاجر کے ذمہ مثل عین یعنی نقد موجود مال کے دَین (جو روپیہ دوسروں کے ذمہ ہے اس) میں بھی (یعنی اُن حقوق میں جو کہ لوگوں کے اس کے ذمہ واجب ہیں مثلاً اس کا قرض چاہتا ہے یا اُدھار سودا لینے والوں کے ذمہ دام چاہتے ہیں) زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح عورت کا جو دَین مہر زوج کے ذمہ ہے اس میں بھی زوجہ کے ذمہ زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ سو عوام کو اس طرف التفات ہی نہیں ہوا، جس کی وجہ عدمِ اہتمامِ دین (دین کی طرف توجہ کا نہ ہونا) ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی یہ مسئلہ ہی نہیں پوچھا، حالانکہ تردّد کی اور پوچھنے کی بات تھی، کیونکہ آخر میں یہ بھی تو ایک قرض ہے، البتہ خواص کو تردّد ہوا، سو اُن میں جو غیر محقق تھے وہ قیاس سے وجوب (واجب ہونے) کے معتقد ہو بیٹھے، اور پھر یہ فکر ہوئی کہ اس وجوب میں تو تمام مہر زکوٰۃ ہی کی نذر ہو جائے گا، اس لئے انھوں نے اپنے نزدیک ایک دانائی سے کام لیا، کہ مہر میں بجائے روپیوں کے تانبے کے ٹکوں کی رسم تجویز کی، کہ ٹکے اموالِ زکوٰۃ سے نہیں ہیں، چنانچہ ہمارے قصبات میں اس رسم کی یہی اصل ہے، کذا سمعتُ استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (جیسا کہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ سے سُنا ہے) اور جو محقق تھے انھوں نے فقہ سے رجوع کیا، سو تحقیق سے ثابت ہوا کہ جو دَین بدل تجارت ہے یا قرض ہے وہ دَین قوی ہے، اور مہر دَین ضعیف، اس کا قیاس اس پر جائز نہیں، دَینِ قوی میں زکوٰۃ فرض ہے، اور دَینِ ضعیف میں نہیں ہے، جب تک وصول نہ ہو جائے، اور وصول ہونے کے بعد بھی زمانہ گذشتہ کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، تازہ زکوٰۃ ہوگی، کذا فی الدر المختار، خلاصہ اخیر کے دو مسئلوں کا یہ ہوا کہ مہر نہ مانعِ زکوٰۃ ہے اور نہ موجبِ زکوٰۃ۔

ہٰذا ما حضرنی الآن فی باب المہر،

ٹکوں میں مہر مقرر کرتے وقت چند غور طلب باتیں	کہ اس میں بھی کوتاہی کی جاتی ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی حاجت ہے، جو مرکب ہے چند مقدمات سے۔

ایک مقدمہ یہ ہے کہ ہمارے قصبات میں مدتِ مدیدہ (عرصۂ دراز) سے رسم ہے کہ مہر ٹکوں سے ٹھہراتے ہیں، جس کی بناء اور اس بناء کا ضعیف ہونا اوپر لکھ چکا ہوں،

دوسرا مقدمہ یہ کہ ان اطراف میں ٹکے دو قسم کے پائے جاتے ہیں، ایک منصوری جو موٹے موٹے پیسے ہوتے ہیں، دوسرے ڈبل، یعنی انگریزی سکہ کے پیسے،

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ مسئلہ فقہیہ ہے کہ اگر کسی وقت ایک نام کے کئی سکے چلتے ہوں اور معاملہ میں اس سکہ کا نام لیا جائے تو اگر وہ رواج میں سب برابر ہیں تو ان میں قید لگانے کی ضرورت ہوگی، بدون اس کے محض نام لینا کافی نہ ہوگا، اور اگر کوئی زیادہ چلتا ہے کوئی کم تو اطلاق (مطلقاً ذکر کرنے) کے وقت وہی زیادہ چلنے والا مراد ہوگا، جیسے پہلے زمانہ میں منصوری پیسے زیادہ چلتے تھے، اور اب ڈبل پیسے زیادہ چلتے ہیں، پس پہلے زمانہ میں جب مہر ٹکوں سے ٹھیرایا جاتا تھا، منصوری ٹکے مراد ہوتے تھے، اور اب جب اس عنوان سے مہر ٹھیرایا جائے گا ڈبل پیسے مراد ہوں گے،

چوتھا مقدمہ، یہ مسئلہ ہے کہ اگر معاملہ کے وقت کسی قسم کے پیسوں کا رواج تھا اور قبل ادا (ادا کرنے سے پہلے) رواج جاتا رہا تو اب صاحبِ حق اسی مقررشدہ کا مطالبہ کر سکتا ہے، رائج حال (یعنی اس موجود وقت چلنے والے پیسوں) کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کذا فی الدر المختار کتاب البیوع، فصل القراض من قولہ استقرض من الفلوس الرائجۃ،

پانچواں مقدمہ، جو پیسے واجب ہیں تراضی جانبین (دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی) سے اس کی قیمت بھی لینا جائز ہے، مگر صاحبِ حق زمانہ وجوب (واجب ہونے کے زمانہ) کی قیمت جبراً نہیں لے سکتا، جب یہ پانچوں مقدمے ممہّد (مکمل) ہوگئے تو:-

ٹکوں سے مقرر کردہ مہر کی وصولی میں چند کوتاہیاں	اب سمجھئے کہ وہ غلطی یہ ہے کہ جن عورتوں کے نکاح ان منصوری اسّی ہزار ٹکوں پر ہوئے جن کی قیمت اس وقت ڈبل پیسے سے تقریباً پون پیسہ

تھی، اور اب آدھا پیسہ یعنی ایک دھیلا ہوگیا ہے، بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ عورت یا اس کے اولیاء یا ورثہ زوج سے اسّی ہزار ٹکے ڈبل پیسے کے یا انہی ڈبل ٹکوں کی قیمت لگا کر ان منصوری ٹکوں کی جو قیمت اب ہے یعنی فی ٹکہ ایک پیسہ ڈبل، اس سے زیادہ مطالبہ نہیں ہوسکتا، اور اگر اس میں زیادہ نزاع

کرے تو زوج کو شرعاً جائز ہے کہ اسی منصوری پیسے کے اسّی ہزار ٹکے خرید کر حوالہ کرے، صاحبِ حق اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتا، یہ ہے وہ غلطی، البتہ جو نکاح اب ہوں گے جس وقت کہ زائد رواج ڈبل پیسوں کا ہے اس وقت بھی ڈبل پیسے واجب ہوں گے، پس اس کی قیمت سے روپیوں کا حساب ہوگا، یہ بیان تو غلطی کا تھا،

مہر میں دوسری جنس کی قیمت لگانے کا طریقہ

اب ایک اور عام مسئلہ اس قیمت لگانے کے متعلق معلوم کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اگر واجب ایک چیز ہو اور لینے کے وقت اس کی قیمت لگا کر لی جائے دوسری چیز، تو یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر حق اُس وقت وصول کیا جاتا ہے، اسی حساب کا کرنا چاہئے، یہ جائز نہیں کہ پورے کا حساب دوسری جنس سے کر لیا جائے، پھر اس دوسری جنس سے کچھ اب لیا جائے کچھ دوسرے وقت، بلکہ بقایا حق کا حساب اگر دوسرے وقت اسی جنس سے کیا جائے، تو اس دوسرے وقت کے نرخ وغیرہ کا اعتبار ہوگا، وقت سابق کے نرخ پر صاحبِ حق مجبور نہیں کر سکتا مثلاً ایک شخص نے منصوری (پیسہ) کے رواج کے وقت چالیس پیسے قرض لئے تھے، جو اس وقت آٹھ آنے کے تھے اور اب پانچ آنے کے ہیں، اور ان میں سے نصف اب وصول کرتا ہے، تو یہ جائز نہیں کہ اب حساب کر کے اس کے ذمہ پانچ آنے ٹھیرا دے، اور ڈھائی آنے اب لے لے، اور ڈھائی آنے پھر، بلکہ اس وقت بیس ہی پیسوں کا حساب کیا جائے، پھر بیس کا دوسرے وقت کرے،

اگر فرض کیجئے اس وقت نرخ منصوری کا ڈبل کے چار ہو گیا، تو اس دوسرے وقت میں پانچ ڈبل لے سکتا ہے، پہلے حساب سے دس نہیں لے سکتا، اسی طرح غلہ کے عوض روپے لینے میں اس کا خیال رکھنا واجب ہے،

مثال:۔ ایک کاشتکار کے ذمہ ٹھیکہ کا غلہ گندم چالیس سیر چاہئے، پھر اس سے یہ اقرار پایا کہ اچھا اس کے دام نقد سے لگا کر حساب کر لیا جائے، اور حساب کے وقت نرخ گندم کا روپیہ کا دس سیر ہے، اور اس حساب سے چالیس سیر غلہ چار روپیہ کا ہوا، سو اگر اسی جلسہ میں چاروں روپے وصول ہو جائیں تب تو پورے غلہ کا حساب کر لینا جائز ہے، اور اگر فرض کیجئے کہ اس کو دو روپے وصول ہوں گے تو اُس وقت یہ چاہئے کہ صرف بیس ہی سیر غلہ کا حساب کرے، اور اس کے دام اسی وقت وصول کر لے، اب اس کاشتکار کے ذمہ بیس سیر غلہ باقی واجب رہے گا، اس وقت عموماً زمینداروں کی عادت ہے کہ پورے چالیس سیر غلہ کا حساب روپیوں سے کر کے کاشتکار کے ذمہ مثلاً چار روپے کر دیتے ہیں، پھر اگر اس وقت دو روپے وصول ہوئے تو آئندہ اس کے ذمہ دو روپے باقی

سمجھ کر دو روپے کا مطالبہ کرتے ہیں، سو یہ جائز نہیں، حدیث میں جو بیع الکالی بالکالی کی ممانعت آئی ہے اس کا یہی مطلب ہے، پھر جب موافق مسئلہ مذکورہ کے بیس سیر غلہ اس کے ذمہ واجب رہا، سو جب اس کا حساب ہوگا اس وقت پہلے حساب کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ نیا حساب ان دونوں کی رضامندی سے ہوگا، مثلاً اُس وقت نرخ سولہ سیر کا ہوا تو باقی غلہ اڑھائی روپیہ کا ہوگا، پس پہلی صورت میں زمیندار دو روپیہ جبراً نہیں لے سکتا، اور دوسری صورت میں کاشتکار دو روپیہ جبراً نہیں دے سکتا،

اسی طرح اگر گیہوں واجب تھے اور تراضی جانبین سے وصول کرنا ہے نخود (چنا) تو جس قدر نخود اس وقت لینا ہے اتنے ہی گندم کا اس وقت حساب کیا جاوے، بقیہ اس کے ذمہ گندم رہیں گے، آئندہ وصولی کے وقت اُن کا حساب باہمی رضامندی سے جس طرح بھی ہو جاوے، یہ نہیں کہ آئندہ اس کے ذمہ نخود (چنے) کا بقایا نکالا جاوے، خوب سمجھ لینا چاہئے ؛

اصلاحِ انقلاب

متعلق بعدل بین الزوجتین

دو بیویوں میں عدل وانصاف نہ کرنے کی کوتاہیاں،

اس باب میں محدود کوتاہیاں ہوتیں تو مثل دوسرے ابواب کے ان کی بھی فہرست بتلائی جاتی، یہاں تو بالکل کوتاہی ہی کوتاہی ہے، عدل کا نام و نشان بھی نہیں، اس کی طرف التفات ہی نہیں، اِلّا نادر اَلنادر کالمعدوم (یعنی ایسا عدل بہت کم پایا جاتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے) چونکہ بڑا سبب اس بے التفاتی کا اس کے متعلق احکام نہ جاننا ہے، اس لئے بجائے بے شمار کوتاہیوں کے اس باب کے احکام بتلا دینا کافی ہے،

عدل نہ کرسکنے کی امید ہو تو دوسرا نکاح کرنا ہی گناہ ہے،

مسئلہ نمبر ۱: سب سے اول یہی ہے کہ بلاضرورت دوسری زوجہ سے نکاح نہ کرے، اگرچہ عدل کی امید ہو، اگر خیال سے ترک کردے گا کہ پہلی کو غم نہ ہو تو ثواب ہوگا، (ع) اور اگر عدل کی امید نہ ہو تب تو دوسرا نکاح کرنا بالکل گناہ ہے، بقولہٖ تعالیٰ:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً	"پس اگر تم کو اندیشہ اس کا ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر اکتفاء کرو"،

نفقات اور شب باشی میں عدل واجب ہے

مسئلہ نمبر ۲: نفقات (اخراجات) میں اور بغرض تالیف (دلجوئی) وانس کے شب باشی میں عدل واجب ہے اور ہمبستری[1] میں نہیں،

---

[1] یہاں سے یہ وہم نہ ہو کہ باوجود قدرت کے اگر کسی ایک منکوحہ سے ہمیشہ ترک ہمبستری کرتے رہے، اور اس منکوحہ کو حاجت بھی ہمبستری کی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ یہ خیال بالکل غلط ہے، اور نہ اس عبارت کا مقصود ہے، عبارت کا مقصود تو یہ ہے کہ عورت کے ساتھ ہمبستری کے باب میں (باقی بر صفحہ آئندہ)

رغبت اور نشاط غیر اختیاری ہو

مسئلہ نمبر۳: لیکن اگر جمیع استمتاعات میں مثل ہمبستری و بوس وکنار وغیرہ میں برابری کرے تو مستحب ہے، گو واجب نہیں،

مسئلہ نمبر۴: اور یہ عدم وجوب اس وقت متفق علیہ ہے کہ جب رغبت اور نشاط نہ ہو اس صورت میں معذور ہوگا، لیکن اگر رغبت اور نشاط ہے گو دوسری کی طرف زیادہ ہے اور اس کی طرف کم مگر ہے تو اس صورت میں ایک قول یہ ہے کہ داخل تحت القدرۃ (قدرت میں داخل) ہے، اس لئے اس میں برابری واجب ہے، اور غالباً یہ غیر حنفیہ کا مذہب ہے (ش)

تبرعات اور تحائف میں بھی عدل واجب ہے

مسئلہ نمبر۵: باقی تبرعات وتحائف (عطیات اور تحفے) جو کہ غیر لازم میں ہیں، ان میں عدل واجب ہے یا نہیں، ظاہر اطلاق اقوال حنفیہ کا وجوب ہے، اور ابن البطال مالکیؒ نے بحثاً (کلی طور پر) غیر واجب کہا ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہدایا بھیجنے سے نوبت میں عائشہ رضی اللہ عنہا میں (یعنی حضرت عائشہؓ کی باری میں حضور اکرمؐ کو ہدیہ بھیجنے سے) استدلال کیا ہے (ف، ج ۵ ص ۱۵۲) لیکن یہ استدلال بچند وجوہ مخدوش (بدلیل چند وجوہ سے صحیح نہیں) ہے،

اول ممکن ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی ملک کی جاتی ہو، اور اس کا یہ جواب دینا اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیتے کہ میں اس ہدیہ کا مالک نہیں اس لئے ضعیف ہے کہ ازواج کی درخواست تقسیم ہدایا نہ تھی، بلکہ مھدین (ہدیہ بھیجنے والوں) کو یہ فرمادینا کہ تخصیص (کسی کے لئے خاص) نہ کریں،

ثانیاً ممکن ہے کہ آپؐ کی ملک ہو، مگر آپؐ تقسیم فرمادیتے ہوں، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کیوں ہوتی؟ اس طرح مدفوع ہے کہ ایسے موقع پر بھی تو ناگوار ہوتا ہے کہ ایک کے گھر سے سب جگہ پہنچے،

ثالثاً حنفیہ کے نزدیک آپؐ پر یہ عدل واجب ہی نہ تھا تو اس پر دوسروں کا قیاس نہیں ہوسکتا، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر آپؐ نے کیوں نہ فرمادیا، اس لئے معتد بہ (قابلِ ذکر) نہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیانۃً حکم یہ ہے کہ عورت کی حاجت اور ضرورت کے موافق ہر زوجہ سے ہمبستری کرنا مرد پر واجب ہے، اگر اس کو باوجود قدرت اور خواہش عورت کے ترک کرے گا تو گنا ہگار ہوگا، ہاں اگر کسی وجہ سے خود مجبور ہو یا عورت اپنا حق معاف کردے یا عورت کو خواہش ہی نہ رہے تو پھر گناہ نہ ہوگا، اور اگر یہ شخص معذور رہو اور عورت اپنا حق معاف نہ کرے اور اسے خواہش جماع کی ہو اور طلاق چاہے تو دیانۃً زوج کو طلاق دینا واجب ہوگا ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

آپ باوجود عدم وجوب کے اس کے ساتھ معاملہ وجوب کا سا فرماتے تھے،

بہرحال ابن بطال کا استدلال مخدوش ہے، اور ظاہر اطلاق دلائل سے وجوب ہی ہے،

ازواج میں سے سفر میں کسی کو ..... ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی افضل ہے،

مسئلہ نمبر۶؛ برابری شب باشی (رات گذارنے) میں حضر (گھر میں رہنے) میں ہے، اور سفر میں اختیار ہے جس کو چاہے ساتھ لے جائے، لیکن رفع شکایت (شکایت دور کرنے) کے لئے قرعہ ڈال لینا افضل ہے، اور ظاہرًا یہ اس صورت میں ہے جب تک قرار (سکون) سے قیام نہ ہو، ورنہ حالتِ قیام کا حکم مثل حکم حضر کے ہوگا، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلیا جائے،

مسئلہ نمبر۷؛ یہ برابری شب باشی میں اس شخص کے لئے ہے جو شب میں فارغ ہو، اور جس کی رات ہی کی نوکری ہو جیسے چوکیدار تو اس کا دن مثل شب کے ہے (د)

دونوں بیویوں کی رہائش گاہ میں برابری واجب ہے،

مسئلہ نمبر۸؛ مسکن (رہائش گاہ) میں جو برابری واجب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو جدا گھر دینا چاہئے، جبرًا دونوں کو ایک گھر میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر دونوں رضامند ہوں تو ان کے رضامند ہونے تک جائز ہے،

ایک شب میں دوسری کو شریک کرنا صحیح نہیں،

مسئلہ نمبر۹؛ جس شخص پر شب میں عدل واجب ہو ایک کی شب میں دوسری کو شریک کرنا درست نہیں، یعنی ایک کی شب میں دوسری کے پاس نہ جائے،

مسئلہ نمبر۱۰؛ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایک کے پاس بعد مغرب جائے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، بلکہ اس میں بھی برابری ہونا چاہئے، (ش)

مسئلہ نمبر۱۱؛ اسی طرح ایک شب میں دونوں جگہ تھوڑا تھوڑا رہنا درست نہیں (ل)

مسئلہ نمبر۱۲؛ لیکن ان تین اخیر کے مسئلوں میں یعنی ۹، ۱۰، ۱۱ میں اگر اذن و رضامندی ہو تو درست ہے،

مسئلہ نمبر۱۳؛ اور جس طرح رضامندی سے تھوڑی تھوڑی رات رہنا دونوں کے پاس درست ہے، اسی طرح اگر دونوں کی باری کا دورہ ختم کرکے ایسا کرے اور پھر جس طرح چاہے باری درست کرلے، یہ بھی درست ہے (ش)

اور ان اخیر کے مسائل میں صاحب نیل الاوطار نے یہ مذہب بھی لکھا ہے کہ شب کو بھی ایک کی باری میں دوسری کو عارضی طور پر بلا لینا یا خود اس کے گھر چلا جانا اور اس سے بات چیت کرنا اور اس کے پاس بیٹھنا اور اس کو لمس کرنا (چھونا) سب درست ہے، صرف شب بھر رہنا اور

ہمبستری دوسری کے ساتھ درست نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے جمع ہونے سے استدلال کیا ہے، مگر یہاں احتمال اذن (اجازت میں شک) یا عدم وجوب قسم کا ہے،

دن کے وقت برابری کا حکم | **مسئلہ نمبر ۱۴؛** دن کے آنے جانے میں برابری واجب نہیں، بلکہ تھوڑی دیر کے لئے ہوآنا بھی کافی ہے،

مسئلہ نمبر ۱۵؛ یا کسی ضرورت سے ایک ہی جگہ جائے تب بھی درست ہے،

مسئلہ نمبر ۱۶؛ البتہ اس روز جس کی باری نہ ہو اس سے دن کو صحبت درست نہیں، اور ظاہراً قواعد سے یہاں بھی رات تابع دن کی ہوگی، البتہ تصالح زوجتین (دونوں بیبیوں کی صلاح) یا اصلاحِ زوج سے اس میں تبدیلی درست ہوگی، اس کو بھی دوسرے علماء سے تحقیق کرلیا جائے (ش)

باری کی مقدار اور تعین کے چند مسائل | **مسئلہ نمبر ۱۷؛** باری کی مقدار مقرر کرنا مرد کی رائے پر ہے، لیکن وہ مقدار اتنی طویل نہ ہو کہ دوسری کو انتظار سے کلفت ہونے لگے، مثلاً ایک ایک سال اور یہ خلاصہ ہے بحث طویل کا (ش)

مسئلہ نمبر ۱۸؛ اور اگر بیماری کے سبب ایک کے گھر زیادہ مقیم رہا تو بعد صحت کے اتنے ہی روز دوسری کے گھر رہنا چاہئے (ش)

مسئلہ نمبر ۱۹؛ اسی طرح اگر ایک بی بی بہت سخت بیمار ہوگئی تو اس ضرورت سے اس کے گھر مقیم رہنے میں مضائقہ نہیں (ع) اور ظاہر اطلاق قول درمختار مریضہ سے اُن ایام کی قضا بھی ضروری معلوم ہوتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۰؛ ایک منکوحہ کو اپنی باری دوسری کو ہبہ کردینا درست ہے، پھر جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۱؛ اگر کسی شخص کے مثلاً چار بیبیاں ہیں، الف، ب، ج، د، ان میں سے الف نے اپنی باری ب کو ہبہ کردی اور ان دونوں کی باری کے دن متصل نہ تھے، تو شوہر کو ان دونوں کا متصل کرنا درست نہیں، بلکہ وہی پہلی ترتیب رہے گی، اور اس موہوب بہا (جس کو باری ہبہ کی گئی ہے اس) کے پاس دو شبوں میں فصل رہے گا، (ش) لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد ختم دورہ کے پھر ترتیب بدل سکتا ہے،

عدل قائم کرنے کی اہمیت | یہ اکیس مسائل ہیں مختلف کتب سے جن کے یہ رموز ہیں، (ع) عالمگیریہ (ق) قاضی خاں، (ش) شامی (ف) فتح الباری (د) درمختار (ل) اشعۃ اللمعات، اگر ان مسائل کو

مستحضر کر کے ان کو دستور العمل بنالے، انشاء اللہ اس باب میں کبھی خلافِ عدل کا وقوع ہی نہ ہو، مگر افسوس لوگوں نے بجائے عدل کے اس وقت عدول (ترکِ عدل) کو شیوہ (طریقہ) بنا رکھا ہے، حتی کہ اکثر عدول نے بھی فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اِنْ تَعْدِلُوْا وَ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (پس خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کرو اگر انصاف کرو، (اور) تمھارا تقوی زیادہ قریب ہے (انصاف کے)

مضمون بالا عدل بین الزوجتین کا ضمیمہ

ملقب بہ

خیر الانتہاء فی معاشرۃ النساء

مضمونِ مذکور جورِ زوج کا انسداد (شوہر کے ظلم کو روکنا) تھا، جو تعددِ زوجہ (کئی بیویوں) کے وقت میں ہوتا ہے، کبھی یہ جور ان زوجاتِ متعددہ (یہ ظلم متعدد بیویوں) کی طرف سے بھی ہوتا کر جس کا سبب باہمی تنافس و تحاسد (آپس میں ایک دوسری پر برتری کا اظہار اور حسد) اور کبھی غیظ علی الزوج (خاوند پر غصہ) ہوتا ہے، اور اس باہمی تنافس و تحاسد کے اثر کا بھی اکثر حصہ اسی زوج پر واقع ہوتا ہے، تو ہر حال میں تختۂ مشق یہی ٹھیرا، اس ضمیمہ میں اس جور کا انسداد ہے، اور ہر چند کہ قرآن مجید میں جو اصلاح معاشرت بین الزوجین (شوہر بیوی کے باہمی تعلقات کی اصلاح) کے متعلق مختلف تعلیمات وارد ہیں، جن میں بعض میں خطاب عام ہے، بعض میں خطاب خاص بقصدِ تعمیمِ حکم (باوجودیکہ حکم عام ہونے کا قصد ہے) ان کا مجموعہ سب حالتوں کو شامل ہے، یعنی خواہ زوجہ میں تعدد نہ ہو یا کہ تعدد ہو، پھر جور زوج کی جانب سے ہو یا زوجہ کی جانب سے ہو، مگر ظاہر ہے کہ تعدد کی حالت میں اُن کی اس لئے زیادہ حاجت ہوگی کہ اس حالت میں ایسے جور کا وقوع زیادہ ہوتا ہے، کبھی زوج کی طرف سے، جس کا انسداد آیت وجوب عدل بین النساء (بیویوں کے درمیان عدل کے واجب کرنے والی آیت) سے فرمایا گیا ہے، اور مضمون بالا اسی کی تفصیل تھی، اور کبھی زوجہ کی طرف سے، جس کا بیان اب کیا جاتا ہے، اور گو اس باب میں جن نصوص کا حوالہ ہے وہ صورتِ تعدد کے ساتھ خاص نہیں، مگر چونکہ صورتِ تعدد میں ان کی سب سے زیادہ حاجت ہے جیسا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس لئے تعدد ہی کے ذیل میں وہ مذکور ہوتی ہیں،

وہ تعلیمات یہ ہیں:-

(۱) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً
(النساء، آیت ۳۳)

"پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔"

(۲) وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ (الیٰ قولہ) فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ، (النساء، آیت ۱۹)

"اور عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ وصول کرو۔"

(۳) وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط
(النساء، آیت ۱۲۹)

"اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو، گو تمہارا جی چاہے مگر اس کا خیال رکھو کہ بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ، جس سے دوسری کو ایسا کر دو جیسے کوئی درمیان میں لٹکی ہو۔"

(۴) وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ الیٰ قولہ تعالیٰ إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا،
( )

"اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور ان کو لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو اگر ان دونوں کو صلح کرنا منظور ہو گی تو اللہ تعالیٰ میاں بی بی میں انصاف فرما دیں گے۔"

(۵) وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ط وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء، آیت ۱۲۸)

"اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی یا بے پرواہی کا ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم خاص طور پر صلح کر لیں، اور یہ صلح بہتر ہے۔"

(۶) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا، (الاحزاب، آیت ۲۸)

"اے نبی آپ اپنی بیبیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو۔"

(۷) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ط (البقرہ، آیت ۲۲۹)

"سو اگر تم لوگوں کو احتمال ہو کہ وہ دونوں ضابطہ خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہو گا اس مال کے لینے دینے ... میں"

(ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی)

جن کے مجموعہ کا حاصل امور ذیل کا مجموعہ ہے، اور گو ان میں کوئی خاص ترتیب منصوص نہیں، اور نیز باعتبار حالات وخصوصیاتِ خاصہ (اپنے اپنے مخصوص حالات) کے اُن میں وقوعاً بھی کوئی خاص ترتیب لازم ودائم نہیں (خاص ترتیب عام طور پر ضروری نہیں) لیکن اور حالات میں اُن کے حقائق وآثار کے اعتبار سے اُن میں جو ترتیب مرعی ہے (یعنی اس کی رعایت کی گئی ہے) اسی ترتیب سے اس فہرست کو ذکر کرتا ہوں،

نمبر۱؛ صبر، زوجہ کی حماقت وکجراہی (غلط روبہ اختیار کرنے) پر، وفی ہذا قولہ تعالیٰ:—— وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ، الخ،

نمبر۲، اگر پھر بھی باز نہ آئے، یا مرد اس پر قادر نہ ہو تو اس کو نصیحت وفہمائش،

نمبر۳؛ پھر اس سے الگ دوسرے بستر پر سونا،

نمبر۴؛ وَاضْرِبُوْهُنَّ، یعنی ضرباً غیر مبرح (سخت پٹائی نہیں)

نمبر۵؛ یہ بھی نافع نہ ہو تو دو شخص فیصلے کے لئے تجویز کرنا، ایک مرد کی جانب سے ایک عورت کی جانب سے، جو دونوں کے اظہار لے کر رفع نزاع (جھگڑے کو ختم) کردیں، وھذا فی قولہ تعالیٰ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ (اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو)

نمبر۶؛ زوجہ سے کہہ دینا کہ اگر تم کو ہمارے نکاح میں رہنا منظور ہے تو فلاں فلاں شرطیں منظور کرنا پڑیں گی، یا اپنے سب حقوق معاف کر دینے ہوں گے، تاکہ اس کے بعد جتنے حقوق ہم ادا کریں اُن کو غنیمت سمجھو، اور کوتاہی کے گمان کے وقت ہماری شکایت نہ کرسکو، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ وحی (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) اپنی ازواج سے فرمایا تھا، وھذا فی عموم قولہ تعالیٰ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا وفی قولہ (الذی ھو اعظم افراد الصلح المذکور فیما قبلہ تاثیرا) یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اھ (اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی کا ہو) (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیبیوں سے کہدیں)۔

نمبر۷؛ اس پر بھی سیدھی نہ ہو تو رخصت، وھذا فی عموم قولہ تعالیٰ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا الخ (سو اگر تم کو اس کا احتمال ہو کہ وہ دونوں ضابطہ خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے)۔

یہ ہے فہرست جس کے اجزاء میں یہ ترتیب اکثری ہے، اور اتفاق سے اسی ترتیب سے یہ آیات بھی لکھی گئیں، پس اس دستور العمل سے جور من الزوجات (عورتوں کی طرف سے ظلم) کا بھی پورا انسداد ہو جاتا ہے، جیسا تجربہ سے مشاہدہ ہو سکتا ہے، اب اس ضمیمہ کو ایک حکایت پر جو کہ ایک

مفید دستور العمل پر مشتمل ہے ختم کرتا ہوں، اور اس حکایت کے اس تجربہ کے تیقن (یقین ہونے) میں قوت بڑھتی ہے،

حکایت ایک صاحب ثقہ مسمّٰی حاجی عبدالغنی ساکن محمد پور کا بیان ہے جو کہ دو زوجہ (بیویوں) کے اجتماع سے ضیق (تنگی) میں تھے، اور جو کہ تمام تدبیرات ختم کر چکے تھے، اور وہ تدبیرات نافع بھی ہوتی تھیں، مگر نزاع نطع اور خلجان رنع (جھگڑا ختم اور شک دور) نہ ہوتا تھا، آخر انھوں نے بجز نمبر ۴ کے بوجہ اس کے کہ واجب نہیں اور بعض مواقع پر مناسب نہیں، اس ترتیب پر عمل شروع کیا، نمبر ۶ تک پہنچے تھے بفضلہ تعالیٰ تمام خرخشے (جھگڑے) ختم ہوگئے، اور تلخیٔ عیش مبدّل بہ حلاوت ہوگئی، (زندگی کی تلخی خوشگواری میں بدل گئی) نہ صرف زوج کی، بلکہ دونوں زوجہ کی بھی، اس نمبر کے امتثال (بجالانے) کی عملی صورت ان صاحب نے یہ اختیار کی کہ اپنی دونوں زوجہ سے ایک یادداشت کی صورت میں (کہ صلح کی عظیم النفع فرد ہے، اور غالباً اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی)، چند امور کا عہد لیا، اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس رہنے کی یہ شرطیں ہیں، اب اختیار ہے جس شق (صورت) کو چاہے اختیار کیا جائے، چونکہ دونوں صالحہ اور سعیدہ تھیں، اس لئے انھوں نے نہایت خوشی سے سب شرطیں منظور کر لیں، اور سب کدورات (رنجشیں) صاف ہوگئیں، چونکہ اس یادداشت کے مضمون کا نافع ہونا تجربہ سے ثابت ہوا، لہٰذا ان سے حاصل کر کے اس مقام پر نقل کرتا ہوں، کہ دوسرے اہلِ ضیق (پریشان حال) بھی اس سے منتفع ہوں (یعنی نفع حاصل کر سکیں) جس سے مجوّز اور ناقل دونوں کو اجر ہو، وھو ھذا:۔

نقلِ مضمونِ مذکورہ "والصلح خیر"

یادداشت وعدۂ ہر دو اہلِ خانہ حاجی عبدالغنی؛

"ہم دونوں اہلِ خانہ حاجی عبدالغنی امورِ ذیل کا وعدہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے،

نمبر ۱: ہم دونوں نے اپنے تمام حقوق واجب اور غیر واجب ہمیشہ کے لئے حاجی صاحب کو معاف کئے، ہم کسی حق کا مطالبہ نہیں کریں گے، وہ خود اپنی خوشی سے جتنا حق ادا کر دیں گے ہم احسان سمجھیں گے، البتہ ادب کے ساتھ ہم کو درخواست

ے اس میں اشارہ ہو کہ مضمون ھذا ایک فرد ہے اس کلی منصوص کی ۱۲ (منہ)

کرنے کی اجازت ہے، لیکن اس کو پورا نہ کرنے کا ان کو اختیار رہے، اگر وہ پورا نہ کریں گے نہ ہم اصرار کریں گے نہ ہم کو ناگواری ہوگی،

نمبر۲: اس بناء پر ان کو اختیار ہوگا رات کو جس کے پاس چاہیں رہیں، اور خواہ کسی کے پاس بھی نہ رہیں، مردانہ میں رہیں، خواہ ایک کے پاس دوسری کے باری میں رہیں،

نمبر۳: کھانا کھانے میں ان کو اختیار ہوگا جس وقت جس جگہ جی چاہے کھائیں، خواہ کسی کے پاس بھی نہ کھائیں، بازار وغیرہ میں انتظام کرلیں، ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی، خواہ ایک کے ہفتہ میں دوسری کے گھر جائیں پھر خواہ گھر آکر کھائیں خواہ مردانہ میں منگائیں، خواہ ایک کے گھر سے کھانا منگا کر دوسری کے گھر میں کھائیں ہم کسی امر کے متعلق کوئی حرف زبان پر نہ لائیں گے،

نمبر۴، علیٰ ہذا دن میں یا شام میں گھر میں آنے کے متعلق ان کو اختیار ہے، خواہ وہ ایک جگہ آئیں خواہ دونوں جگہ، پھر خواہ ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھیریں اور ایک جگہ کم ٹھیریں، خواہ ایک جگہ بالکل نہ آئیں، خواہ دونوں جگہ نہ آئیں،

نمبر۵: علیٰ ہذا خرچ پیسے میں یا دوسری اشیاء از قسم سوغات (تحفے) وغیرہ دینے میں خواہ دونوں جگہ برابر دیں، یا کم و بیش، پھر خواہ مردانہ سے بھیجیں خواہ کسی الخ کے ہاتھ سے بھجوائیں، ہر طرح ان کو اختیار ہے ہم ہر طرح خوش رہیں گے،

نمبر۶: ہم کسی چغلخور کی بات کو نہ سنیں گے، بلکہ جب وہ کچھ بات کرے گا ہم منع کر دیں گے، اور جس قدر کان میں پڑجائے گا اس کو سچ نہ سمجھیں گے، اور نہ کسی کے سامنے اس کا ذکر کریں گے، نہ حاجی صاحب سے نہ اور کسی سے،

نمبر۷: ہم ہر امر میں جو کہ شریعت کے خلاف نہ ہو حاجی صاحب کی اطاعت کریں گے، وہ جو پوچھیں گے ہم فوراً بتلادیں گے، اُن کی کسی بات کو رد نہ کریں گے، نہ اس کو جھٹلائیں گے،

نوٹ (۱): اگر ہم کبھی جان بوجھ کر یا بھول کر اس کے خلاف کریں گے اسی یادداشت سے ہم کو لاجواب کر دیا جائے،

نوٹ (۲) شرعاً اس صلح سے رجوع کرنے کا جس طرح ہم دونوں زوجہ کو

اختیار ہو، اسی طرح حاجی صاحب کو اختیار ہے کہ ہمارے رجوع کے وقت خواہ وہ حقوقِ واجبہ کے مقیّد ہوں یا اپنی آزادی و سبکدوشی کا کوئی شرعی طریقہ اختیار کریں"

۲۹ ر ذوالحجہ ۱۳۳۵ھ (انتہی)

حقوق سے بَری ہونے کا باہمی عہد کرنے کے باوجود بیویوں میں عدل کرنا چاہئے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ اطلاع ہے جس کی شہادت یہ احقر بھی اپنے مشاہدہ سے دیتا ہے کہ اُن صاحب نے باوجود ہر قسم کے مطالبات سے برأت حاصل کر لینے کے اس کے بعد بھی کسی قسم کے حق میں خواہ فی نفسہٖ واجب تھا یا غیر واجب سستی یا کمی نہیں کی، اصلی غرض اُن کی بے جا الزام و شکایات کا انسداد وکفِ لسان (خواہ مخواہ کے الزامات و شکایات کو روکنا اور زبان بند کرنا) تھا، جو حاصل ہو گیا، نہ کہ حقوق سے سبکدوشی، اور اس کفِ لسان کا اثر طبعًا بشرطِ سلامت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ معاملہ میں زیادہ رفق اور شفقت (زیادہ نرمی اور مہربانی) پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ وہاں ایسا ہی ہوا، اور ایسی صورت میں لطفِ زندگی کیوں نہ ہو، کہ زوجہ یہ سمجھ لے کہ میرا کوئی حق شوہر کے ذمہ نہیں، اور شوہر باوجود اس کے یوں سمجھے کہ میرے ذمہ اور حقوق بڑھ گئے ہیں پس ایسی حالت میں اگر شوہر کچھ حق ادا بھی کرتا تب بھی زوجہ غنیمت سمجھتی چہ جائیکہ حقوق سے بھی زیادہ ادا کرے تو زوجہ کو کس قدر راحت اور فرحت ہوگی، اور اصل اس صورت کی قرآن و حدیث میں ہے، قال اللہ تعالیٰ:۔

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر، آیت ۹)

"ہم تم کو محض اللہ کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ"۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَنَعَ اِلَيْكُمْ مَعْرُوْفًا فَكَافِئُوْهُ فَاِنْ لَّمْ تُكَافِئُوْهُ فَاَثْنُوْا عَلَيْهِ خَيْرًا

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی پس تم اس کو اچھا بدلہ دو اور اگر بدلہ نہ دے سکو تو اس کی اچھی تعریف ہی کردو"۔

سبحان اللہ! کیا تعلیم ہے کہ محسن کو تو یہ سکھلایا کہ تم عوض یا شکریہ کی توقع مت رکھو اور محسن الیہ (جس پر احسان کیا جاوے) کو یہ بتلایا کہ تم عوض اور شکریہ کو اپنے ذمہ سمجھو، اور جیسا یہ ایک کلی تعلیم محسن و محسن الیہ (احسان کرنے والا اور جس پر احسان کیا گیا ہو) کو کی گئی، اسی طرح خاص معاشرتِ زوجین کے باب میں یہ خصوصیت کے ساتھ وارد ہے قولہ تعالیٰ تُرْجِيْ مَنْ

تَشَاۤءُ اِلیٰ قولہ ذٰلِكَ اَدْنیٰۤ اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ (علی تفسیر الحنفیۃ)

اس آیت میں ازواج مطہرات کو یہ عدم الزام حقوق (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ازواج پر حقوق لازم نہ ہونے کا حکم) سُناکر اس کا یہ اثر تصریحاً (وضاحت کے ساتھ) بیان فرمایا، ذٰلِكَ اَدْنیٰ، بس اس دستور العمل کی صحیح تقلید یہ ہے کہ زوجہ تو اپنے کسی حق کی شکایت نہ کرے، اور زوج اس کے حقوق سے زیادہ اس کی دل جوئی کرے، پھر انشاء اللہ غبار یا کدورت کا کبھی نام بھی نہ آئے گا، اور سب کی زندگی اس شعر کا مصداق ہوجائے گی ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را باکسے کارے نباشد

(بہشت وہ جگہ ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں، اور نہ کسی کو کسی سے کام ہے،،)

غرض اگر یہ یادداشت خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا دستور العمل رہے اور مضمون بالا عدل کا مردوں کا دستور العمل رہے تو جانبین کو حیات طیبہ (پاکیزہ زندگی) نصیب ہوجائے ۔

اِصلاحِ انقلاب

متعلق رضاع

اس باب میں ناواقفی کے سبب متعدد کوتاہیاں اور مختلف غلطیاں کی جاتی ہیں،

دودھ شریک بہن بھائی ہونے کے لئے ایک ہی زمانہ ہونا ضروری نہیں

منجملہ اُن کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ دودھ شریک بہن بھائی جب ہی ہوتے ہیں جب کہ ایک زمانہ میں کسی عورت کا دودھ پئیں، اور اگر ایک کے دودھ چھڑانے کے بعد دوسرا دودھ پیئے تو دودھ شریک بہن بھائی نہیں ہوتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بلکہ خواہ دونوں کے دودھ پینے کا زمانہ ایک ہو یا مختلف ہو دونوں حالتوں کا ایک ہی حکم ہے، یعنی دونوں حالتوں میں دودھ شریک بھائی بہن ہو جائیں گے،

حرمتِ رضاعت دو سال عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پینے پر ثابت نہیں ہوتا،

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ حرمتِ رضاع کے ثبوت کے لئے کسی عمر کی قید نہیں سمجھتے، حتیٰ کہ اگر غلطی سے کسی عورت کا دودھ آٹے میں جا گرے اور اس آٹے کی روٹی خاوند نے کھائی تو سمجھتے ہیں کہ حرمتِ رضاع ثابت ہوگئی، اور بی بی اس پر حرام ہوگئی، سو یہ بھی بالکل غلط ہے، بلکہ جو زمانہ بچے کے دودھ پینے کا ... شریعت نے مقرر کیا ہے، یعنی دو سال جمہور کے نزدیک اور اڑھائی سال امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک (اور اکثر حنفیہ نے بھی فتویٰ پہلے ہی قول پر دیا ہے) اس زمانہ کے اندر دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، پس صورتِ مذکورہ میں یہ بی بی اپنے شوہر پر حرام نہیں ہوئی، البتہ خود عورت کا دودھ پینا بعد مدتِ رضاع (بچے کے دودھ پینے کی مدت) کے ایک حرام فعل ہے، مگر اس سے رشتہ ثابت نہیں ہوگا،

مدتِ رضاع کے اندر دودھ پینے سے حرمتِ رضاع ثابت ہو جاتی ہے

منجملہ ان کے ایک غلطی اس غلطی کے مقابلہ میں

یہ کی جاتی ہے کہ مدت رضاع کے اندر اگر اس مدت کی تکمیل سے قبل بچہ کا دودھ چھڑا دیا جائے اور پھر کسی اتفاق سے یہ بچہ دودھ پی لے تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ خود یہ دودھ پلانا بھی حرام ہے، سو دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ اس صورت میں حرمتِ رضاع بھی ثابت ہوجائے گی، (فی الدر المختار ولو بعد الفطام) اور دودھ پلانا بھی حلال ہوگا،

گائے، بھیڑ، بکری کا دودھ ایک ساتھ پینے سے حرمتِ رضاع ثابت نہیں ہوتی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ حرمتِ رضاع کو عورت کے دودھ کے ساتھ خاص نہیں سمجھتے، بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بی بی گائے وغیرہ کا دودھ بھی ایک دوسرے کا جھوٹا پی لے تو وہ بھائی بہن ہوجاتے ہیں، سو یہ بھی بالکل لغو ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا (فی الدر المختار من ثدی آدمیۃ)

بچہ کے دودھ پی کر قے کر لینے سے حرمتِ رضاع زائل نہیں ہوگی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بچہ دودھ پی کر فوراً قے کر ڈالے تو حرمتِ رضاع بھی زائل ہوجاتی ہے، مجھ کو اس غلطی عوام کی پہلے اطلاع نہ تھی، مگر مجھ سے ایک واقعہ میں استفتاء کیا گیا (فتویٰ پوچھا گیا) تو میرے حرمتِ رضاع کے حکم بتلانے پر سائل نے یہ معارضہ کیا، کہ صاحب اس بچہ نے اوّل تو پیا تھا بہت قلیل اور پھر وہ اُگل دیا تھا، تو گویا وہ پینا باطل ہوگیا، تو حکم بھی ثابت نہ ہوگا، اُس وقت معلوم ہوا کہ بعض کا یہ بھی خیال ہے، سو خوب سمجھ لیا جائے کہ اس باب میں قلیل و کثیر (کم زیادہ) کا ایک حکم ہے، اگر ایک قطرہ بھی حلق کے اندر چلا جائے گا تو حکم رضاع ثابت ہوجائے گا (فی الدر المختار وان قل) اسی طرح اگر حلق میں جانے کے بعد قے بھی ہوجائے تب بھی حکم رضاع بدستور باقی رہے گا (وقد مرّ ایضاً حیث مرت المسئلۃ الاولیٰ من ہٰذا الباب)

حرمتِ رضاع جن جن صورتوں میں واجب ہوگی

اور خواہ مُنہ کے راستہ سے جائے یا ناک کے رستہ سے اور خواہ خالص دودھ جائے یا کسی دوا یا پانی میں ملا ہوا جائے اور ملنے کی صورت میں خواہ غالب ہو یا دوسری چیز کے ساتھ مساوی (برابر)، ہو، سب کا ایک حکم ہے، (کذا فی الدر المختار) یہ تو علمی غلطیاں تھیں۔

بچوں کو دودھ پلانے سے متعلق عملی کوتاہیاں:

شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو دودھ نہیں پلانا چاہیئے،

اور اس باب میں عملی کوتاہیاں بھی ہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ بعضی عورتیں (ایسی ہوتی ہیں) کہ جس بچہ پر رحم آیا اس کو دودھ پلا دیا، حالانکہ

بلا اذن شوہر کے کسی کو دودھ پلانا مکروہ ہے، البتہ اگر بچہ کے ہلاک ہوجانے کا اندیشہ ہو وہ حالت اس سے مستثنیٰ ہے، (کذا فی البحر من الخانیہ، شامی، ج ۲، ص ۶۶۴)

رضاعی بہن کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا جائز نہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اکثر مرد و عورت رضاع کے رشتہ سے باہم نسبی محارم (نسب کے اعتبار سے جن سے نکاح حرام ہے ان لوگوں) کی طرح خلا ملا رکھتے ہیں جس سے بڑے بڑے فساد واقع ہوگئے ہیں، فقہاء نے یہی رنگ دیکھ کر تصریح کی ہے کہ رضاعی بہن کے پاس تخلیہ (تنہائی) میں بیٹھنا ناجائز ہے، اسی طرح مصاہرت (دامادی) کے رشتہ میں گو وہ رشتہ حُرمت ہی کا ہو، جیسے جوان ساس یا سوتیلی ماں، ان سب مواقع میں حسب فتویٰ علماء نامحرموں کا سا برتاؤ کرنا چاہئے، یعنی پورا اور گہرا پردہ کیا کریں،

رشتہ نکاح کے وقت دودھ پلانیوالے سے تحقیق کرنا ضروری ہے منجملہ ان کے ایک کوتاہی یہ ہے کہ رضاع کے باب میں یہ احتیاط کوئی نہیں کرتا کہ دودھ پلانے والے سے تحقیق کرلیں کہ اس نے کس کس کو دودھ پلایا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایسی ہی لڑکی سے اس کا رشتہ کردیا جاتا ہے کہ اس نے بھی اس عورت کا دودھ پیا تھا، اسی واسطے فقہاء نے فرمایا ہے کہ عورتوں پر واجب ہے کہ بلا ضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلا دیا کریں، اور جب پلائیں تو خوب یاد رکھیں اور خوب شہرت دیدیا کریں، بلکہ احتیاطاً لکھ بھی لیا کریں، (شامی عن الفتح، ج ۲ ص ۶۶۴)

ہر کس و ناکس کا دودھ بچے کو پلانا درست نہیں منجملہ اُن کے ایک کوتاہی جو اولاد کے آداب و حقوق کے متعلق ہے، حرمت سے متعلق نہیں ہے، کہ ہر کس و ناکس کا دودھ بچہ کو پلا دیا جاتا ہے، جس سے اس کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، مناسب ہے کہ صحیح المزاج، سلیم الطبع، عاقل، صالح عورت کا دودھ پلوایا کریں،

اپنے دودھ پلانے والی کا احترام اور ادب کرنا ضروری ہے، منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر لوگ دودھ پلانے والی کا اگر وہ چھوٹی قوم سے ہو کچھ حق نہیں سمجھتے، اور اس کا کچھ احترام نہیں کرتے حالانکہ حدیثِ قولی سے جس میں غلام یا لونڈی اس کی خدمت میں پیش کرنے کی ترغیب ہے اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اور حدیث فعلی سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضعہ (دودھ پلانیوالی یعنی حلیمہ سعدیہؓ) کا اُن کے آنے کے وقت اکرام (عزت و احترام) فرمایا، اس کا احترام ثابت ہوتا ہے؛

نسبی ماں کا حق رضاعی ماں سے مقدم ہے منجملہ ان کے ایک غلطی جو اس کے مقابل جانب میں ہے یہ ہے کہ بعضے آدمی اس کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ خود نسبی (حقیقی) ماں کا حق بھی اس کی

ماں ہونے کے سبب اتنا نہیں سمجھتے جتنا دودھ پلانے کے سبب سمجھتے ہیں ؛ حتیٰ کہ خود ماں بھی چنانچہ بعض مواقع پر یہ کہتی ہیں کہ میں دودھ نہ بخشوں گی اور مخاطب ڈر جاتا ہے، بلکہ بعض کو اس فکر میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ کیا کریں ہماری ماں مرگئی اور ہم دودھ نہیں بخشوانے پائے، سو یہ اصلاً و فرعاً ہر طرح باطل ہے، اصلاً تو ظاہر ہے کہ ماں کا ہر حال میں حق منصوص ہے، اور فرعاً اس لئے کہ دودھ پینا بچے کے لئے کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے، جس کے ارتکاب کے بعد بخشوانے کی ضرورت ہو، اور اگر گناہ ہے تو بچہ اس وقت غیر مکلف (احکامِ شریعت کا شرعی اصطلاح میں پابند) تھا، ماں البتہ مکلف (احکامِ شریعت کی پابند) تھی، اس کو پلانا بھی گناہ ہوگا، وہ خود بھی گنہگار ہوئی کہ حرام چیز بچہ کو پلائی، خود اس کو اولاد سے معاف کرانا چاہئے، غرض یہ لغویات ہے،

فعلِ ناجائز کی کسی کی اولاد کو اجازت نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ اس دودھ پلانے کے سبب حضرت حلیمہؓ کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ اُن کی اولاد قرار دے کر ان کے لئے لوٹ مار جو کہ فعلِ حرام ہے حلال سمجھتے ہیں، بہت ہی سخت عقیدہ ہے، جب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے لئے کسی فعلِ ناجائز کی اجازت نہیں تو آپؐ کی مرضعہ (دودھ پلانے والی) کی اولاد کا تو ان کی نسبت بعید ہی تعلق ہے، پھر سب بدوؤں کا اُن کی اولاد میں ہونا یہ بھی مہمل حکایت ہے،

فرع قابلِ توجہ اہلِ علم

فقہاء نے رضاع کی تفسیر میں آدمیت کی قید لگائی ہے، اور اس کو محترز بہیمیت در جبل (جانور اور آدمی کے دودھ سے بچنے) کو لکھا ہے، مگر جنّیہ سے اثباتاً یا نفیاً (ہاں یا نہ میں) تعرض (بحث) نہیں دیکھا گیا، کہ آیا وہ اس باب میں بہیمہ (جانور) کے مثل ہے، جیسے نکاح کے باب میں یہی ہے کہ جنّیہ سے انسان کا نکاح جائز نہیں، یا مثل آدمی کے ہے، کہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کسی جنّیہ کا دودھ پئیں تو وہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہو جائیں گے، جب تک مسئلہ کی تحقیق نہ ہو احوط موقعِ اشتباہ (شک کے موقع پر زیادہ احتیاط پر عمل کرنے) میں عملاً یہی ہوگا کہ حرمتِ رضاع کا فتویٰ دیا جاوے، جیسے اڑھائی سال پر گو فتویٰ نہیں مگر احتیاط وہاں بھی یہی ہے کہ باوجود ممانعت کے اگر اس مدت کے اندر رضاع واقع ہو تو حرمت پر عمل کریں،

تنبیہ : رضاع کے مسائل نہایت دقیق (باریک) ہیں، ان میں بدون محقق متیقظ عالم (بیدار مغز تحقیق سے کام لینے والے عالم) کے کسی نیم آموز (کم علم) کے قول کو معتبر نہ سمجھیں، اور سوال کے سمجھنے سمجھانے میں بھی بہت ہی احتیاط (ہوشیاری و بیداری سے کام لیں، فقط،

ابوابُ الطلاق
وَمَا يَلحَقُ بِہٖ

طلاق سے متعلق کوتاہیوں کا بیان ابوابِ احکام میں سے یہ باب بھی ایک وسیع باب ہے، اس لئے اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں بھی اہتمام کے ساتھ ظاہر کرنے کے قابل ہیں،

مصلحت اور ضرورت کے موقع پر طلاق موجبِ عار نہیں منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اس کے ایقاع (یعنی طلاق دینے) کے متعلق بہت افراط و تفریط ہو رہا ہے، چنانچہ بعضے لوگ تو طلاق دینے کو اس قدر عار و عیب سمجھتے ہیں کہ خواہ کیسی ہی مصلحت و ضرورت ہو اور خواہ باہم زوجین (میاں بیوی) میں کتنی ہی نااتفاقی ہو، جس سے ایک یا دونوں حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوں، اور خواہ زوجہ میں کسی درجہ کی بد دینی ہو جس کی اصلاح شوہر کی قدرت سے خارج ہو گئی ہو، چنانچہ یہی اسباب ہیں مشروعیتِ طلاق (طلاق کے مشروع ہونے) کے (چنانچہ عورت کے موذی ہونے یا بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ ہونے کی صورت میں فقہاء نے طلاق کو مستحب اور مرد کی طرف سے عورت کے حقوق ادا نہ ہو سکنے کی صورت میں واجب کہا ہے کما فی ردالمحتار) مگر پھر بھی خلافِ وضع خاندانی ہونے کے خیال سے اس کو گوارہ نہیں کرتے، اور عمر بھر اپنی زندگی یا زوجہ کی زندگی تلخ کرتے ہیں اور اس ناگواری کا سبب اس کا ابغض المباحات (جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ) ہونا نہیں ہے، کیونکہ وہ ان مصالح و ضرورت کے وقت وہ مباح مطلق ہے، بلا مبغوضیت کے (بالکل جائز، بغیر ناپسندیدگی کے) اور جب اس کا استحباب یا وجوب (مستحب یا واجب ہونا) بعض صورتوں میں ثابت ہے، اور استحباب و وجوب کا مبغوضیت (مستحب اور واجب کا ناپسندیدگی) کے ساتھ مجتمع ہونا محال ہے (جمع ہونا ناممکن ہے) اور قرآن مجید میں نص ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، اور حدیث رزین میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تھا، پھر اُن کے عرض کرنے پر طلاق نہیں دی (کذا فی المشکوٰۃ) اسی طرح صحابہؓ

سے بکثرت منقول ہے (کذا فی رد المحتار) تو پھر علی الاطلاق اس کو مبغوض کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ یہ مبغوضیت اسی صورت میں ہے جبکہ کوئی داعی معتد بہ (قابلِ اعتبار محرک) نہ ہو، اس وقت بے شک مکروہ ہے، (نقلہ فی الدر المختار عن الکمال) اور حلال ہونا مبغوضیت کے منافی نہیں، کیونکہ حلال مکروہ کو بھی شامل ہے، تو حلال کی تفسیر یہ ہوگی:۔

ما لیس فعلہ بلازم الشامل المباح والمندوب والواجب والمکروہ کما قال الشمنی ونقلہ فی رد المحتار عن البحر،

(ایسا فعل جس کا کرنا ہی لازم نہ ہو اس میں مباح، مستحب، واجب اور مکروہ سب ہی شامل ہیں، جیسا کہ شمنی نے کہا اور اسے رد المحتار نے بحر الرائق سے نقل کیا۔)

طلاق کو حد درجہ معیوب سمجھنے کی عملی خرابیاں

اس درجہ میں معیوب سمجھنے پر مفاسدِ عملیہ متفرع ہوتے ہیں (یعنی عملی زندگی میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں) کہ ایسے لوگ اگر کبھی جوشِ غضب میں مغلوب (بے قابو) ہو کر طلاق دے گزرتے ہیں، تب بھی طوقِ عار (شرمندگی) سے بچنے کے لئے اس کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، اور خواہ شرعاً اس کا تدارک ممکن ہو یا نہ ہو مگر وہ اس کا قصد کرتے ہیں، چنانچہ اکثر باوجود تین طلاق واقع ہو جانے کے اس کو پھر اپنے گھر بی بی بنا کر رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ چھوڑنے میں ذلت و بدنامی ہے، اور افسوس ہے کہ بدکاری میں ذلت و بدنامی نہیں سمجھتے، حالانکہ اس میں طلاق سے زیادہ ذلت و بدنامی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی رسوائی و عقوبت (سزا) کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، کہ کس قدر ہوگی، پھر ان میں جو بددین و بے باک و نڈر ہیں ان کو تو حرام و حلال کی کچھ پرواہ ہی نہیں، کھلم کھلا حرام کرتے ہیں، پھر اگر عورت بھی ایسی ہی ہوئی، تب تو خوشی بخوشی حرام کا کارخانہ قائم رہتا ہے، اور اولاد حرام کی ہوتی چلی جاتی ہے، اور اگر عورت خدا ترس ہوئی اور اس نے کچھ عذر و انکار کیا تو اس پر ظلم کیا جاتا ہے، اور دوہرے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے، زنا بھی اور ظلم بھی، مگر عورت پر واجب ہے کہ جس قدر قدرت ہو اس سے بچے، اور جب تک جان کا اندیشہ نہ ہو اس سے موافقت نہ کرے، اور جو ذرا دین کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اوّل تو اس تدارک کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچتے ہیں، خواہ چلیں یا نہ چلیں، مثلاً کسی مجتہد جدید (موجودہ زمانہ میں اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے) سے سن لیا، کہ تین طلاقیں ایک دم سے دینے سے ایک ہی طلاق ہوتی ہے، جس میں رجعت[1] یا تجدید نکاح بلا حلالہ[2] جائز ہے، بس اس قول کو لے لیا، اور کہتے ہیں کہ آخر

---

[1] ایک یا دو طلاق کے بعد شوہر کو حق حاصل ہو کہ عدت پوری ہونے سے پہلے طلاق سے رجوع کر سکتا ہے، جس سے اس کی بیوی نکاح سے نہیں نکلتی، اس میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں ۱۲ نجیب [2] عدت گذرنے کے

وہ بھی تو عالم ہیں، ان کے قول پر بھی عمل جائز ہے، حالانکہ اپنے محل پر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ قول بالکل صحیح نہیں اور نہ اُس پر عمل جائز ہے، وانظر مانقل فی ردّ المحتار عن الفتح فی قول اکثر الطلاق رصفحہ ۶۸۵ ج ۲)

مفتی کے سامنے جہلاء کے جاہلانہ اشکالات

یہ تو مدعیانِ علم (علم رکھنے کا دعویٰ کرنے والوں) کے حیلے ہیں اور جہلاء اور بھی جاہلانہ باتیں نکال کر اہل فتویٰ سے مزاحمت (جھگڑا) کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ صاحب نیت تھوڑا ہی تھی طلاق دینے کی، حالانکہ طلاقِ صریح میں نیت شرط ہی نہیں کوئی کہتا ہے کہ صاحب ویسے ہی غصہ میں نکل گیا تھا، خوشی سے نہیں کہا، حالانکہ طلاق کا غصہ میں ہی وقوع ہو جاتا ہے، غایت ما فی الباب (زیادہ سے زیادہ اس معاملہ کی) ایسی طلاق کو مکروہ کہیں گے، مگر وقوع میں کوئی شبہ نہیں، اور جب سب تدبیروں میں ناکامی ہوتی ہے، بس اخیر فیصلہ ان لوگوں کے یہاں یہ ہوتا ہے (اور بعض جگہ خود عورتیں اس کی درخواست کرتی ہیں) کہ خیر میاں بی بی کی طرح نہ رہیں گے مگر گھر ہی میں رکھا جائے، اور نان و نفقہ دیا جایا کرے تاکہ طلاق کا نام نہ ہو اور دوسرے نکاح کی حاجت نہ ہو،

طلاق کے بعد عورت کا حکم مثل اجنبیہ کے ہے،

سو اس عمل میں بھی طرح طرح کے مفاسد ہیں، مثلاً ایک مکان میں رہنے کی صورت میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت ایسی خلوت ہو کہ اُس مکان میں بجز اس مرد و عورت کے کوئی نہ رہے، تو خلوت بالاجنبیہ (اجنبی عورت سے تنہائی میں ملاقات) لازم آتی ہے، جو کہ حرام ہے، پھر چونکہ ان مرد و عورت میں ایک زمانہ تک بے تکلفی رہ چکی ہے اس لئے دوسری اجنبیات (اجنبی عورتوں) کی نسبت اس میں زیادہ احتمال ہے کہ یہ دونوں کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں، نیز اپنی پچ بھرنے کے لئے مرد کو تمام عمر کے لئے نان و نفقہ کا مقید کیا جاتا ہے، اور عورت کو تمام عمر کے لئے نکاح سے محبوس (مقید) کیا جاتا ہے، پہلا فعل گویا مباح کا ایجاب (قبول کرنا) ہے اور دوسرا فعل گویا مباح کی تحریم (حرام کرنا) ہے، اور دونوں میں عملاً اعتداء عن الحدود (حدود سے تجاوز کرنا) ہے، جو کہ نصاً مذموم ہے،

طلاق میں افراط اور تفریط دونوں مذموم ہیں

اور اُسے عار سمجھنے کی فرع یہ ہے کہ بعض اوقات زوجہ سے شرعاً تمتع جائز نہیں رہتا، مگر اس کو طلاق نہیں دیا جاتا، پس وہ نہ اس کے کام کی رہی نہ دوسرے کے کام کی، مثلاً یہ عورت زوج پر حرمتِ مصاہرت کے سبب حرام ہو گی، اور حرمتِ مصاہرت سے نکاح مرتفع (ختم) نہیں ہوتا، صرح الفقہاء (فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے) مگر تمتع بھی اس سے درست نہیں رہتا، ایسی صورت میں بجز طلاق کے دیدینے کے اور کوئی صورت نہیں، مگر

مگر اس عار (شرم) کے سبب طلاق نہیں دیتے، پھر یا تو اس سے متمتع ہوتے رہتے ہیں، اور یا اس کو معلقہ کر کے گھر میں ڈالے رکھتے ہیں، یہ تو اہلِ افراط کی حالت ہے، بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں یہ تفریط کرتے ہیں، کہ طلاق دینے سے ذرا نہیں رُکتے، اُن کے لئے ادنیٰ (معمولی) بہانہ کافی ہوجاتا ہے، حالانکہ بلا سبب قوی اس کی اجازت نہیں، حدیث:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ الطَّلَاقُ (رواہ ابوداؤد)	(یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔)

اسی صورت میں ہے، اور ایسی ہی طلاق سے اس آیت میں منع فرمایا ہے،

فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا، (النساء، آیت ۳۴)	(پھر اگر وہ تمھاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو اُن پر بہانہ مت ڈھونڈو۔)
ای لا تطلبوا الفراق، فسرہ به الشامی؛	شامی نے اس کی تفسیر جدائی کا طریقہ اختیار کرنے سے کی ہے۔

اور ایسی طلاق بلا وجہ میں اتنے ممنوعات (برائیوں) کا ارتکاب ہے، حماقت وسفاہت رائی وکفرانِ نعمت نکاح وایذار رسانی بزوجہ وبخاندانِ زوجہ وبہ اولادِ زوجہ [عه] (کذا فی رد المحتار) اور زوجہ کا ذلیل اور بدنام کرنا علاوہ برآں (اس کے علاوہ) کیونکہ اس پر کوئی شبہ بدکاری کا کرے گا، کوئی بدخلقی (برُے اخلاق) کا کرے گا تو دوسری جگہ اس کا نکاح مشکل ہوگا تو تمام عمر اس کی مصیبت میں گذرے گی، اس مقام پر مجھ کو ایک عبارت یاد آئی جو میرے ایک دوست نے میرے پاس اس مضمون کے متعلق لکھ کر بھیجی تھی، اس کو نقل کرتا ہوں:۔

فی فتح القدیر فمن المبیحة ان یلقی الیه عدم اشتهائها بحیث یعجز او ینظر باکراهه نفسه علی جماعها فهذا اذا وقع فان کان قادرا علی طول غیرها مع استبقائها ورضیت باقامتها	"فتح القدیر میں ہے کہ طلاق کو مباح قرار دینے والی صورتوں میں سے ایک یہ بات ہے کہ خاوند کے دل میں بیوی سے متعلق عدمِ اشتہار ڈال دیا جائے اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو عورت کے ساتھ جماع کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود عاجز ہو یا ایسا کرنے

[عه] یعنی بلا ضرورت طلاق دینے سے اتنے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی، اس لئے مذکورہ حالت میں طلاق مکروہ ہے، (احقر قریشی)

فی عصمۃ بلا وطی او بلا قسم فیکرہ طلاقہ کما کان بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سودۃ و ان لم یکن قادرا علیٰ طولہا اولم ترضی ھی بلک بترک حقہا فہو مباح لان مقلب القلوب رب العلمین ؎	ے اُسے ضرر پہنچے، تو یہ معاملہ جب واقع ہو اگر اس وقت وہ دوسری عورت پر جماع کے لئے قادر ہو، اور اگر وہ عورت بغیر وطی یا بغیر نوبت کے اس کے نکاح میں رہنے پر راضی ہو تو پھر اُس عورت کو طلاق دینا مکروہ ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم اور حضرت سودہؓ کے درمیان ایسا تھا، اور اگر وہ اپنے حق کو چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہو تو طلاق مباح ہے، اس لئے کہ دلوں کو پھیرنوالے رب العلمین ہیں ؎

بلا ضرورتِ شدیدہ طلاق مانگنا سخت ممنوع ہے،

اسی تفریط کے قبیل سے ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر شوہر سے طلاق مانگتی ہیں، اس باب میں حدیث میں سخت وعید آئی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عورت بدون کسی ضرورت شدیدہ کے اپنے شوہر سے طلاق کی درخواست کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، روایت کیا اس کو احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ و دارمی نے (کذافی المشکوٰۃ)

کسی دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست بھی ممنوع ہے

اور جس طرح اپنے لئے طلاق مانگنا ممنوع ہے اسی طرح دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست کرنا، مثلاً کسی مرد نے اس سے نکاح کی درخواست کی جس کے نکاح میں ایک عورت ہے، اور یہ اُس سے یہ کہے کہ پہلی بی بی کو طلاق دیدو تب نکاح کروں گی، اس سے بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے، اور اپنی قسمت پر راضی رہنے کا حکم آیا ہے، اس حدیث کے الفاظ اس وقت یاد نہیں، ایسے الفاظ ہیں:

لا تسأل طلاق اختہا لتکفئ مافی انائہا،	(" اپنی بہن کے لئے طلاق کا سوال مت کر اس غرض سے کہ تو اس کے برتن کی چیز بھی حاصل کرلے")

تین طلاق ایک دم دینا گناہ ہے

ایک کوتاہی طلاق کے باب میں یہ شائع ہے کہ جب طلاق دیتے ہیں تین ہی دیتے ہیں، اس طرف رُکتے نہیں، سو ایسا کرنا اوّل تو گناہ ہے، کما فی الدر المختار:-

ویحرم لو بدعیا الیٰ ان قال والبدعی ثلث متفرقۃ او ثنتان بمرۃ او مرتین فی طہر واحد	(" اگر طلاقِ بدعت ہو تو حرام ہے، اور ...... طلاقِ بدعی تین طلاقیں ہیں، الگ الگ یا دو طلاقیں ایک ہی دفعہ

لا رجعة فيه او واحدة في طهر وطئت فيه او واحدة في حيض موطوءة في رد المحتار قوله ثلث متفرقة وكذا بكلمة واحدة بالاولى ام

یا دو مرتبہ ایک طہر میں جس میں رجوع نہ کیا ہو یا ایک طلاق ایسے طہر میں جس میں وطی کی گئی ہو یا ایک طلاق ہے موطوئہ کے ایامِ حیض میں' رد المحتار میں ہے مصنف کا قول تین طلاق الگ الگ' اس ایک لفظ سے تین طلاق دینا بدرجۂ اَولیٰ بدعت ہوا "،

تین طلاق ایک ساتھ دینے کے دنیوی مفاسد

اور علاوہ گناہ کے یہ دنیوی مصلحت کے بھی اس لئے خلاف ہے کہ بعض اوقات بعد طلاق کے آدمی نادم ہوتا ہے، تو اگر ایک طلاق دیا ہو تو اگر وہ رجعی ہو تب تو رجعت کر کے اس کا تدارک کر سکتا ہے، اور اگر بائنہ ہے تو گو رجعت نہیں ہو سکتی لیکن زوجہ کی رضامندی سے نکاحِ جدید تو ہو سکتا ہے، بہر حال تدارک تو آسانی سے ممکن ہی، ایک صورت میں محض ارادۂ زوج سے ایک صورت میں ارادۂ زوجین سے، اور تین ہیں تو دونوں کے ارادہ سے بھی کوئی تدارک ممکن نہیں، جب تک کہ تیسرا آدمی حلالہ کرنے والا نہ ہو، پھر اس حلالہ کا تدارک ہونا بھی مشکوک (مشتبہ) ہے، کیونکہ اگر حلالہ کرنے والے سے یہ شرط ٹھیرائی جائے کہ صحبت کر کے اس کو طلاق دیدینا تب تو اس فعل سے حدیث میں لعنت آئی ہے، محلِّل (حلالہ کرنے والے) پر بھی اور محلَّل لہ (جس کے لئے حلالہ کیا جائے) اس پر بھی، اور فقہاء نے اس کو مکروہ تحریمی کہا ہے (کذا فی الدر المختار) اور پھر شرط کے بعد بھی طلاق دینا اس کے اختیار میں ہے، زوجین کے اختیار سے خارج ہے، اور اگر یہ شرط ٹھیرائی تو اس صورت میں تدارک کا بعید تر ہونا اور بھی ظاہر ہے، سو تین طلاق میں یہ خرابی ہے،

ایک طلاق بائن دینا بھی بدعت ہے

بلکہ بعض فقہاء نے واحدہ بائنہ (ایک طلاق بائن) کو بھی بدعی کہا ہے جو کہ حرام ہے، کما فی رد المحتار؛

فالواحدة البائنة بدعية في ظاهر الرواية (ص ۶۵۵ ج ۲)

"یعنی ایک بائن طلاق بھی ظاہر روایت کے اعتبار سے بدعی طلاق ہے"،

کیونکہ جو مصلحت تھی توسیعِ عدد (تعدادِ طلاق کے زیادہ ہونے) میں کہ شوہر کو اگر ندامت ہو تو تدارک اس کے قبضہ میں ہو، یہ مصلحتِ واحدہ بائنہ میں بھی فوت ہوئی ہی، اس مصلحت کا اس عبارت میں ذکر ہے،

ومنها شرعه ثلثا لان النفس

"اور اسی قبیل سے تین طلاق کی مشروعیت ہی کیونکہ

کذوبة بما تظهر عدم الحاجة الیہا ثم یحصل الندم فشرع ثلثًا لیجرب نفسہ وثانیًا اھ ردالمحتار عن فتح القدیر ص ۶۸۴ ج ۲)

نفس جھوٹا ہے، اس کی ضرورت نہ ہونے کا اظہار کرتا ہے، پھر نادم ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے تین طلاقیں مشروع کیں تاکہ اس کے نفس کو سوچنے سمجھنے کا اچھی طرح موقع مل جائے۔

حیض اور نفاس کی حالت میں طلاق دینا گناہ ہے

اسی طرح طلاق دینے کے وقت اس کا خیال نہیں رہتا کہ یہ اس وقت حائضہ (حیض والی) تو نہیں یا اگر غیر حائضہ ہے تو اس طُہر میں اس سے ہمبستری تو نہیں ہوئی، حالانکہ حالتِ حیض میں یا ایسے طُہر میں جس میں ہمبستری ہوگئی ہو طلاق دینا گناہ ہے، (کمامر عن الدر المختار) اور نفاس میں طلاق دینا ایسا ہی ہے جیسے حیض میں طلاق دینا (شامی، ج ۲ ص ۲۹۰)

غصہ یا ہنسی میں طلاق دینے سے طلاق ہوجاتی ہے

ایک غلطی طلاق کے باب میں بعض جہلاء میں یہ ہے کہ ہنسی میں یا غصہ میں بی بی کو طلاقن کہہ کر پکارتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق نہیں ہوئی، حالانکہ اس سے بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے[1]،

طلاق کی تعداد صرف تین تک ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سُن لیا کہ اگر ایک طلاق دے کر رجوع کرلے تو نکاح بدستور قائم رہتا ہے، تو اس مسئلہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی بار ایسی حرکت کرے ہمیشہ رجعت جائز ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، طلاق کی حد ہی تین ہے، خواہ ایک بار یا دو بار یا تین بار میں، اور خواہ درمیان میں رجعت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، پس اگر کسی نے ایک طلاق رجعی دے کر رجعت کرلی، یہ رجعت درست ہے، کیونکہ ایک طلاق کے بعد ہوئی، پھر اگر دوسری طلاق رجعی دے کر پھر رجعت کرلی یہ رجعت بھی درست ہے، کیونکہ یہ رجعت دو طلاق کے بعد ہوئی، اور اس کو دو طلاق کے بعد اس لئے کہا جائے گا کہ اس دوسری طلاق کے ساتھ اس پہلی طلاق کو بھی شمار کیا جائے گا، اگرچہ رجعت ہوچکی تھی، سو رجعت سے طلاق

[1] مشکوٰۃ میں بروایت ترمذی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جو ارادہ کرنے سے بھی واقع ہوجاتی ہیں، اور ہنسی دل لگی میں بھی وقوع پذیر ہوجاتی ہیں، اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (یعنی طلاق دے کر پھر رجوع کرلینا)

(بندہ احقر قریشی غفرلہٗ)

کا اثر جاتا رہا، مگر طلاق کی ذات موجود ہے، پھر اگر اس نے تیسری طلاق دی اب رجعت درست نہیں، کیونکہ حسب تقریر مذکور یہ تین طلاق کے بعد رجعت ہوئی، اور تین طلاق کے بعد رجعت درست نہیں، اسی طرح اگر ایک یا دو طلاق کے بعد رجعت نہ کی ہو اور عدت گذارنے سے وہ نکاح زائل (ختم) ہوگیا ہو اور پھر دونوں نے راضی ہو کر باہم نکاح کرلیا ہو اور پھر اتفاق طلاق دینے کا ہو تو اس طلاق کے وقت پھر سابق طلاقوں کو جمع کیا جائے گا، جب جمع ہو کر مجموعہ تین ہوجائے گا پھر رجعت جائز نہ رہے گی، البتہ صرف ایک صورت ہے پہلی طلاق کے کالعدم ہوجانے کی، اور وہ صورت یہ ہے کہ اس شوہر کے بعد عدت گزار کر اس عورت نے دوسرے شوہر سے نکاح کرلیا، اور اس نے ہمبستری کے بعد طلاق دیدی، یا ہمبستری کے بعد مرگیا، اور پھر یہ شوہر اول کے نکاح میں آگئی، اب البتہ پہلی طلاقوں کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، یعنی یہ از سر نو تین طلاقوں کا مالک ہوجائے گا، جس طرح اپنے نکاح اول میں تین طلاق کا مالک تھا، مگر یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس میں خلاف کیا ہے، اور دونوں کی ترجیح میں علماء نے اختلاف کیا ہے، (الدر المختار ورد المحتار، ج ۲ ص ۸۶۳)

تنبیہ: - یہ دربارتک رجعت طلاقِ رجعی میں ہے، بائنہ میں نہیں، تفصیل اس کی فقہ میں ہے، اور بقدرِ ضرورت بہشتی زیور میں بھی ہے، ملاحظہ کرلیا جائے، فقط

وسط ماہِ شعبان ۱۳۳۷ھ

شوہر کی تنہائی میں طلاق کا مسئلہ ایک عام غلطی باب طلاق میں یہ ہے کہ بعض اوقات منکوحہ دعویٰ کرتی ہے کہ شوہر نے مجھ کو طلاق دیدی ہے، مگر کوئی گواہ پیش نہیں کرسکتی، تنہائی میں طلاق دینا بیان کرتی ہے، اس موقع میں لوگ دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں، اکثر تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہونے کا حکم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر بدون گواہوں کے عورت کے قول کا اعتبار کرلیا جائے تو بس عورتیں تو خوب آزاد ہوجائیں گی، ذرا شوہر سے اَن بَن ہوئی اور طلاق کا دعویٰ دھر مارا، اور بعضے عورت کی بیکسی پر ترحم کرکے اور قرائن عادیہ سے کام لے کر (کہ عورت کی مقابلہ شوہر کے کب جھوٹ بولنے کی ہمت ہوتی ہے، یا یہ کہ عورت شوہر سے جدا ہونے کو کب گوارا کرتی ہے، اگر وہ طلاق نہ دیتا تو بھلا عورت کو ایسے دعوے کی کیا ضرورت تھی) طلاق واقع ہونے کا حکم کردیتے ہیں، حالانکہ دونوں فریق کے استدلالات لچر ہیں، فریق ثانی کا تو ظاہر ہے کہ اس کے خلاف کا کثرت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے، بہت عورتیں بیباک بھی ہوتی ہیں، اور جھوٹ بھی بولتی ہیں، اور شوہر سے نفرت رکھنے والیاں بھی بہت ہیں، اور فریق اول کا اس لئے کہ کوئی اس کے مقابلہ میں یوں کہہ سکتا ہے کہ اگر عورت کی علی الاطلاق

تکذیب کر دی جائے تو جن صورتوں میں شوہر قصداً تنہائی میں اس لئے طلاق دے کہ دعوے کے وقت انکار کر سکوں اور عمر بھر اس کو پریشان کروں تو عورتیں سخت قید میں اور ظلم میں گرفتار ہو جائیں گی، یہ تو معارضہ ہے، اور اس فریق کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب کہ ہم یہ حکم دیں کہ طلاق واقع ہو گئی، سو اس حکم کے لئے بے شک گواہوں کی ضرورت ہے، بدون گواہوں کے ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا، لیکن اگر یہ حکم نہ دیا جائے، کیونکہ غیب کی خبر تو اللہ تعالیٰ کو ہے، بلکہ عورت کو یہ مسئلہ بتلایا جائے کہ اگر واقعی اس نے تیرے سامنے طلاق دی ہے تو تجھ کو اس سے علیحدہ رہنا چاہیئے جس صورت میں رجعت ناجائز ہو اس سے ہمبستر نہ ہونا چاہیئے، تو اس حکم میں یہ واقع نہ ہوگا، غرض حکم بالطلاق اور چیز ہے اور حکم بصون النفس لشرط طلاق اور چیز ہے،

غصہ اور مذاق میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسے ہی بطور ہزل (مذاق) کے منہ سے لفظ طلاق نکال دیتے ہیں، مگر ان کا قصد طلاق دینے کا نہیں ہوتا، تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ تکلم تو بالقصد (بات کرنا تو ارادہ کے ساتھ) ہوا ہے، گو اس کے ساتھ اس کے معنی کے واقع ہونے کا قصد نہیں ہوا، بلکہ اس کے عدمِ وقوع (واقع نہ ہونے) کا قصد ہوا ہے سو یہ شریعت میں معتبر نہیں، بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ غصہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی، یہ بھی غلط مسئلہ ہے، طلاق غصہ میں بھی واقع ہو جاتی ہے، اور طلاق تو اکثر غصہ میں ہی دی جاتی ہے،

زبردستی سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے،

بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی زبردستی کسی سے طلاق دلوا دے تو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بات بھی صحیح نہیں، اکراہ (زبردستی) میں بھی طلاق واقع ہوتی ہے، گو اکراہ کرنے والے پر مواخذہ ہو، جیسے کوئی زبردستی کسی کو کسی سے پٹوا دے تو کیا اس ضرب کا اثر نہ ہوگا، یعنی چوٹ نہ لگے گی؟

طلاق کا لفظ منہ سے نکالتے ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے،

اسی طرح تلفظ بالطلاق (طلاق کا لفظ زبان سے نکالنے) کا اثر وقوعِ طلاق (طلاق کا واقع ہونا) ہے وہ بھی واقع ہو جائے گی، اسی طرح اگر منہ سے لفظ طلاق قصداً نہ کہے، بلکہ ویسے ہی منہ سے بلا ارادہ نکل گیا، یا کوئی شخص الفاظ طلاق کے معنی نہ جانتا ہو کچھ اور مطلب سمجھ کر منہ سے کہہ دیا تو ان دونوں صورتوں میں قضاءً (دنیاوی فیصلہ کے اعتبار سے) تو طلاق کا وقوع ہو گیا، یعنی عورت کو جائز نہیں کہ اس سے تعلق زوجیت کا

رکھے بلکہ مرد کو بقدر قدرت روکے، اور اگر روکنے پر قدرت نہ رہی بلکہ اندیشہ جان کے تلف (ضائع) ہونے کا یا ظلم شدید کا ہو جس کا تحمل نہ ہو سکے تو پھر اس عورت پر گناہ نہ ہوگا، لیکن اگر فرضاً عورت کو اس واقع کی اطلاع نہ ہو تو مرد پر یہ واجب نہیں کہ اس کو اطلاع کرے، بلکہ یہی سمجھے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی،

بلاقصور بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ بے قصور طلاق دینے سے طلاق نہیں ہوتی، یا بلا رضامندی عورت کے طلاق نہیں ہوتی، سو یہ دونوں باتیں بھی غلط ہیں، دونوں حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، گو بلاقصور ایسا کرنا سخت مذموم ہے،

نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نشہ کی حالت میں مثل مجنون کے غیر مکلف ہوتا ہے اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، اس کا حکم مجنون کا سا نہیں ہے، البتہ اگر کسی حلال چیز کے کھانے سے ضعفِ مزاج ... (طبیعت کی کمزوری) کے سبب نشہ ہو گیا اس نشہ کا حکم مثل مجنون کے ہے، کہ اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہ ہوگی،

کلمۂ کفر زبان سے نکل جانے پر تجدیدِ نکاح ضروری ہے، بعض لوگ صرف طلاق ہی کو مزیلِ نکاح (نکاح ختم کرنے والی) سمجھتے ہیں یعنی زوالِ نکاح کو صرف طلاق میں منحصر سمجھتے ہیں، چنانچہ اس بنا پر اگر کسی سے کلمۂ کفر صادر ہو جائے تو تجدیدِ ایمان کی تو ضرورت سمجھی جاتی ہے مگر تجدیدِ نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے، حالانکہ مرتد ہو جانا بھی سبب زوالِ نکاح ہے، بعد تجدیدِ ایمان کے تجدیدِ نکاح بھی واجب ہے۔

شوہر کو باپ یا بھائی کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض ایسے اسباب کو موجبِ حرمت سمجھتے ہیں جو واقع میں مزیلِ حلّت (حلال ہونے کو ختم کرنیوالا) نہیں، جیسے عورت اپنے شوہر کو باپ یا بھائی کہہ دے تو اس سے نہ طلاق ہو، نہ وہ اس پر حرام ہو، یعنی ظہار بھی نہیں ہوتا، بلکہ اگر مرد بھی عورت کو یہ کہہ دے کہ تو میری ماں ہے یا بہن ہے تب بھی ایک لغو بات تو ہے لیکن اس کا اثر نکاح پر یا حلّت پر کچھ بھی نہیں ہوا، البتہ بعض الفاظ سے ظہار ہو جاتا ہے، تو وہ خاص خاص الفاظ ہیں، جو مع اپنے حکم کے کتبِ فقہ میں مذکور ہیں،

ایلاء اور اس کا حکم ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض اسبابِ طلاق کو اسبابِ طلاق نہیں سمجھتے، بیان اس کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ میں اپنی بی بی کے پاس کبھی نہ جاؤں گا، اور وہ مدت چار مہینے یا چار مہینے سے زائد ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینے سے پہلے اس نے قسم

توڑ دی اور بی بی کے پاس چلا گیا تب تو نکاح باقی رہا اور صرف کفارۂ قسم کا دینا پڑے گا، اور اگر چار مہینے اپنی قسم پر رہا تو چار مہینے گزرنے پر اس عورت پر طلاق بائن واقع ہو گئی، اس کو ایلاء کہتے ہیں، اور اگر وہ مدت چار مہینے سے کم ہے تو اس میں طلاق تو کسی حال میں واقع نہیں ہوتی صرف تفصیل یہ ہے کہ اگر قسم پوری کر دی تو خیر اور اگر قسم توڑ دی تو صرف کفارۂ[1] قسم کا دینا پڑے گا،

فسخ نکاح بدونِ قاضی مسلم کے فیصلہ کے نہیں ہو سکتا، بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ انھوں نے یہ مسئلہ سُنا کہ اگر بجز باپ یا دادا کے کوئی اور ولی نابالغ عورت کا نکاح کر دے تو گو اس وقت نکاح تو ہو جاتا ہے مگر بالغ ہو کر اس کو فسخ کرنا جائز ہے، اور اس کو سُنکر یہ سمجھے کہ صرف اس عورت کا فسخ کر دینا کافی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس مسئلہ میں اوّل تو متعدد شرائط ہیں، دوسرے ان شرائط کے بعد بھی فسخ بدون حکم قاضی یعنی حاکم مسلم کے نہیں ہو سکتا، اور غیر مسلم عدالت کا فسخ یا تفریق کافی نہیں، جب تک ایسا نہ ہو نکاح صحیح اور مکمل ہے،

شوہر کے باپ کو اپنی بہو کو طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں، بعضے لوگ اس غلطی میں (مبتلا) ہیں کہ نابالغ کی بی بی کو یا مجنون (پاگل) کی بیوی کو اس نابالغ یا مجنون کا باپ طلاق دے سکتا ہے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بجز شوہر کے یا شوہر جسکو اختیار دیدے یعنی وکیل بالطلاق کے اور کسی کو طلاق دینے کا اختیار نہیں،

کسی کا خط بغیر اجازت کھولنے سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوتی، بعضے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی خط کے لفافہ پر مثلاً یہ لکھدیتے ہیں کہ اگر کوئی یہ خط کھولے تو اس کی بی بی پر طلاق، اور وہ لکھنے والے بھی اور بہت سے دیکھنے والے بھی یوں سمجھتے ہیں کہ جو کوئی کھولے گا اس کی بی بی پر طلاق واقع ہو جاوے گی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ اسی قاعدۂ مذکورہ مسئلہ متصلہ (جو مسئلہ اس سے پہلے مذکور ہے) کی بناء پر یہ سمجھنا بھی محض غلط ہے اس کے خلاف کرنے سے طلاق واقع نہ ہوگی، گو کسی کا خط بلا اذن (بغیر اجازت) دیکھنا یا اسی طرح کسی چیز میں تصرّف بلا اجازت کرنا مستقل دلیل سے حرام ہے، مگر طلاق واقع ہونا اور بات ہے،

تعلیق میں محض نیت کافی نہیں ایک غلطی درباب فیصلہ باہمی زوجین متعلق طلاق و معافیِ مہر (میاں بیوی

---

[1] قسم توڑنے کا کفارہ تین مسلسل روزے یا دس محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے، اگر اناج دینا چاہے تو ہر محتاج کو احتیاطاً دو سیر گندم یا چار سیر جو یا انکی قیمت بھی دے سکتا ہے، بخیب

کے درمیان طلاق اور معافیِ مہر کے بارے میں فیصلہ) کے یہ ہوتی ہے کہ بنا بر مصالح (مصلحتوں کی بنا بر) یہ قرار داد (تجویز) ہوتی ہے کہ شوہر طلاق لکھ دے، اور منکوحہ مہر کا معافی نامہ لکھ دے، اب اس کی ترتیب کے متعلق دو غلطیاں ہوتی ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مرد نے پہلے طلاق نامہ لکھ دیا اور طلاق واقع ہوگئی، گو عورت کے حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب عورت نے مہر معاف کرنے سے انکار کر دیا، تو مرد کا نقصان ہوا، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ عورت نے مہر کا معافی نامہ لکھ دیا اور مہر معاف ہوگیا، گو مرد کو حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب مرد طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، تو اس میں عورت کا خسارہ ہوا، کیونکہ مہر کی معافی میں بھی اور طلاق میں بھی نیت تعلیق کی ہے، مگر تعلیق میں محض نیت کافی نہیں، لفظوں میں اس کی تصریح ضروری ہے، اس لئے اس کا ایسا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کا مقصود حاصل ہوجائے اور کسی کو افسوس نہ ہو، وہ طریقہ یہ ہے کہ مرد جو طلاق نامہ لکھے تو اس طرح لکھے کہ اگر عورت مجھ کو مہر معاف کردے تو میری طرف سے اس کو طلاق بائن ہوجائے، اس کے بعد عورت نے اگر معافی نامہ مہر کا نہ لکھا تو عورت پر طلاق واقع نہیں ہوئی، اور مرد خسارہ سے بچا رہا، اور اگر معافی نامہ لکھ دیا تو طلاق ہوگئی، مگر ایسے وقت میں کہ مہر بھی معاف ہوگیا، غرض دونوں میں سے کسی کو دھوکا نہ ہوا،

طلاق کے بارے میں اہلِ علم کا ایک مغالطہ

ایک غلطی بعض اہلِ علم کو یہ ہوجاتی ہے کہ فقہا نے اِختاری (تجھے طلاق کا اختیار ہے) کو کنایات طلاق (طلاق کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ) میں سے لکھا ہے، تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ لفظ بہ نیت طلاق کہہ دیا تو طلاق بائن ہوجاتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، اس لفظ سے یا اس کے ہم معنی مثل اَمرُکِ بِیَدِکِ وغیرہ (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یا تیرے قبضہ میں ہے) سے وقوع طلاق کی یہ بھی شرط ہے کہ اس کہنے کے بعد عورت اپنی طلاق کو اختیار کرلے، اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مرد نے اس لفظ کے کہنے میں نیت طلاق کی کی تھی تو طلاق ہوگی ورنہ نہیں، اور اگر عورت خاموش رہی تو صرف مرد کے اِختارِی کہنے سے اگرچہ اس میں نیت طلاق کی بھی کی ہو، طلاق واقع نہ ہوگی، درمختار میں تصریح ہے:-

ولا تقع به (اى بقوله اختارى) ولا بامرك بيدك مالم تعلق المرأة نفسها كما يأتى،	(یعنی خاوند نے بیوی سے کہا تجھے اختیار ہے، یا تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی، جب تک کہ عورت نے اپنے آپ کو معلق نہ کیا ہو، جیسا کہ آگے آرہا ہے)۔

ردالمحتار میں ہے:-

قولہ مالم تعلق ای معنیۃ الزوج الطلاق اودلالۃ الحال لان ذلک کنایۃ تفویض لاکنایۃ ایقاع کمایأتی فی الباب الاٰتی،
قلت ما الطف تعلیلہ بقولہ لان ذلک کنایۃ تفویض الخ،

جبؔ تک عورت نے خاوند کے ساتھ طلاق کو معلق نہ کیا ہو یا دلالتِ حال کے ساتھ، کیونکہ یہ سپرد کرنیکا کنایہ ہے واقعہ کرنے کا کنایہ نہیں، جیسا آگے آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ کس قدر طلاق کی وجہ بیان کرنے میں لطافت پیدا کر دی ہے،

غائبانہ طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک عورت سامنے نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، غائبانہ طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے،

لفظ "طلاق" صحیح مخرج سے ادا نہ ہو تب بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

بعضے لکھے پڑھے لوگوں نے ایک جہالت کی کہ طلاق دینے والے کو یہ فتویٰ دیا کہ تو نے طلاق میں حرف طآ. کو مخرج سے ادا نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے حرف تآ. فوقانیہ سے کہا، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، سو فقہاء نے تصریحاً غلط حرف سے طلاق واقع ہوجانے کو لکھا ہے،

رنجش کی بنا پر بیوی کے ناجائز جگہ پر بیٹھنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

ایک غلطی اس باب میں یہ ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بی بی میں بہت مدت تک رنجش کے سبب بے تعلقی رہی خصوص جب کہ وہ دوسری جگہ ناجائز طور پر بیٹھ رہی تو خود بخود طلاق ہوجاتی ہے، سو یہ بھی غلط ہے، گو اس فعل سے معصیت (گناہ) ہے، مگر طلاق واقع نہیں ہوتی، مرد کو اختیار ہے جب چاہے اس عورت کو زوجیت کے طور پر قبضہ کرلے،

شوہر کے مرض الوفات میں طلاق پانے والی عورت کو میراث سے حصہ ملے گا،

ایک غلطی بابِ طلاق میں بہت دقیق ہے، جو ایک مسئلہ کے نہ جاننے سے واقع ہوتی ہے جو کہ بہت کم معلوم ہے، خصوص اس کے بعض جزئیات سے، تو بعض طالب علم بھی بے خبر ہیں، اول وہ مسئلہ سمجھ لیا جائے پھر اس غلطی پر متنبہ کیا جائے گا، مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض وفات میں اپنی مدخولہ بی بی (جس سے ہمبستری ہوچکی ہو) کو بدون اُس کی رضامندی کے طلاق بائن دیدے، اور وہ شخص عدت گذرنے کے قبل مرجائے تو ظاہراً تو شبہ ہوتا ہے کہ جب طلاق بائنؔ سے نکاح کا علاقہ قطع ہوگیا تو اس کو

ؔ طلاق بائن:- ایسی ایک طلاق جس میں نکاح بالکل ٹوٹ جاتا ہو، اور اب بغیر نکاح کئے اس مرد کے پاس رہنا جائز نہیں، اگر پھر اسی کے پاس رہنا چاہے اور مرد بھی اس کو رکھنے پر راضی ہو تو پھر سے نکاح کرنا پڑیگا، ایسی طلاق کو

طلاق بائن کہتے ہیں (محمد احمد غفرلہ)

شوہر سے میراث نہ ملے گی، مگر حکم شرعی یہ ہے کہ اس صورت میں وہ عورت میراث پائے گی، گویا شریعت نے اس کا انتظام کیا ہے کہ کوئی شخص ایسی حالت میں اپنی بی بی کو اس کے حصۂ میراث سے محروم نہ کرسکے پس ایسی حالت میں اگر طلاق دی تو احتمال ہوسکتا تھا کہ شاید دوسرے وارثوں کے مقابلہ میں بی بی کو محروم کرنے کے واسطے طلاق بائن دی، ہوتی، تاکہ وہ زوجہ نہ رہے، اور اس لئے زوجیت کی میراث نہ پائے اس لئے شریعت نے عدّت کو قائم مقام نکاح کے قرار دے کر اس عورت کو میراث دلوائی ہے، اور ایسے طلاق دینے والے کو فارٌ بالطلاق (طلاق دے کر میراث سے بھاگنے والا) کہتے ہیں، اور وہ غلطی یہی ہے کہ لوگ اس عورت کے استحقاقِ میراث (میراث کے مستحق ہونے) کو نہیں جانتے، اور اس مسئلہ کی جس جزئی سے بعض طلبہ بھی بے خبر ہیں وہ جزئی بدون مرض کے غلبۂ احتمالِ ہلاک (ہلاکت کا غالب گمان) ہونے کی ہے، مثلاً شیوع (پھیلاؤ) طاعون کا ہو رہا ہے، مگر مطلقاً نہیں، بلکہ خود اس شخص کے محلہ میں اس قدر زور شور ہو کہ ہر وقت خود اس کے مبتلائے طاعون ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہو اسی طرح جس کے لئے سزائے موت کا حکم ہوچکا ہو، یا وہ لام پر گیا ہوا ہو اور غالب قرائن سے اندیشہ موت کا ہو، سو چونکہ یہ حالتیں مرض کی نہیں، اس لئے ان حالتوں کا حکم بعض کو معلوم نہیں، مگر چونکہ غلبۂ ہلاک ان میں اور حالتِ مرضِ موت میں مشترک ہے اس لئے اُن کا حکم بھی مثل مرضِ موت ہی کے ہے، حتی کہ ایسے شخص کے وصایا بھی صرف ثلث (ایک تہائی) میں جاری ہوں گے،

طلاقِ بائن اور طلاق رجعی میں شوہر سے پردہ کے احکام،

ایک غلطی بعض آثار طلاق کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ بعضے تو طلاقِ بائن میں بھی شوہر سے پردہ نہیں کراتے، حالانکہ اس وقت ضروری ہے، اور بعضے رجعی میں بھی پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ضروری نہیں، بلکہ اگر قرائن سے امید رجعت کی ہو تو زینت بھی کرنا جائز ہے بلکہ مستحسن ہے،

طلاق کے بعد عدّت میں نفقہ دینا واجب ہے،

اور انہی آثار کے متعلق غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ طلاق کے بعد عدّت میں نفقہ نہیں دیتے، حالانکہ واجب ہے، اس کی کچھ تفصیل آگے بھی آتی ہے،

بقیۂ احکام بعد الطلاق

عدّت سے متعلق چند کوتاہیاں

منجملہ احکام بعد الطلاق کے ایک عدّت ہے، لوگ اس میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں

چنانچہ ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر عوام عدت مطلقاً تین مہینے سے اور بعضے چار مہینے دس دن سمجھتے ہیں، حالانکہ عدت کی کئی قسمیں ہیں

عدت کی قسمیں حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے، خواہ مطلقہ ہو یا اس کا شوہر وفات پا گیا ہو، اور غیر حاملہ میں تفصیل ہے کہ اگر اس کا شوہر وفات پا گیا ہے تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہیں، اور اگر وہ مطلقہ ہے تو اگر اس کو حیض آتا ہے تو اس کی عدت تین حیض ہے اور اگر کم سنی کے سبب ہنوز (ابھی) حیض نہیں آتا یا بڑھاپے کے سبب حیض موقوف ہو گیا، تو ان دونوں کی عدت تین مہینے ہیں، پس علی الاطلاق سب صورتوں میں ایک ہی قسم کی عدت کا حکم کرنا یہ غلط ہے،

عدت کے اندر نکاح جائز نہیں ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بیوہ سے نکاح کرتے ہیں، اور انقضاءِ عدت (عدت پوری ہونے کا) بھی انتظار نہیں کرتے، اور عدت کے اندر نکاح کر لیتے ہیں، بعضے اپنے نزدیک بڑی احتیاط کرتے ہیں، کہ نکاح کو تو جائز سمجھتے ہیں مگر اس سے قربت نہیں کرتے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عدت کے اندر بالکل نکاح جائز نہیں ہوتا،

زنا سے حمل رہ جانے کی صورت میں نکاح فوراً جائز ہے، بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں دوسرا غلو کرتے ہیں کہ اگر کسی غیر منکوحہ دغیر معتدہ (ایسی عورت جس کا نکاح نہ ہوا ہوا ور نہ وہ عدت میں ہو) کو زنا سے حمل رہ جائے تو اس کے لئے بھی وضع حمل کو عدت تجویز کرتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اس پر عدت نہیں، اس سے نکاح فوراً جائز ہے، البتہ صحبت اور اس کے مقدمات بوس وکنار وغیرہ جائز نہیں، جب تک کہ وضع حمل نہ ہو جائے،

عدت میں پورے تیس دن کا مہینہ شمار کیا جائے، ایک غلطی عام یہ ہے کہ جن صورتوں میں مہینوں سے عدت ہے خواہ تین مہینے یا چار مہینے دس دن، اس میں اگر ایک یا دو مہینے انتیس کے ہوں تو اس کمی کے عوض دس دن عدت میں بڑھاتے ہیں، مثلاً ایک عورت کے شوہر کی وفات دسویں شوال کو ہوئی تو بیسویں صفر کو علی الاطلاق اس کی عدت کو ختم سمجھتے ہیں، اگرچہ ذیقعدہ ذی الحجہ و محرم و صفر میں سے دو یا تین مہینوں کا چاند انتیس کا ہوا ہو، حالانکہ ہمارے ائمہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں، صاحبین کے نزدیک درمیان کے مہینے چاند سے لیں گے، اور اول کا مہینہ انتیس کا ہوا ہو تو اس کی تکمیل اخیر میں دنوں سے کر لیں گے، تو اس صورت میں بھی بیسویں صفر کو اس کی عدت ختم نہ ہو گی، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سب مہینے دنوں سے شمار کریں گے، یعنی اس صورت میں ایک سو تیس دن گذرنے سے مدت ختم ہو گی، پس اگر درمیان میں تین مہینے انتیس

کے ہوئے تو بیسویں صفر کے بعد تین دن بڑھائے جائیں گے، اور تیئیسویں صفر کو عدت ختم ہونے کا حکم کریں گے، خوب یاد رکھنا چاہئے،

عدت کا شمار طلاق یا وفات کے وقت سے شروع ہوتا ہے

بعضے لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو طلاق ہوگئی یا اس کے شوہر کی وفات ہوگئی، اور اس کو ایک مہینہ بعد خبر ہوئی تو بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتداء عدت کی خبر پہنچنے تک کے وقت سے ہوگی، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ طلاق یا وفات ہی کے وقت سے عدت کا شمار ہوگا،

نابالغہ کا شوہر فوت ہونے کی صورت میں عدت کا حکم

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نابالغہ کا شوہر اگر مرجائے تو اس پر عدت نہیں، سو یہ بھی غلط ہے، ان لوگوں کو خلط ہوگیا ہے، یہ حکم طلاق میں ہے، کہ اگر منکوحہ سے ہمبستری یا خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو اور طلاق ہوجائے تو اس میں عدت لازم نہیں، تو طلاق کو موت پر قیاس کرکے جو حکم طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے حکمِ طلاق) کا تھا، وہ موت قبل الدخول کا سمجھ لیا، یہ قیاس غلط ہے، اور دونوں کا حکم جدا جدا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عدتِ طلاق میں اصالۃً تصرف براۃ رحم (رحم کے خالی ہونے کو ثابت کرنے) کے لئے ہے، اور قبل الدخول میں احتمال شغلِ رحم (ہمبستری سے پہلے رحم کے بھرنے ہونے) کا نہیں ہے اس لئے وہاں عدت نہیں اور عدتِ موت میں اصالتاً قضائے حقِ نکاح (حقِ نکاح پورا کرنے) کے لئے ہے، اور اسی وجہ سے عدتِ اشہر (مہینوں) سے ہے، اس لئے یہاں عدت ہے،

مدتِ عدت کے اندر نفقہ واجب ہے

ایک غلطی نفقہ کے متعلق ہے، کہ اکثر لوگ طلاق بائن کے بعد مہر کو تو واجب الادا سمجھتے ہیں، مگر مدتِ عدت کے اندر نفقہ (کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات) کو واجب نہیں سمجھتے، حالانکہ عدت کے اندر نفقہ بھی واجب ہے، البتہ عدت وفات کا نفقہ کسی کے ذمہ واجب نہیں ہے، اور اسی طرح خلع میں عورت اگر نفقہ۔ عدت کو تصریحاً ساقط (ختم) کردے تو اس میں بھی ساقط ہوجاتا ہے، (کذافی الدر المختار)

عدت کے اندر عورت کا بلا عذر گھر سے نکلنا جائز نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر عدت کے اندر گھر سے نکل آئے تو اس پر پھر از سر نو عدت واجب ہوگی، اور پہلی عدت ٹوٹ گئی، سو یہ بالکل غلط ہے، یہ تو ضرور ہے کہ بلا عذر گھر سے نکلنا معتدہ (عدت گذارنے والی) کو جائز نہیں، اسی واسطے معتدۃ الطلاق (طلاق کی عدت گذارنے والی) کو کسی وقت نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ اس کا نفقہ زوج پر واجب ہے، اور خلع میں اگر زوج سے ساقط ہوا ہے تو عورت کے ساقط

کرنے سے ہوا ہے، تو اس نے اپنے نفقہ کا بہ اختیارِ خود التزام کیا ہے، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہے، اور معتدۃ الوفات (شوہر کی وفات کی عدت گذارنے والی عورت) کا نفقہ کسی پر ابتداء ہی سے واجب نہیں، اس لئے اس کو دن کو بضرورت انتظامِ معاش کے اور تھوڑے سے حصہ شب میں بھی نکلنا جائز ہے، لیکن زیادہ حصہ رات کا اپنے گھر میں گذارنا واجب ہے، پس فرق دونوں میں اسی ضرورتِ معاش و عدمِ ضرورت سے ہوا، سو اگر کوئی معتدۃ الوفات ہی معاش سے مستغنی ہو (یعنی محتاج نہ ہو) تو اس کا نکلنا جائز نہ ہوگا، (درمختار عن الفتح)

عدت کی مدت گذرنے کے بعد کوئی پابندی نہیں ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے خصوصاً عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ عدت گزرنے کے بعد عدت سے نکلنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس گھر سے دوسرے گھر جائے، اور اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، سو یہ بالکل غلط ہے جب وہ مدت گذر گئی پس عورت عدت سے نکل گئی، گو اسی گھر میں رہے،

مطلقہ کو حقیر سمجھنا صحیح نہیں ایک غلطی جس کو ایک رسمِ جہالت کہنا بجا ہے یہ ہے کہ مطلقہ کو مطلقاً (بالکل) حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، اور گو زیادتی شوہر ہی کی ہو مگر بلا وجہ یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس نے کچھ تو عیب کیا ہوگا، تب تو اس کو طلاق ہوئی، اور پھر اس عیب کو بھی عفت (پاکدامنی) ہی کے متعلق سمجھ لیتے ہیں، اور اس بناء پر حتی الامکان اس سے نکاح نہیں کرتے، سو ظاہر بات ہے کہ جب واقعات دونوں طرح کے ہیں کہیں عورت کی زیادتی ہوتی ہے کہیں مرد کی، پھر یہ کیسے سمجھ لیا کہ عورت ہی خطاوار ہے، اور اگر خطاوار ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ خطا عفت ہی کے متعلق ہے، ایسے قرائن پر کسی پر شبہ کرنا سخت گناہ اور حرام ہے،

بلا تحقیق محض وقوعِ طلاق سے شوہر یا بیوی پر کوئی حکم لگانا گناہ ہے ایک غلطی اس کے مقابلہ میں کہ وہ بھی رسمِ جہالت ہی ہے یہ ہے کہ بعض لوگ طلاق دینے والے کو بلا دلیل ظالم قرار دے لیتے ہیں، اور اسی بناء پر پھر اس کا نکاح دشوار ہو جاتا ہے، سو یہ بھی پہلے کی طرح رجم بالغیب (اٹکل پچو) ہے، کہیں کہیں عورتیں سرکشی و نافرمانی و ایذا رسانی کرتی ہیں، تو اس صورت میں مرد بجز طلاق کے کیا کرے، حاصل یہ کہ محض وقوعِ طلاق سے بلا تحقیق نہ شوہر پر الزام لگا دے، نہ عورت پر بلکہ جن لوگوں کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کو تو اس سے تعرض ہی کی ضرورت نہیں، اور جن کا کچھ ضروری تعلق ہے وہ بھی بدونِ تحقیق کے کوئی حکم نہ لگائیں، کہ بدونِ دلیل شرعی کوئی حکم لگا دینا مخالفت ہے، نص وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (بنی اسرائیل آیت ۳۶)

(اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر) کی اور فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (ص ۲ آیت ۲۶) (سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش نہ کرنا) کی،

چھوٹے بچوں کی پرورش میں کوتاہیاں

یہاں تک اس بقیہ میں اکثر احکام متعلق عدت کے تھے، طلاق کے بعد علاوہ عدت کے حضانت یعنی چھوٹے بچوں کی پرورش کا پیش آتا ہے اسی طرح وفات شوہر کے بعد بھی، خلاصہ یہ کہ افتراق بین الزوجین (میاں بیوی میں تفریق) کے بعد کبھی نابالغ اولاد بھی ہوتی ہے، بعض اوقات زوجین اور کبھی زوجہ اور ورثہ زوج میں ان بچوں کے متعلق پیش آتی ہے، اور اکثر تو یہ کشاکش اس صورت سے ہوتی ہے کہ فریقین میں سے ہر شخص ان بچوں پر اپنا دعویٰ استحقاق کا (حقدار ہونے کا دعویٰ) کرتا ہے، اور سب اپنے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے، یعنی ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اول صورت میں اکثر تو یہی ہے کہ جس کا زور ہوا وہ غالب آگیا، اور بچہ پر قبضہ کر لیا، خواہ حق ہو یا ناحق ہو، یعنی اگر باپ یا باپ والے زوردار ہوئے تو دودھ پینے ہی کی حالت میں یا اس کے ذرا بعد ماں سے چھین لیتے ہیں، اور اگر ماں والے زوردار ہوئے تو وہ عمر بھر بھی باپ کو قبضہ نہیں دیتے، سو یہ دونوں غلطیاں ہیں،

چھوٹے بچوں کی پرورش کا کون زیادہ مستحق ہے؟

اس کا قانون شرعی یہ ہے کہ اگر ماں کافر اور فاجر نہ ہو اور اس نے ہنوز کسی ایسے مرد سے نکاح نہ کیا ہو جو بچہ کے ساتھ ذی رحم محرم (نسبی رشتہ دار) ہونے کا علاقہ (تعلق) نہ رکھتا ہو تو ماں اس بچہ کو اپنے پاس رکھنے کے استحقاق میں سب سے مقدم ہے، اور اس استحقاق کی مدت یہ ہے کہ لڑکا سات برس کا ہو جائے اور لڑکی ایسی ہو جائے کہ مردوں کو اس کی طرف رغبت ہونے لگے، اس کے بعد اس کو باپ کی طرف واپس کر دیا جائے گا، اور دادا بھی بجائے باپ کے ہے، (یعنی باپ کے حکم میں ہے) جبکہ باپ موجود نہ ہو، اگر باپ اور دادا نہ ہوں تو پھر عصبات جو کہ ذی رحم محرم ہوں، وہ زیادہ مستحق ہیں، بشرطیکہ معتمد (قابلِ اعتماد) ہوں، اور جو ایسے عصبات نہ ہوں تو حاکم کسی اہل کے سپرد کر دے، اور لڑکی کو کسی امین دیندار عورت کے سپرد کرے اور لڑکا اگر بالغ ہو کر خود اپنی نگرانی کر سکے، پھر اس پر قبضہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اور اگر ماں کافر، فاجر ہو تو اس کو کچھ حق نہیں، اسی طرح اگر کسی ایسے مرد سے نکاح کر لیا ہو جو بچہ کا ذی رحم محرم نہیں، اس کی تین صورتیں ہیں،

ایک یہ کہ نہ ذی رحم ہے...... نہ محرم ہے، جیسے بالکل اجنبی شخص، دوسری یہ کہ ذی رحم تو ہے

مگر محرم نہیں جیسے چچازاد بھائی رشتہ دار تو ہی مگر محرم نہیں، تیسرے یہ کہ محرم تو ہی مگر ذی رحم نہیں جیسے رضاعی بابا چچا کہ ان سے نکاح تو حرام ہے اس لئے محرم تو ہے، مگر ان کی کچھ قرابت نہیں، غرض ان تینوں قسموں میں سے جس کسی سے عورت نے نکاح کرلیا تو ان سب صورتوں میں عورت کا یہ حق جاتا رہے گا،

اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ علی الاطلاق باپ کا قبضہ بھی غلطی ہے، اور علی الاطلاق ماں کا قبضہ بھی، بلکہ دونوں کے قبضوں میں یہ تفصیل ہے جو اوپر مذکور ہوئی،

ایک دوسرے پر ٹلانے کی صورت میں بچہ کو کون دودھ پلائے گا؟

اب رہا اس کا عکس کہ ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اس کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی اور پرورش کرنے والی مل سکے خواہ بلا عوض یا بعوض (بغیر معاوضہ کے یا معاوضہ کے ساتھ) اور باپ یا بچہ اتنے مال کا مالک ہو کہ اس عوض کو ادا کر سکے تب تو ماں پر جبر نہ کیا جائے گا، ورنہ جبر کیا جاوے گا،

اس قانون سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ علی الاطلاق بچہ نہ عورت پر ڈالا جا سکتا ہے اور نہ باپ پر اور یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک بچہ ماں کی حضانت (پرورش) میں رہے گا، دونوں کا خرچ باپ کے ذمہ ہوگا، باقی تفاصیل کتب فقہ میں ہیں،

طلاق یا موت کے بعد گھریلو سامان کے احکام

ایک معاملہ بعد الطلاق یا بعد الموت جس میں غلطیاں ہوتی ہیں اثاث البیت (گھریلو سامان) کے متعلق ہے، کہ ہر ایک زوجین میں سے یا ایک کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ اور دوسرا زندہ اس میں دعویٰ ملک کا کرتے ہیں، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ جو چیزیں عورتوں کے لائق ہیں، جیسے زنانہ کپڑے وہ عورت کے ہیں، لیکن مرد اس کے خلاف پر شرعی گواہ قائم کردے تو گواہوں پر حکم ہوگا، اور جو چیزیں مردوں کے لائق ہیں جیسے مردانہ کپڑے، یا ہتھیار وغیرہ وہ مرد کی ہیں، لیکن اگر عورت اس کے خلاف پر گواہ قائم کردے تو گواہوں کے موافق حکم ہوگا، اور جو دونوں کے کام کی چیزیں ہیں وہ بھی مرد کو دی جائیں گی، لیکن اگر عورت گواہوں سے اس کے خلاف ثابت کردے تو پھر گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ تو جب ہے کہ زوجین میں اختلاف ہو، اور اگر ایک مرگیا اور دوسرے زندہ ہیں، اور اس میت کے ورثہ میں اختلاف ہو، تو اس صورت میں جو چیز صرف مردوں کے یا صرف عورتوں کے کام کی ہوں اس میں تو یہی تفصیل ہے، اور جو چیزیں دونوں کے کام کی ہوں اس میں اختلاف ہے، امام محمد رحمہ اللہ تو وہ چیزیں مردوں کو دلاتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، اور گواہ ہونے کی حالت میں گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ سب تفصیل برتنے کی چیزوں میں ہے، اور اگر سوداگری کا مال ہو تو اسباب (سامان) کا زنانہ ہونا دلیل نہ ہوگا عورت کے مالک

ہونے کی، یہ سب احکام و مسائل، عالمگیریہ کے باب سابع کی فصل سابع عشر میں ہے، اور راحقر کے نزدیک جہاں یہ عُرف ہو کہ مرد اپنے مال جمع کرنے کی غرض سے زنانہ زیور بنوا کر عورت کو عاریۃً پہنا دیتے ہوں تو وہاں یہ زیور بھی مثل مالِ تجارت کے سمجھا جائے گا، جس کا حکم ابھی معلوم ہوا، مگر دوسرے علماء سے بھی احتیاطاً مراجعت کرلی جائے،

زوجین میں جُدائی کے نو ماہ بعد بچّہ کی ولادت ہونے پر ثبوت نسب کے احکام،

ایک غلطی جو معصیت کے شدید درجہ تک ہے بعد مفارقت الزوجین (میاں بیوی کی جدائی کی صورت) میں یہ ہوتی ہے کہ اگر زمانۂ طلاق یا بیوگی سے نو مہینے کے اندر بچہ پیدا نہ ہو، بلکہ بعد میں ہوا تو عورت کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں، حالانکہ شریعت میں جو قانون ثبوتِ نسب کا ہے یہ اس کے بالکل خلاف ہے فقہاء نے اس کو بہت مفصل لکھا ہے، یہاں نمونہ کے طور پر ایک جزئیہ طلاق کا اور ایک وفاتِ زوج کا لکھا جاتا ہے،

پہلا جزئیہ؛ اگر کسی کو طلاق بائن ہوجائے اور وقتِ طلاق سے دو برس کے اندر اس کے بچہ پیدا ہو تو وہ اسی شوہر کا سمجھا جائے گا،

دوسرا جزئیہ، اگر کسی کا شوہر مرجائے، اور وقتِ وفات سے دو برس نہ گزرے ہوں کہ بچہ پیدا ہو تو اسی شوہر کا سمجھا جائے گا،

اور یہ اس وقت ہے جب دونوں صورتوں میں معتدہ (عدّت گذارنے والی) نے اس کے قبل عدت گذرنے کا اقرار نہ کیا ہو، اور اگر عدت گزرنے کا اقرار کر چکی تھی پھر اس کے بچہ پیدا ہوا تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر وقتِ اقرار سے چھ مہینے سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو اس اقرار انقضائے عدت (عدّت گزرنے) کو غلط سمجھا جائے گا، اور نسب ثابت ہوگا، اور اگر وقتِ اقرار سے چھ مہینے گذر گئے تھے تو نسب ثابت نہ ہوگا، یہ سب مسائل ہدایہ میں ہیں، لیکن نسب ثابت نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس عورت کو یقیناً زانیہ کہا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ قانون سے وہ بچہ مرد کے ذمہ لازم نہ ہوگا، مثلاً اس کے مال میں وارث نہ ہوگا، اور اس کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، باقی زانیہ نہ ہونے کی صورت بعض صورتوں میں یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا اقرار انقضائے عدت کا خود غلط ہو، اور بعض صورتوں میں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ظالم نے اُس پر ظلم کیا ہو، خواہ شوہر نے عدتِ طلاق میں یا کسی غیر نے وفاتِ شوہر میں، باقی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر واقع میں بھی عورت کی کوئی شرارت ہو تب بھی اس قانون کے سبب وہ عنداللہ بری ہوگی، ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر قانون حاکم نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں کو

اس پر تہمت رکھنے کا کوئی حق نہیں، باقی وہ جانے اور اس کا فعل جانے، جیسا کرے گی عند اللہ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا، اب اس میں یہ شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس قانون سے تو عورتوں کی جرأت بڑھ جائے گی، ایسی جرأت سے کہاں تک بچا جائے گا، آخر یہ بھی تو قانون ہے کہ جس کا شوہر پاس ہو اس کا بچہ ثابت النسب ہوگا، تو اس سے شوہر کے پاس رہنے والیوں کی جرأت بڑھے گی کہ اگر ہم بدکاری کرلیں ہم کو کون کچھ کہے گا، خاوند کے ماتھے جائے گی، اور اگر جرأت کا انسداد ضروری ہے تو کیا ظلم کا انسداد ضروری نہیں؟ اگر واقع میں وہ بری ہو اور اس قانون سے کام نہ لیا جائے تو اس پر جو بہتان کا ظلم ہوگا اس کا کیا علاج ہوگا؟

عدت شوہر کی روح نکلنے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے ،

ایک اعتقادی غلطی عدتِ وفات کے متعلق جہلا میں یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر مردہ شوہر کا جنازہ لے جانے سے پہلے بیوہ کو اس گھر سے دوسرے گھر میں لے جائیں تب تو جائز ہے، ورنہ پھر جائز نہیں، منشا اس جہل کا یہ ہے کہ عدت کی ابتدا جنازہ کے لے جانے کے بعد سے سمجھتے ہیں، حالانکہ عدت بمجرد دم نکلنے کے (عدت تنہا روح نکلتے ہی) شروع ہو جاتی ہے، اور جنازہ لے جانے کے قبل اور بعد دونوں حال میں ایک ہی حکم ہے، کہ بلا عذر قوی (جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں ہے) عدت کے اندر دوسرے گھر کی طرف منتقل ہونا حرام ہے، یہ مسئلہ استطراداً مسائل بعد الطلاق میں ذکر کر دیا گیا،

عورت کی بدچلنی کے باعث طلاق ہو جانے سے بھی مہر ساقط نہیں ہوتا

ایک علمی غلطی مہر کے باب میں طلاق کے بعد یہ واقع ہوتی ہے کہ بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر عورت کے کسی قصور پر طلاق دی گئی ہو تو مہر ساقط ہو جاتا ہے، مثلاً عورت کی بدچلنی ثابت ہو گئی یا وہ نعوذ باللہ مرتد ہو گئی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر ہمبستری یا خلوتِ صحیحہ سے مؤکد ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہ کسی طرح ساقط نہیں ہوتا، خواہ طلاق ہو یا نہ ہو، پھر خواہ طلاق کا سبب مرد کی زیادتی ہو یا عورت کی، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مہر پر خلع کر لے، اس صورت میں بیشک مہر ساقط ہو جاتا ہے،

مہر کے متعلق ایک کوتاہی جس سے نکاح ہی منعقد نہیں ہوتا

ایک غلطی مہر کے متعلق (اگرچہ اس کا تعلق ما بعد الطلاق کے ساتھ نہیں ہوتا مگر یہاں استطراداً ذکر کی جاتی ہے) یہ ہے کہ بعضے دیندار تقلیلِ مہر کی ترغیب و فضائل سن کر ہر جگہ اس پر عمل کرتے ہیں، حالانکہ بعضے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ موقع ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کرنے والا بجز اس کے باپ یا دادا کے کوئی اور ولی ہو، جیسے بھائی یا چچا تو اس صورت میں اس کا مہر اگر مہر مثل سے بہت کم ہو

تو حسب تصریح درمختار یہ نکاح ہی صحیح نہ ہوگا، اور صاحب درمختار نے صدر الشریعت کے حکم صحت کو وہم کہا ہے، پس ایسے موقع پر یا تو مہر مثل مقرر کرے یا اس صغیرہ کو بالغ ہونے دے، پھر اس کی رضا سے مہر قلیل کیا جائے،

طلاق یا موت ہوجانے پر مہر مؤجل کا حکم

ایک اور مسئلہ کے متعلق استطراداً ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ مہر مؤجل میں اگر اجل مجہول بجہالت فاحشہ ہو تو حسب تصریح فقہا، وہ تاجیل صحیح نہ ہوگی، مہر معجل واجب ہوگا، لیکن اگر یہ اجل طلاق یا موت ہو گو جہالت فاحشہ ہے مگر اس کی صحت میں اختلاف ہے، بعض نے اس کو جائز کہا ہے، مگر احقر کو اس میں تردد ہے، علماء محققین سے مراجعت کی جائے، اور اگر اس قول کو کوئی شخص لیتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک اور قول بھی مفتیٰ بہ کہا گیا ہے، وہ یہ کہ اگر مہر مؤجل ہو تو عورت کو اس اجل کے قبل انکار کرنا تسلیم نفس (خود کو مرد کے سپرد کرنے) سے جائز ہے، اور اگر ایک بار صحبت ہوجاوے دوسری بار میں بھی یہ انکار جائز ہے، اور تاجیل کے اس حکم میں گو اختلاف ہے، مگر درمختار میں اس کو مفتیٰ بہ اور استحسان کہا ہے، سو اگر مؤجل بالطلاق و بالموت میں مرد اس فتویٰ کو لے گا، تو عورت اس فتوے کو لے سکتی ہے،

عورت ایک بار مہر معاف کردے تو پھر وصول نہیں کرسکتی

ایک غلطی مہر کے متعلق کہ وہ بھی استطراداً مذکور ہوتی ہے یہ ہے کہ بعض عورتیں کسی وقت خوش ہوکر بلا کسی شرط یا قید کے مہر معاف کردیتی ہیں، پھر دوسرے وقت ناخوش ہوکر کہہ دیتی ہیں کہ میں اپنی معافی کو واپس لیتی ہوں، سو اس صورت میں مہر معاف ہوجائے گا، اور اس کہنے سے وہ عود نہ کرے گا، البتہ اگر معافی میں کوئی شرط ہو اور مرد نے اس شرط کے خلاف کیا تب البتہ وہ معافی نہ رہے گی،

معافی مہر کو اگر شوہر تسلیم نہ کرے تو مہر معاف نہیں ہوگا

ایک غلطی یہ ہوتی ہے کہ عورت کے معاف کرنے کے وقت مرد اس کو قبول نہیں کرتا، اور جب دوسرے وقت عورت مطالبہ کرتی ہے تو اس پچھلی معافی کو یاد دلاکر اس سے تمسک کرتا (یعنی دلیل پکڑتا) ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ معافی کو اگر مخاطب رَد کردے تو وہ معافی کالعدم ہوجاتی ہے، یہ آخر کی دو غلطیاں اسی وقت ایک پیش شدہ واقعہ سے ذہن میں آئیں،

ایک شبہ کا ازالہ

اب مضمون طلاق کے متعلق ایک مضمون بعنوان "رفع اشتباہ" لکھکر اس باب کو طلاق کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اوپر جو مبغوضیت طلاق کا مضمون ذکر کیا گیا ہے اس پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ اہلِ تاریخ نے بالاتفاق نقل کیا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

عورتوں کو کثرت سے طلاق دیتے تھے تو ایسے امام جلیل الشان ہو کر اس فعلِ مبغوض کا کیوں ارتکاب فرماتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبغوضیت اس وقت ہے جب ضرورت نہ ہو، اور ان کو ضرورت تھی، وہ ضرورت یہ تھی کہ ان کو طبعی طور پر جدید عورتوں کی رغبت تھی، اور جدید نہ رہنے کے وقت اُن سے بے رغبتی ہو جاتی تھی، اور چار سے زیادہ جمع نہ کر سکتے تھے، تو اب بجز طلاق قدیمہ و نکاحِ جدیدہ کے کیا صورت ہو سکتی ہے؟ نیز مبغوضیت طلاق میں وحشتِ زوجہ (بیوی کی پریشانی) کو بھی دخل ہے، اور ان کے اس فعل سے منکوحات کو وحشت نہ ہوتی تھی، چنانچہ احقر نے کسی مقام پر کہ اس کی تعیین یاد نہیں رہی لکھا دیکھا ہے کہ عورتیں یہ خیال کر کے کہ "اُن کے بدن پر بچپن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جا بجا پیار کیا ہے تو بلا حائل ان کے بدن کو مس کرنے سے برکت نصیب ہوگی" باوجود ان کے کثرتِ طلاق کے پھر اُن کے نکاح سے انکار نہ کرتی تھیں، اور ان عورتوں کے ساتھ ان کے اولیاء بھی اس کو ناگوار نہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے اہلِ کوفہ! حسنؓ سے عورتوں کو مت بیاہو کہ وہ کثرت سے طلاق دیتے ہیں، قبیلۂ ہمدان میں سے ایک شخص بولا واللہ ہم ان سے ضرور نکاح کریں گے وہ جس کو پسند کریں رکھیں اور جس کو ناپسند کریں طلاق دیدیں" (اوردہ فی تاریخ الخلفاء عن ابن سعید)۔

اور میں نے احیاء العلوم میں دیکھا ہے کہ حضرت علیؓ اس جواب سے خوش ہوئے، اور قبیلۂ ہمدان کے لئے اس ارشاد سے شفاعت کا وعدہ فرمایا:۔

لَوْ كُنْتُ بَوَّابًا عَلٰى بَابِ الْجَنَّةِ لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ ادْخُلُوْا بِسَلَامٍ	اگر میں جنت کے دروازہ کا بواب بنوں تو میں قبیلۂ ہمدان کو کہوں کہ سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ"

تَمَّ مَا يَتَعَلَّقُ بِأَبْوَابِ الطَّلَاقِ

نفقہ کے احکام

اس میں بھی متعدد مختلف غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، غلطی سے مراد علمی اخلال (علمی خرابی) اور کوتاہی سے مراد عملی اخلال (عملی خرابی) ہے، دونوں مختلف طور پر مذکور ہوتی ہیں،

بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بی بی کا نفقہ اُس وقت واجب سمجھتے ہیں کہ وہ نادار ہو، اور اگر وہ مالدار ہو تو اس صورت میں اس کا نفقہ واجب نہیں سمجھتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بیوی کا نفقہ دونوں مذکورہ حالتوں میں واجب ہوتا ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ بی بی کی طرف سے تسلیمِ نفس میں بلا عذر کوتاہی نہ ہو، اور اگر عذر سے ایسا ہو، جیسے مہر معجل کے لینے کے لئے اپنے نفس کو تسلیم نہ کرے اس میں نفقہ واجب رہے گا،

کم سن عورت کو اگر شوہر اپنے گھر رکھے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہے

البتہ اگر براہِ سرکشی شوہر کے گھر سے چلی گئی اس صورت میں نفقہ واجب نہ رہے گا، جب تک کہ واپس نہ آجائے، اسی طرح اگر بی بی بہت کمسن ہو کہ قابل ہمبستری کے نہ ہو لیکن اس قابل ہو کہ مرد کے پاس رہنے سے مرد کا جی بہلے، معمولی خدمت کرسکے تو تسلیمِ نفس کے بعد اس کا نفقہ بھی واجب ہے، البتہ اگر اس قابل بھی نہ ہو جیسے بعض قوموں میں بہت ہی کم عمری میں شادی کردیتے ہیں اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار)

لیکن جو قابل تمتع کے نہ ہو محض انس اور خدمت کے لائق ہو خود شوہر اس کو اپنے گھر رکھنے پر مجبور نہیں ہے، اگر رکھے گا نفقہ دے گا، اگر نہ رکھے گا نہ دے گا (کذا فی الدر المختار)

جوان عورت کا نکاح کم سن لڑکے سے ہو تب بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہے

اور بعض قوموں میں یہ بھی عادت ہے کہ جوان عورت کا کم عمر لڑکے سے عقد کردیتے ہیں، اس عورت کا نفقہ زوج کے مال سے اگر وہ صاحبِ جائداد یا مالکِ نقد ہو واجب ہوگا، کیونکہ مانع تمتع مرد کی طرف سے ہے، عورت کی طرف سے نہیں،

شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلے جانے سے شوہر کے ذمہ نفقہ واجب نہیں

ایک غلطی بعض عورتوں کی جانب سے یہ ہے کہ شوہر سے مخالفت کرکے اپنے میکے جا بیٹھتی ہیں اور نفقہ کا مطالبہ کرتی ہیں، سو ابھی مذکور ہوا ہے کہ اس صورت میں نفقہ واجب نہ ہوگا،

ذی وسعت مرد کے ذمہ ماما کا خرچ بھی واجب ہے،

ایک کوتاہی بعض مردوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود فارغ البالی کے بی بی کے خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور اتنا کم دیتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے پکائے تو کافی ہو سکتا ہے، ورنہ ماما (نوکرانی) رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی، حالانکہ مرد اگر ذی وسعت ہو تو اس کے ذمہ ماما کا خرچ بھی واجب ہے،

تنگدست شوہر ماما رکھنے پر مجبور نہیں

اور ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود شوہر کے تنگدست ہونے کے اس کو مجبور کرتی ہیں کہ ماما لادے، حالانکہ شوہر کی تنگدستی کی صورت میں مرد اس پر مجبور نہیں ہے، بلکہ دیکھا جائے گا کہ عورت اپنے کام پر قادر ہے یا نہیں، اگر قادر ہے تو اپنا کھانا بھی پکائے اور شوہر کا بھی پکائے، اور اگر قادر نہیں خواہ کسی مرض کے سبب، خواہ امیر کبیر ہونے کے سبب، تو نہ شوہر ماما لانے پر مجبور ہے اور نہ عورت کھانا پکانے پر، بلکہ شوہر سے کہا جائے گا کہ تیار شدہ کھانا عورت کو لا کر دے، خواہ بازار سے یا کہیں اور پکوا کر (کذا فی الدر المختار)

تنگدستی کی حالت میں عورت کو تفریق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں،

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ جہاں ذرا نفقہ میں تنگی ہوئی انھوں نے تفریق کی درخواست شروع کی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ سخت تنگی کی حالت میں گو بعض ائمہ کے نزدیک قاضی کو تفریق جائز ہے، لیکن اول تو یہاں شرعی قاضی نہیں، اور بدون قاضی شرعی کے کسی کے نزدیک بھی تفریق صحیح نہیں، دوسرے ہمارے مذہب حنفی میں خود قاضی کے ہوتے ہوئے بھی اس خاص وجہ سے تفریق جائز نہیں (بلکہ قاضی عورت کو حکم دے گا کہ تو قرض لے لے کر خرچ کرتی رہ اور وہ قرض بذمہ شوہر ہوگا،

روشن خیال حضرات کو حقیقی ہمدردی کی نشاندہی،

بعضے روشن خیال ایسی صورتوں میں بزعمِ خود علماء پر اور درحقیقت شریعت پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تفریق کا جائز نہ ہونا عورت کے حقوق کا تلف کرنا ہے، کیونکہ ہمارے دیار میں شرعی قاضی تو ہے نہیں تو خود عورت کو ایسی مجبوری میں تفریق کے اختیارات ہونے چاہئیں، ورنہ اگر اس کو قرض بھی نہ ملے تو پھر کہاں سے کھائے؟

میں کہتا ہوں کہ آپ صاحبوں کو تو یہ آسان ہے کہ عورت کی ہمدردی میں شریعت پر اعتراض کر کے اپنا دین برباد کرنے لگے، اس سے زیادہ آسان تو یہ تھا کہ اس کی ہمدردی میں اپنا کچھ مال صرف کرتے اور ایسے ستم دیدہ غم رسیدہ کی مدد کرتے اور یہ تو خیال کرنا چاہئے کہ آپ کی اس رائے میں عورت کی تو ہمدردی ہوگئی، لیکن کیا ایسا مجبور مرد قابلِ ہمدردی کے نہیں، کیا اس کی بھی ہمدردی

ہے کہ اس کی بی بی کو جو اس کے لئے کسی قدر مایۂ انس و تسلی تھی اس سے جدا کر دیا جائے۔ اور جو طریقہ ہمدردی کا ہم نے بتلایا ہے اس میں دونوں کی امداد ہے، مرد کی بھی عورت کی بھی، اور دونوں اپنے گھر پر آباد رہیں گے۔ انصاف کیجئے ہمدردی کہنے کے لائق کونسی صورت ہے؟

قہوہ، حقہ، اور موسمی پھل شوہر کے ذمہ واجب نہیں،

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ شوہر کے مال کو بے دریغ اڑاتی ہیں اور سب فضول اخراجات اور تمامی تنعمات کا خرچ بذمہ شوہر سمجھتی ہیں، خصوص پان چھالیہ یا بعض چائے وکافی میں اس قدر زیادتی کرتی ہیں کہ خود بھی کھاتی پیتی ہیں، اور آنے جانیوالیوں کو تقسیم کرتی ہیں، اور یہ شوہر کے ذمہ جرمانہ سمجھتی ہیں، حالانکہ فقہانے یہانتک تصریح کردی ہے کہ قہوہ اور حقہ اور موسمی پھل بھی شوہر کے ذمہ نہیں، اگرچہ قہوہ اور حقہ کی عادت بھی ہو کہ اس کے چھوڑنے سے تکلیف ہو، تب بھی شوہر کے مال میں یہ صرف نہ ڈالا جائے،

قد علم مما ذکرنا انه لا یلزمه لها القهوة والدخان وان تضررت بترکهما لان ذلك ان کان من قبیل الدواء او من قبیل التفکه لا یلزمه کما علمت (رد المحتار ج۲ ص۱۰۶۸)	(بے شک جان لے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ قہوہ اور حقہ اس کے لئے لازم نہیں، خواہ ان کے چھوڑنے سے نقصان پہنچے، کیونکہ یہ دوا، یا پھلوں کی قسم سے ہے، جو اس کے لئے لازم نہیں جیسا کہ تونے سمجھ لیا ہے)

شوہر ان مصارف میں سے جتنے کا متحمل ہو جائے اس کا احسان ہے، اور شوہر کی شان کے لائق بھی یہی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ وسعت دے تو بی بی کو کہ اس کے لئے سرمایۂ راحت ہے راحت پہنچانے میں دریغ نہ کرے، مگر عورت کو بھی مناسب نہیں کہ اس راحت پہنچانے کا یہ صلہ کرے کہ اس کو کلفت پہنچائے،

مردوں کے رشوت لینے کی زیادہ تر ذمہ دار عورتیں ہیں،

واقعی ان عورتوں کی فضول خرچیوں کی بدولت بالخصوص پان اور لباس و آرائش اور رسوم و تقریبات میں مسلمان پنپنے نہیں پاتے، اور ان کے گھر کو جائداد کو، تجارت کو گھن سا لگ رہا ہے، کہ آہستہ آہستہ بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے، بلکہ ان اخراجات کی بدولت دنیا کیسا ان کا دین تک برباد ہوتا ہے، ملازم مردوں کی رشوت کے زیادہ حصہ کی ذمہ دار یہی فضول خرچیاں ہیں، ورنہ اکثر گھروں میں دنیا کی بھی رونق رہے اور مردوں کا تقویٰ بھی محفوظ رہے،

عورتیں چاہیں تو مرد کو متقی بنا سکتی ہیں،

بلکہ اگر ذرا عورت مضبوطی اختیار کرلے تو مرد کو بمجبوری متقی بننا پڑے، بہت نظائر ایسے موجود ہیں کہ عورتوں نے مردوں پر زور دیا کہ اگر تم رشوت نہ چھوڑو گے تو ہم تمہاری کمائی کا کھائیں پئیں گے نہیں، اِدھر مرد و عورت کا تعلق، اُدھر اس

خلوص کی برکت، مجموعہ کا اثر یہ ہوا کہ مردوں کو رشوت سے توبہ کرنا پڑی،

بری کے جوڑوں کی موجودگی میں شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں،

ایک کوتاہی عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ بری کے جوڑے انبار کا انبار ان کے صندوقوں میں ذخیرہ رہتا ہے، پھر بھی روزانہ شوہر سے جوڑے بنوانے کی فرمائش کی جاتی ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ شوہر کے گھر کے جوڑے جب تک موجود رہیں اس وقت تک شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں، اور یوں وہ بنا دے اس کا احسان ہے،

خاوند کے مال کو ضائع کرنے کی قیامت کے روز باز پرس ہوگی

اسی طرح اکثر عورتیں کو بیکار چیزوں کی بے حد رس ہے، اور دھاندہ ہو کہ خواہ ضرورت بھی نہ ہو بس پسند آنے کی دیر ہے، کہ فوراً ہی خرید لیتی ہیں اور ذخیرہ کرتی چلی جاتی ہیں، پھر لطف یہ کہ نہ وہ کام میں آتی ہیں نہ ان کی حفاظت کرتی ہیں، یوں ہی ضائع ہو جاتی ہیں، تو اس طرح سے خاوند کے مال کو اڑانا قیامت میں موجب باز پرس ہے، حدیث اَلْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا الخ میں اس کی تصریح ہے،

عید، بقرعید اور شادیوں پر مستقل جوڑا بنانا شوہر کے لئے ضروری نہیں،

علیٰ ہٰذا عید بقرعید کے لئے یا شادیوں میں شرکت کے لئے مستقل جوڑا بنانا شوہر کے ذمہ نہیں تو اس کے مال میں سے بلا اس کی رضا کے بنانا بھی عورت کے لئے جائز نہ ہوگا، یہ تو دنیوی مصارف ہیں، ان میں تو بلا رضائے شوہر اس کا مال صرف کرنا کہاں جائز ہوتا،

شوہر کی اجازت کے بغیر دینی مصارف میں بھی چندہ دینا جائز نہیں،

دینی مصارف میں بھی مثلاً کسی سائل کو دینا یا کسی مدرسہ وغیرہ کے چندہ میں دینا یا کسی عالم یا واعظ یا یتیم و مسکین و بیوہ و محتاج کی خدمت کرنا بھی بلا رضائے شوہر اس کے مال میں سے جائز نہیں، نہ ایسا دیا ہوا چندہ خدا تعالیٰ کے یہاں قبول ہے، حدیث میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ

"یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک چیز کو ہی قبول فرماتا ہے"

عورتوں کو اخراجات کے لئے مال دینے کے بارے میں مردوں کو ایک مشورہ

چونکہ ایسے مصارفِ دینیہ و دنیویہ کی اکثر حاجت واقع ہوتی ہے، اور اکثر عورتوں کے پاس جداگانہ مال نہیں ہوتا، اس لئے مردوں کو مناسب ہو کہ نفقۂ واجبہ کے علاوہ حسبِ وسعت کچھ خرچ ایسے مواقع کے لئے جداگانہ بھی دے دیا کریں، پھر اس کا حساب نہ لیا کریں، تاکہ وہ اپنی مرضی کے موافق آزادی کے ساتھ

بے تکلف ایسے مصارف میں صرف کر سکیں،

شوہر کے ذمہ عورت کا صدقۂ فطر قربانی اور اس کے اپنے زیور کی زکوٰۃ واجب نہیں،

نیز شوہر کے ذمہ عورت کے مملوکہ زیور کی زکوٰۃ یا اس کی طرف سے صدقۂ فطر یا قربانی واجب نہیں، سو اگر ایسی رقم ان کو مل جایا کرے گی تو ان واجبات کی ادائیگی میں ان کو سہولت ہوگی، لیکن چونکہ شوہر پر واجب تو ہے نہیں، اگر شوہر نے نہ دیا تو عورت اپنا زیور بیچ کر یہ سب حقوق اس سے ادا کرے، شوہر کے مال سے بلا اس کی رضا کے ان عبادات میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، خوب سمجھ لینا چاہئے، عورتیں اس میں سخت بے احتیاطی کرتی ہیں، اور اس کے ناجائز ہونے کا ان کو وسوسہ تک بھی نہیں آتا، گویا شوہر کے مال کا اپنے کو بالکل مالک سمجھتی ہیں، سو یہ بناء ہی باطل ہے،

شوہر اور بیوی کی ملک جدا جدا ہے

ان دونوں کی ملک جدا جدا ہے، یہ شوہر کے لئے بھی ظلم ہوگا کہ اگر عورت کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے، اور عورت کے لئے بھی خیانت ہوگی اگر مرد کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے،

رضاء کا مفہوم و مطلب

اور رضا سے مراد سکوت کرنا یا ناراضی کا اظہار نہ کرنا یا پوچھنے پر رضاء ظاہر کرنا نہیں، تجربہ سے ثابت ہے کہ اکثر اوقات باوجود گرانی اور کراہت کے لحاظ و شرم و مروت کے سبب بھی ایسا کیا جاتا ہے، رضا وہ ہے کہ قرائنِ قویہ غیر مشتبہ سے مالک کا طیبِ خاطر جزم (یقینی طور پر دلی رضامندی) کے ساتھ معلوم ہو جائے، قرآن و حدیث میں اسی مادہ کا استعمال شرط جوازِ مال میں کیا گیا ہے،

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا،	(فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر کا کوئی جزو تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار و خوشگوار سمجھکر")
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ	(اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، خبردار! کہ مسلمان کا مال بغیر اسکی رضامندی کے حلال نہیں")

چندہ دینے اور وراثت کی معافی میں رضامندی کی شرط

اور یہی حکم ہے چندوں اور مواریث کے متعلق کہ لحاظ سے دیدینا یا معاف کر دینا کافی نہیں، طیبِ خاطر شرط ہے، اور مواریث میں طیبِ خاطر سے معاف کرنا بھی کافی نہیں، کیونکہ اعیان میں ابراء صحیح نہیں،

بھائیوں کو میراث ہبہ کرنے کا سہل طریق

جیسا ہندوستان میں رسم ہے کہ بہنیں بھائیوں کو اپنا حصہ معاف کردیتی ہیں بلکہ دو صورتوں میں سے ایک صورت کی ضرورت ہے، یا تو ترکہ میں جو چیزیں قابلِ تقسیم ہیں ان کو حسّاً تقسیم کرکے پھر جس وارث کا دل چاہے دوسرے وارث کو ہبہ مع القبض کردے، اور اگر اس میں جھگڑا معلوم ہو تو اس دوسرے وارث کے ہاتھ اپنا حصہ بیع کردے، پھر زرِ ثمن (مقررہ قیمت) خواہ معاف کردے اور یہ بہت سہل ہے، شرعاً تو اس طرح سے معاملہ صحیح ہو جائے گا پھر قانونی استحکام جس طریق سے چاہے کردے، یہ مسئلہ کتاب المیراث کا تھا یہاں استطراداً ذکر کردیا گیا،

مہر لے لینے سے نفقہ ساقط نہیں ہوتا

ایک غلطی نفقہ کے باب میں یہ ہے کہ بہت عورتوں کا گمان یہ ہے (اور مرد بھی اس غلطی میں عورتوں کے مبتلا رہنے کو غنیمت سمجھتے ہیں) کہ اگر ہم مہر لے لیں گے تو پھر نفقہ میں ہمارا کچھ حق نہ رہے گا، اس وجہ سے خود مانگنا تو در کنار بعضی خدا کی بندیاں تو مرد کے دینے پر بھی اُس ڈر کے مارے نہیں لیتیں، یہ امر بالکل غلط اور باطل ہے، وہ جدا حق ہے یہ جدا حق ہے، ایک کے لینے سے دوسرا ساقط نہ ہوگا،

شوہر پر اپنی بی بی کو رہنے کے لئے جداگانہ گھر یا کمرہ دینا واجب ہے

اور نفقہ ہی کا ایک جزو بی بی کو رہنے کے لئے گھر دینا ہے، اس کے متعلق ایک عام غلطی میں اکثر مرد مبتلا ہیں کہ جداگانہ گھر دینا اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے، بس اپنے عزیزوں میں عورت کو لاڈالتے ہیں، سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر شامل رہنے پر عورت بخوشی راضی ہو تب تو خیر ورنہ اگر وہ سب سے جدا رہنا چاہے تو مرد پر اس کا انتظام واجب ہے، اور یہاں بھی راضی ہونے کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، یعنی طیبِ خاطر سے راضی ہو، حتیٰ کہ اگر مرد کو قرائن قویّہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ جدا رہنا چاہتی ہے، مگر زبان سے اس کی درخواست نہ کرسکے تب بھی مرد کو شامل رکھنا جائز نہیں، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر پورا گھر جدا نہ دے سکے تو بڑے گھر میں سے ایک کوٹھڑی یا کمرہ ایسا دینا کہ اس کی ضروریات کو کافی ہو سکے، اور اس میں اپنا مال و اسباب مقفل کرکے (تالا وغیرہ لگاکر) رکھ سکے، اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ اُٹھ سکے، بات چیت کرسکے، یہ واجب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا،

عورت کو اپنے عزیزوں سے جدا رکھنے ہی میں سلامتی ہے،

اور آجکل کے طبائع و واقعات کا مقتضا، تو یہ ہے کہ اگر عورت شامل رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے سب اعزہ (رشتہ دار) ناخوش بھی ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ جدا ہی رکھے، اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد (ہزاروں خرابیوں کی روک تھام) ہے، اور گو اس میں چند روز کے لئے عزیزوں کا ناک منہ چڑھے گا، مگر اس کی مصلحتیں

جب مشاہد ہوں گی سب خوش ہوجائیں گے، خصوص چولھا تو ضرور ہی علٰحدہ ہونا چاہئے، زیادہ تر آگ اس چولھے ہی سے بھڑکتی ہے، فقہاء نے یہاں تک فرمایا ہے کہ مرد کی اگر پہلی بی بی سے کچھ اولاد ہو دوسری بی بی کو اس کے ساتھ بھی شامل رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا، اور آجکل واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص دوسری اولاد کے ساتھ شامل رہنا بڑے بڑے فسادوں کی جڑ ہے، کہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ اتنا فساد نہیں ہوتا۔

بیوی پر اپنی ساس کی خدمت کرنا فرض نہیں ہے

بعضے آدمی اس کو بڑی سعادتمندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، اگر تم سعادت مند ہو خود خدمت کرو، خدمت کے لئے نوکر لاؤ،

حرمتِ مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق نفقہ ساقط ہے،

ایک غلطی نفقہ کے متعلق وہ ہے جو اس کے قبل سرخی بقیہ احکام بعد الطلاق" کے تحت میں مذکور ہو چکی ہے، کہ بعض لوگ طلاقِ بائن کے بعد نفقہ عدت کا واجب نہیں سمجھتے، سو اس کی تفصیل اسی مقام میں مذکور ہو چکی ہی، اعادہ کی حاجت نہیں، صرف ایک جزئیہ جو اُس جگہ مذکور نہ تھا ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر افتراق بین الزوجین (میاں بیوی میں جدائی) کا سبب عورت کا کوئی فعلِ معصیت کا ہے تب اس کا نفقہ واجب نہیں، مثلاً عورت کی رضامندی سے حرمتِ مصاہرت ہوگئی، یا نعوذ باللہ عورت مرتد ہوگئی، اور اس لئے تفریق واقع ہوئی، حرمتِ مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق، ان صورتوں میں نفقہ ساقط ہے البتہ مہر ساقط نہ ہوگا، جب خلوتِ صحیحہ سے مؤکد ہو چکا ہو۔

یہ سب کلام تھا بی بی کے نفقہ کے متعلق

نابالغ اولاد کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے

اب سمجھئے کہ بی بی کی طرح نابالغ اولاد کا بھی نفقہ باپ پر واجب ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ بی بی تو اگر مالدار بھی ہو تب بھی شوہر پر اس کا نفقہ واجب ہے، اور اولاد کا اس وقت واجب ہی جب وہ مالدار نہ ہوں، ورنہ خود اُن کے مال میں سے صرف کیا جائے گا، باپ کے مال میں واجب نہ ہوگا،

میراث کے مالک بچہ کا نفقہ باپ پر واجب نہیں

مثلاً ایک بچہ کی ماں مرگئی، اور اس نے زیور جائیداد وغیرہ چھوڑا جس میں اس بچہ کو بھی میراث پہنچی، سو جب تک یہ میراث کا حصہ باقی ہے اُس وقت تک اس بچہ کا خرچ باپ کے ذمہ نہیں، اگر نقد نہ ہو باپ کو اجازت ہے کہ اس کو بیچ کر

اس کی ضروریات میں خرچ کرنا ہے، البتہ اگر فضولیات میں صرف کرے گا اپنے پاس سے بھرنا پڑے گا، اور یہ مسئلہ بہت مشکلوں کا حل کرنے والا اور بہت سی بے احتیاطیوں کا بند کرنے والا ہے، مثلاً بہت لوگ ایسے موقع پر بچوں کا حصہ تقسیم کرکے جدا نہیں کرتے، اور یوں سمجھتے ہیں کہ اس تقسیم سے ہمارا نقصان ہے، کہ خرچ ان بچوں کا ہمارے ذمہ ہے اور پھر اتنا مال اور الگ کردو تو ہر طرح ہم ہی خسارہ میں رہے، اور اس لئے اس کو بار سمجھتے ہیں، سو اب اس مسئلہ سے یہ اشکال رفع ہوگیا کہ تمہارا اس میں کوئی نقصان نہیں، جب تک اُن کا حصہ خرچ نہ ہو جائے تمہارے ذمہ ان کا نان نفقہ ہی واجب نہیں، البتہ اُن کا حساب رکھنے میں بہت احتیاط رکھنا چاہئے، سو یہ کوئی مشکل بات نہیں،

یہ تفصیل تو نابالغ ہونے تک ہے، اور بالغ ہونے کے بعد پھر نفقہ واجب نہیں رہتا، البتہ اگر یہ خود غنی ہے اور لڑکی کی شادی نہیں ہوئی، گو بالغ ہے، یا لڑکا کسی مرض وغیرہ کے سبب کسب سے عاجز ہے گو بالغ ہے یا تب اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا،

محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے، ایک غلطی یا کوتاہی کہئے یہ ہے کہ بجز بی بی اور اولاد کے اور کسی کا نفقہ اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، حالانکہ ایک تو محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے، اور دوسرے جتنے اقارب (قریبی رشتہ دار) اس کے ذی رحم محرم ہوں، اور وہ حاجت مند ہوں، اور کسب سے بھی عاجز ہوں ان سب کا بھی نفقہ واجب ہے، مگر صرف تنہا پر نہیں بلکہ والدین کا تو تمام اولاد پر اور ان اقارب کا ایسے رشتہ داروں پر کہ اگر وہ ذی رحم محرم مرجائے تو ان رشتہ داروں کو ان کی میراث میں سے حصہ پہنچے، بقدر اس حصہ کے ہر شخص پر واجب ہوگا،

ذی رحم محرم کا نفقہ بھی حصۂ میراث کی طرح تقسیم ہوگا، مثلاً ایک آدمی کے تین بھائی ہیں ایک عینی ایک علاتی (باپ شریک)، ایک اخیافی (ماں شریک)، تو اب دیکھنا چاہئے کہ اگر یہ شخص مرجائے تو ان تینوں میں میراث کس طرح بٹے؟ سو حکم یہ ہے کہ اخیافی کو تو ذی فرض ہونے کے سبب چھٹا حصہ ملے، اور عینی کو عصبہ ہونے کے سبب پانچ باقی مل جائیں اور علاتی کو کچھ بھی نہ ملے، پس اس شخص کا نفقہ بھی انہی دونوں پر واجب ہوگا، اس طرح سے اگر چھ روپے مہینہ تجویز کیا جائے، تو ایک روپیہ اخیافی بھائی پر اور پانچ روپیہ عینی بھائی پر، اور یہ نسبت میراث کی اُس وقت دیکھیں گے جب سب ذی رحم محرم ہوں، ورنہ ایک اگر ذی رحم محرم ہو دوسرا نہ ہو تو نفقہ صرف ذی رحم محرم پر ہوگا، اگرچہ اس شخص کے مرنے پر وارث وہ دوسرا غیر ذی رحم محرم ہو جائے، مثلاً ایک شخص کا ایک چچازاد بھائی ہے اور ایک ماموں، تو نفقہ صرف ماموں پر ہوگا، اور میراث چچازاد بھائی کو ملے گی، یہ سب نفقات تھے علاوہ

قرابت (رشتہ داری کے تعلق) کے سبب،

کام سے عاجز حاجتمند (انسان یا جانور) کا نفقہ سب پر واجب ہے،

ایک فرد نفقہ واجبہ کی مطلقِ احتیاج کے سبب ہے، اس میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص بھی حاجتمند اور کسب سے عاجز ہو خواہ وہ قریب ہو یا اجنبی، اور خواہ مسلم ہو یا کافر، بلکہ خواہ آدمی ہو یا جانور سب کی خبر گیری سب پر واجب ہے، البتہ اگر جانور کسی کا مملوک ہو تو صرف اس کے مالک پر نفقہ کے لئے جبر کیا جائے گا، اور اگر پھر بھی کوتاہی کرے تو حاکم اس کو بیع پر مجبور کرے گا، (کذا فی الدر المختار) اور اگر وہ جانور کسی کا مملوک نہ ہو تو اگر وہ خود چل پھر کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے تو خیر، اور اگر وہ اس سے معذور ہے تو سب پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، اور موذی جانور درندے، خزندے اس سے مستثنیٰ ہیں، "تحقوق بہائم" (جانوروں کے حقوق) میں میرا رسالہ "ارشاد الہائم" قابلِ ملاحظہ ہے۔

بے جان چیزوں پر نفقہ کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا،

البتہ بے جان چیزوں پر نفقہ کرنا اگر وہ بدون نفقہ کے ضائع ہوتی ہوں، جیسے گھر یا کھیتی وغیرہ، پھر بھی اس نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، گو مال کے ضائع کرنے کی کراہت اس شخص پر ہوگی، مگر نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، لیکن یہ چیز اگر مشترک ہو اور ایک شریک بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرنے کو تیار ہے تو دوسرے شریک کو بھی حاکم جبر کرے گا، کہ بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرے، کیونکہ اس کو اپنے مال کے ضائع ہونے پر راضی ہونے کا حق ہے، مگر یہاں تو خرچ نہ کرنے سے دوسرے کا مال بھی ضائع ہوتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں، اس لئے جبر کیا جائے گا،

علماء، مشائخ اور مبلغین کا نفقہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے،

ایک فرد نفقہ واجبہ کی ایسی غامض (پوشیدہ) ہے کہ کسی کا ذہن بھی اس کی طرف منتقل نہ ہوا ہوگا، اور عوام کا تو کیا ہوتا خواص کا بھی نہ ہوا ہوگا، اور اس فرد کے بتلانے سے پہلے ایک مقدمہ معروض ہے، پھر اس فرد کو بتلایا جائے گا،

اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ نفقہ احتباس کی جزا بھی ہوتا ہے، یعنی جو شخص کسی کی مصلحت یا خدمت کے لئے محبوس و مقید ہو، اور اس احتباس کے سبب وہ اپنی معیشت کا انتظام نہ کر سکتا ہو تو اس شخص کا نفقہ اس پر واجب ہوگا جس کی مصلحت و منفعت کیلئے محبوس ہوا،

چنانچہ اس کی مشہور مثال جو فقہاء نے ذکر کی ہے رزقِ قاضی ہے، یعنی قاضی مسلمین، چونکہ عامۂ مسلمین کی شفقت کے لئے خدمتِ قضا میں محبوس و مشغول ہے، اس لئے اس کا گذارہ جس کو رزق و قوت کہتے ہیں عامۂ مسلمین پر واجب ہے، جس کی شکل یہ ہے کہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے، کہ حقیقت اس کی مجمع اموالِ مسلمین ہے، اور اس لئے اس میں دیئے جانے کی حقیقت یہی ہے کہ عامۂ مسلمین سے دلوایا جاتا ہے،

اسی کی مثال ہے گواہوں کی خوراک، اس کا حاصل بھی یہی ہے، کیونکہ وہ ایک خاص وقت تک وہ مَنْ لَّہُ الشَّہَادَۃ (جس شخص کے لئے گواہی دی جارہی اس) کے کام میں مشغول ہے، اس لئے اس کو اس سے خوراک دلوائی جاتی ہے، حکّامِ وقت نے بھی شریعت کے اس مسئلہ کو برقرار رکھا ہے، اور یہ مثال خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی وارد کی گئی ہے کہ اس فردِ مقصود کے متعلق بعض اعتراض کرنیوالوں پر حجت (دلیل) ہو، اور فقہاء نے زوجہ کے نفقہ کو بھی جزاءِ احتباس ہی کہا ہے،

جب یہ مقدمہ ممہّد (بیان) ہو چکا تو اب اس فردِ غامض کو بتلایا جاتا ہے، وہ علماء وطلباء ومشائخ کی خدمت ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ یہ حضرات قوم کی دینی مصلحت میں محبوس ہیں، چنانچہ علمِ دین کی تحصیل وتعلیم کا دینی خدمت ہونا تو ظاہر ہے، باقی اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا وہ اس طرح ہے کہ علومِ دینیہ میں تبحرّ مجموعہ مسلمین پر فرضِ کفایہ ہے، یعنی قوم میں اتنے جامع علومِ ادیان کے موجود رہنے کا انتظام رکھنا ضروری ہے، جس سے عام مسلمین کی دینی حاجتیں تبلیغِ احکام وجوابِ اسئلہ وغیرہ پوری ہو سکیں، اگر ایسا انتظام نہ کیا جائے گا تو تمام قوم عاصی وآثم (گنہگار) ہوگی،

علماء وطلباء کا نفقہ سب مسلمانوں پر واجب ہونیکی وجہ

اس مسئلہ کی علماء نے تصریح بھی کی ہے، اور عقل سے بھی سمجھ میں آتا ہے، اور اس کی عقلی نظیر طبیبِ کامل کی سی ہے، کہ ہر شخص کو طبیب کی حاجت پیش آتی ہے، لیکن اگر ہر شخص طبیبِ کامل بنے تو امرِ معاش بالکل مختل (درہم برہم) ہو جائے، اور اگر کوئی بھی نہ بنے تو حاجتِ طبیہ کسی کی بھی پوری نہ ہو، اس لئے صورت مجوزۂ عقل (عقل کی تجویز کردہ صورت) یہ ہے کہ قوم میں سے چند احاد (افراد) ایسے کامل ہوں جو تمام قوم کی حوائج (ضروریات) کو کافی ہو سکیں، اور یہ صورت ایسی ضروری ہے کہ اگر از خود کوئی تکمیل کی طرف توجہ نہ کرے تو قوم کو متفق ہو کر اور مصارف برداشت کر کے اس کا اہتمام ضروری ہے کہ چند آدمیوں کو اس طرف متوجہ کریں، اور اُن کے خوردونوش (کھانے پینے) کے ذمہ دار ہوں، اور جب وہ طبیب ہو جائیں تو اُن کے گذارہ کے ذمہ دار ہو کر ان کو شہر میں رکھیں، اور وقتاً فوقتاً اپنے علاج کی حاجتیں اُن کے سامنے پیش کریں، پس اسی طرح مطبِ روحانی کے اہتمام کو کہ عبارت ہے دینی حاجتوں کے انتظام سے اس مطبِ جسمانی پر قیاس کر لیا جائے، اور یوں اگر کوئی اس مطبِ رُوحانی ہی کو فضول سمجھے وہ ہمارے نزدیک قوم سے خارج ہے، وہ ہمارا مخاطب ہی نہیں، خطاب مسلمانوں کو ہے، جس طرح کوئی وحشی جنگلی مطبِ جسمانی ہی کو فضول بتلائے تو وہ مطبِ جسمانی کی مثال اس پر حجت نہیں،

غرض اس تقریر سے اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا ظاہر ہو گیا، جب یہ مصلحت عام قوم

کی ہے تو مثال طبیب کی طرح ان صاحبوں کے نفقات جو کہ اس مصلحت کی تکمیل میں مشغول ہیں، یعنی دین کے علماء و طلباء (مجموعہ قوم کے ذمہ واجب ہوں گے،

مذکورہ صاحبان کے نفقہ کے لئے مہتمم مدرسہ کو چندہ دینا

پھر جس وقت تک بیت المال منتظم تھا، بیت المال سے وصول ہو جانا عامہ مسلمین سے وصول ہو جانے کی صورت تھی، چنانچہ فقہاء نے قضاۃ و علماء و مفتیین و امثالہم کی کفایت کا بیت المال میں سے ہونا تصریحاً لکھا ہے، اور جب سے بیت المال منتظم نہیں رہا اب اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مسلمان متفق و مجتمع ہو کر تھوڑا تھوڑا سب ان حضرات کی خدمت بقدرِ کفایت کریں، خواہ مدرسہ کی شکل میں ہو جس میں ضوابط و قواعد مقرر ہوتے ہیں، اور ان صاحبوں کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر ہوتے ہیں، اور یہ سہل اور اقرب الی الضبط (آسان اور انتظامی لحاظ سے بہتر) اور خواہ توکل کی صورت میں، ہو جس میں کوئی مقدار معین نہیں، جو کسی کو توفیق ہوئی بلا واسطہ کسی مہتمم وغیرہ کے خود ان کی نذر کر دے، اور یہ اقرب الی الخلوص (خلوص کے قریب) ہے،

اور یہ مسئلہ قرآنی منصوص بھی ہے، قال اللہ تعالیٰ:۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ، (البقرہ، آیت ۲۷۳)

"اس میں حق اُن حاجتمندوں کا بھی ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں، اس لئے کہ وہ زمین میں محنت مشقت نہیں کر سکتے"،

اس آیت میں اگر ان امور پر نظر کی جائے کہ لام استحقاق کا ہے، لفظ فقراء احتیاج کو تبلا رہا ہے، "اُحْصِرُوْا" احتباس پر دلالت کر رہا ہے، اور فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ منقول ہے، اور لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا عدمِ تفرغ الاسباب المعاش (اسبابِ معاش کی فرصت نہ ہونے) کی طرف اشارہ کر رہا ہے، تو تقریر مذکور کی صریح دلیل ہے،

پس علماء و طلباء سے جو سوال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو علمِ دین میں مشغول ہیں آخر انھوں نے معاش کا کیا انتظام کیا ہے، تو عجیب بات ہے کہ سوال کا حق تو ان کو تھا بالعکس (اُلٹا) وہ اُن سے پوچھنے لگے،

اب معلوم ہو گیا ہو گا کہ جب اس کا انتظام قوم پر واجب ہے تو اگر ان کی خدمت میں کوتاہی کریں گے تو قیامت میں اُن سے باز پرس ہو گی، اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تعلیمِ دین پر جو تنخواہ لی جاتی ہے اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قولِ جوازِ اخذ الاجرت علی الطاعات

زنگیوں پر معاوضہ حاصل کرنے کے جائز ہونے) پر فتویٰ دینے کی حاجت نہیں، اس کو اجرت ہی کیوں کہا جائے؟ کفایت جزاء للحبس (پابندی کے بدلہ کے لئے کفالت) کہا جائے، تو خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر اس کا جواز ثابت رہے گا،

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ یہ سب موقوف اس پر ہے کہ یہ لوگ اپنی معاش کے لئے فارغ نہیں ہیں سو ہم یہ نہیں مانتے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے اگر یہ لوگ معاش میں مشغول ہوں.... تو ان خدماتِ دینیہ کا ایسا حق ادا نہیں کر سکتے، جیسا کہ بالکل اس کے لئے فارغ ہوں اس وقت ادا کر سکتے ہیں، اور تجارب میں منازعت (تجربہ شدہ معاملہ میں بحث) نہیں ہو سکتی، حق تعالیٰ نے جن کی نسبت لَا يَسْتَطِيعُونَ فرمایا ہے وہ اپاہج نہ تھے، بلکہ غایت درجہ مشغول فی سبیل اللہ تھے،

علماء کی دینی خدمات معلوم کرنے کا معیار

البتہ اس تقریر سے وہ علماء منتفع ہو سکتے ہیں جن کی نیت محض دینی خدمت ہے، طلبِ اموال نہیں ہے، اور اس کا معیار یہ ہے کہ اگر ایک جگہ تنخواہ میں توسط کے ساتھ گذر ہو رہا ہے اور دوسری جگہ سے زیادہ تنخواہ کا پیام آئے اور دوسری جگہ جانے میں کوئی دینی مصلحت زیادہ نہ ہو تو یہ شخص وہاں جانے سے انکار کرے، بس یہ معیار ہے ورنہ بے شک وہ اجیر (مزدور) ہے، اور ایسے شخص کی تنخواہ کا تعین اس کو رزق وکفایت ہونے سے نہ نکالے گا، بلکہ تعین کو بمصلحت قطعِ نزاع (جھگڑے کو ختم کرنا) کہا جائے گا جس سے وہ اجرت نہ ہوگی،

مادی نفقہ کے احکام ختم ہوئے

بابُ النفقاتِ الروحانیہ

نفقاتِ روحانیہ کا مفہوم، نفقاتِ روحانیہ سے مراد دینی تعلیم و تربیت ہے، اوپر اہل و عیال کے حقوق متعلقہ انفاقِ رزق حسّی (یعنی مادی رزق) کے بیان کئے گئے تھے، ایک قسم انفاق اور رزق کی معنوی بھی ہے، یعنی دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں،

چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝	(اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں")،
(البقرۃ: آیت ۳)	
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ ،	(جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ اُن بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا")،
(البقرۃ: آیت ۲۵)	

کی تفسیر البذل من النعم الظاهرة والباطنة کے ساتھ مع اس کی مؤید علم لایقال بہ ا ولا ینفق منہ کے اور مرزوق کی تفسیر الطاعات والمعارف التی یستلزمها اصحاب الفطرۃ والعقولِ السلیمۃ کے ساتھ کرنا (کما فی الروح) دلیل ہے اس کی کہ رزق عام ہے معنوی کو بھی اور انفاق عام ہے رزقِ معنوی کو بھی، تو ایک نوع کے نفقات وارزاق کے بعد دوسری نوع کے نفقات وارزاق کے احکام کا بیان کیا جانا اولیٰ و احریٰ ہے، (بہتر اور موزوں ترین) ہے۔ اس لئے اب دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں وہ مذکور ہوتے ہیں:۔

بیوی اور اولاد کی روحانی تربیت جسمانی پرورش سے زیادہ ضروری ہے جاننا چاہئے کہ جس طرح نفقاتِ حسیّہ (مادی اخراجات) سے بی بی اور اولاد اور متعلقین کی جسمی تربیت ضروری ہے، جس کا اوپر بیان کیا گیا ہے، اسی طرح علوم و طرقِ اصلاح (علوم اور اصلاح کے طریقوں) سے ان کی روحی تربیت اس سے زیادہ ضروری ہے، اس میں بھی انواع انواع (قسم قسم) کی کوتاہیاں اختیار کی جاتی ہیں،

دین کی بات بتلانا اور امرِ منکر پر روکنا اولاد اور بیوی کے حقوق میں داخل ہے،

چنانچہ سب سے اوّل اور اعظم کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے، یعنی اپنے گھر والوں کو نہ کبھی دین کی بات بتلاتے ہیں، نہ کسی امرِ منکر (بُرے کام) پر ان پر روک ٹوک کرتے ہیں، پس ان کا حق اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو ضروریات کے لائق خرچ دیدیا اور سبکدوش (فارغ) ہوگئے، حالانکہ قرآن مجید میں نصِ صریح:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ۱ھ

("اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ")۔

اور سنت میں حدیث صحیح:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ،

("تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور قیامت کے روز تم میں سے ہر ایک سے اس کے محکوموں کے بارے میں سوال ہوگا")۔

اس کے وجوب کو صاف بتلا رہے ہیں، نیز اس میں متعدد مرفوع حدیثیں ہیں:-

اخفهم فی الله ولا ترفع عنهم عصاك ورجل كانت عنده امة يطأها فادبها فاحسن تاديبها وعلمها فاحسن تعليمها (متفق عليه عن ابی موسیٰ، كتاب الايمان)

("یعنی ان کو اللہ سے ڈراؤ، اور ان سے بے توجہی نہ کرو، یعنی ایک شخص کے پاس باندی ہے وہ اس سے وطی بھی کرتا ہے، اور اُسے اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے")

وَمَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَهُنَّ (رواه فی شرح السنة عن ابن عباسؓ)

("جس نے تین بیٹیوں یا اسی طرح تین بہنوں کی پرورش کی اور انھیں ادب سکھایا")

لان يؤدب الرجل ولده خير من ان يتصدق بصاع، ترمذی عن جابر بن سمرة،

("یعنی آدمی اپنے لڑکے کو ادب سکھائے، اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے")

ما نحل والد ولده من نحل افضل من ادب حسن (ترمذی عن ایوب بن موسیٰ عن ابیہ عن جدہ)

("کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دی")

مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا فَاضْرِبُوْهُمْ

(اپنے لڑکوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں اور جب وہ دس برس کی عمر کو پہنچ جائیں تو انکو مارو (نماز نہ پڑھنے پر)"

یہ سب نصوص دلالت کر رہے ہیں تعلیم و تربیت دونوں کی مطلوبیت پر،

لڑکیوں کو دینی تعلیم دلانا ضروری ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کی تعلیم کو تو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بیٹیوں کی اور لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ تعلیم نسواں کو مضر سمجھتے ہیں، جیسا کہ اس کے مقابلہ میں بعض لوگ نسواں (عورتوں) کے لئے تعلیمِ جدید[1] کو یا تعلیمِ قدیم کو بطرزِ جدید بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس کی کافی بحث تعلیم نسواں کی تحقیق میں اسی رسالہ میں گزر چکی[2] ہے، ضرور ملاحظہ فرمائی جاوے، ان سے ان کوتاہیوں کا اور ان کے تدارک کا اچھی طرح علم ہو جائے گا،

تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے، تعلیمِ درسی سے تو من کل الوجوہ (ہر اعتبار سے) اور مطلق تعلیم سے من وجہٍ (بعض وجوہ سے)۔ تعلیمِ درسی سے تو اس لئے کہ وہ فرضِ عین نہیں، بہت صحابہ علومِ درسیہ سے خالی تھے مگر ان پر کبھی اس کو لازم نہیں کیا گیا، اور تربیت یعنی تہذیبِ نفس ہر شخص پر فرضِ عین ہے، اور مطلق تعلیم سے اس لئے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم علم دینا ہے، اور تربیت عمل کرانا اور علم سے مقصود عمل ہی ہے، اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہے، اور ان سے اعمالِ جوارح (انسانی اعضا سے متعلق اعمالِ صالحہ) کا عقائد سے اہم ہونے کا اشکال لازم نہیں آتا، کیونکہ عقائد تو خود علومِ مقصودہ بالذات ہیں، اور گفتگو ان علوم میں ہے جو عمل کے لئے مقصود ہیں، اور من وجہٍ (ایک طرح) اس لئے کہا گیا کہ بعض حیثیتوں سے یہ علوم افضل ہیں اعمال سے کہ علم اصل اور بناء ہے، اور عمل اس کی

---

[1] جس کا مہلک ہونا ظاہر ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ٭ اس علم کو کہتے ہیں اربابِ نظر موت

[2] ملاحظہ ہو اصلاحِ معاملہ متعلقہ بہ تعلیمِ نسواں اس عبارت تک "یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اختلاف کا" اصلاحِ انقلابِ امت جلد اول ص ، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

فرع اور اس پر مبنی، بہرحال تربیت یا تعلیم سے اہم ہے یا اس کے برابر مہم ہی سہی، مگر اس سے قطع نظر کرنے کی اور ضروری نہ سمجھنے کی تو کسی حال میں گنجائش نہیں،

تربیت آجکل کی تہذیب کا نام نہیں،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تربیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر اس کی حقیقت تہذیب عرفی سمجھتے ہیں، چنانچہ اسی کا اہتمام بھی کرتے ہیں، گو وہ شریعت مقدسہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ میں نے ایک معزز تعلیم یافتہ کا جو کہ طبیب بھی تھے، بچشم خود یہ واقعہ دیکھا کہ اُن کی گود میں ان کا ایک بچہ تھا، ایک صاحب اُن سے ملنے آئے، تو انھوں نے اس بچے کو حکم دیا کہ ان کو سلام کرو، یہاں تک تو نہایت خوبی کی بات تھی، اس بچہ نے کہا السلام علیکم، تو حکیم صاحب کیا فرماتے ہیں "یوں نہیں کہتے اس طرح کہو آداب عرض"، وہ ملاقاتی صاحب دیندار آدمی تھے بہت بگڑے، اور کہا افسوس! بچہ تو سنت کے موافق عمل کرے اور آپ اس کو بدعت کی تعلیم دیں، تو وجہ اس کی یہی ہے کہ تہذیبِ شرعی ان کی نظر میں کوئی چیز نہیں، حالانکہ مسلمان کو جس تہذیب کا امر ہے وہ تہذیبِ شرعی ہے،

آجکل کی تہذیب کو تعذیب کہنا بجا ہے

بلکہ دونوں تہذیبوں کی حقیقت اور ان کے آثار میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ عرفی جو کہ تہذیبِ شرعی کے منافی ہو، اس قابل بھی نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جاسکے، بلکہ احقر تو اس کو تعذیب (عذاب) کہا کرتا ہے، کیونکہ حقیقت اس کی تکلف ہے۔ اور تکلف سے جو کلفتیں ہوتی ہیں وہ ظاہر ہیں، بلکہ تکلف کو تکلف کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس میں کلفتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے، امراء کی مجالس میں اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے،

حقیقی تہذیب، تہذیب شرعی کا نام ہے،

حقیقی تہذیب تہذیب شرعی ہی ہے، چنانچہ متبعینِ سنت جو اس تہذیب کے عامل ہیں وہ جس راحت میں ہیں اس کا مشاہدہ محققین علماء مشائخ کی مجلس میں کر لیا جائے، اور آخری بات یہ ہے کہ اگر تہذیب غیر شرعی میں کلفت بھی نہ ہو اور تہذیب شرعی میں راحت بھی نہ ہو تب بھی جب مسلمان کے لئے ایک منہی عنہ (ممنوع) ہے اور دوسری مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہے) تو مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک کا ترک دوسرے کا فعل لازم ہوگا، جیسے اگر نماز کے لئے اٹھنے میں مشقت ہو اور گرم بستر میں لیٹے رہنے سے راحت ہو، مگر اس مشقت کو اس راحت پر ترجیح ہوگی، پھر اس کا بھی مشاہدہ کھلی آنکھوں ہر عامل کرلے گا کہ یہ مشقت اور یہ راحت چند روز ہی، پھر تو ایسا ذوق صحیح عطا ہوگا کہ موافقت شرع کے برابر کسی چیز میں راحت اور مخالفت شرع کے برابر کسی چیز میں کلفت نہ ہوگی مولانا اسی کو فرماتے ہیں ع "چند روزے جہد کن باقی بخند" (یعنی چند روز کوشش کر بقیہ ایام ہنستا رہ یعنی عیش کر)۔

غرض تربیتِ صحیحہ تہذیبِ شرعی کا نام ہے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے،

تہذیبِ شرعی کے اپنانے میں عملی فردگذاشتیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ ضرورت بھی اسی تہذیب شرعی کی سمجھتے ہیں اور اس کا قصد بھی کرتے ہیں، مگر اس کی حقیقت نہیں سمجھتے، اس لئے اس میں عملاً وارشاداً فردگذاشتیں کرتے ہیں، اور اس اخیر کوتاہی میں دیندار بکثرت مبتلا ہیں، ان میں بعضے اہلِ علم بھی بلکہ بعض اہلِ طریقت بھی ہیں کہ بہت سے شعبے ان کے ذہن میں بھی نہیں آتے، اور اس وجہ سے خود ان سے ایسی حرکات صادر ہوتی ہیں جو سراسر عقل اور دین کے خلاف ہوتی ہیں اور ان بزرگوں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا، جب خود یہ حالت ہے تو دوسروں کی تو یہ کیا اصلاح کریں گے؟ اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو تہذیبِ حقیقی کی حقیقت نہیں معلوم ہوئی، اور باوجود اس کے کہ ان میں سے بعض نے درسیات بھی پوری کرلی ہیں، اور بعضے خدمتِ تدریس پر بھی معمور ہیں، اور شب و روز قرآن وحدیث زبان پر جاری ہیں، پھر بھی یہ بے خبری ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کی تعلیم نہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان صاحبوں کو اس طرف التفات نہیں، قرآن مجید میں

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ،	"نماز کی پابندی کرتے رہو اور زکوۃ دیتے رہو"

کو دیکھتے ہیں مگر

لَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ ، (المدثر، آیت ۶)	"اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے وقت زیادہ معاوضہ چاہو"۔

کو نہیں دیکھتے،

لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا ط (النور، آیت ۲۷)	"تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جبتک کہ (ان سے) اجازت حاصل نہ کرلو اور (اجازت لینے کے قبل) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو"۔

کے عموم پر نظر نہیں کرتے، مجھ کو خود ایک ذی علم کے ساتھ اس باب میں مکالمت (گفتگو) کا اتفاق ہوا، جو شب کے وقت میرے مردانہ مکان کے پھاٹک پر پہنچے، وقت ایسا تھا کہ سب سو گئے تھے اور ان کا کوئی شناسا بھی نہ تھا، آواز دی، ملازم جاگا، اور بولا، پھاٹک کھولنے کا حکم دیا کہ ہم ٹھیریں گے، اس کو بوجہ بے وقت ہوجانے کے اور اُن کو نہ پہچاننے کے بے اطمینانی ہوئی، اس لئے

اس نے ادب کے ساتھ کچھ عذر بھی کیا، مگر جب تاکیدی حکم ملا تو اس نے مروّت کے سبب پھاٹک کھول دیا، اور وہ دیوان خانہ میں آکر مقیم ہوگئے، صبح کو مجھ کو واقعہ معلوم ہوا، میں نے اُن سے یہ آیت پڑھکر بلااذن (بغیر اجازت) ٹھیرنے کی وجہ پوچھی، انھوں نے فرمایا یہ آیت خاص زنانخانہ کے متعلق ہے، میں نے اس تخصیص کی دلیل پوچھی، جواب ندارد،

اسی طرح ان آیتوں پر اُن کی نظر نہیں پڑتی:

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا (النساء، آیت ۴)	"یعنی ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزء تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔"
وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ، (البقرہ، آیت ۲۳۸)	"اور تمھارا معاف کرنا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے"۔

کہ حق تعالیٰ نے مہر کی معافی کی صحت کے لئے طیبِ نفس کی شرط لگائی، اور پھر اقرب الی التقویٰ، عالی ہمتی کو فرمایا کہ بجائے ان سے معاف کرانے کے اُن کے حق سے زائد ان کو دیدو،

لوگوں کو مجبور کر کے چندہ وصول کرنا جائز نہیں،

چنانچہ اس نظر نہ پڑنے کا ثمرہ یہ ہو کہ ایسے لوگوں سے جن کے ساتھ بیوی کی جیسی بے تکلفی بھی نہیں یہ لوگ مساجد یا مدارس کے لئے خطاب خاص کے ساتھ چندہ کا سوال کرتے ہیں، اور بوجہ بے تکلفی نہ ہونے کے وہ لوگ اُن کی وجاہت دنیویہ یا دینیہ سے مرعوب اور مغلوب ہوکر آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر نہیں کرسکتے۔ اور کراہت کے ساتھ اس سوال کو پورا کرتے ہیں، موٹی بات یہ ہے کہ بی بی جس سے غایت درجہ بے تکلفی ہے اور جہاں غالب طیب خاطر ہے جب اس سے معافی قبول کرنے میں طیبِ خاطر کو شرط قرار دیا گیا ہے جو تکلف کے موقع پر جہاں ایسا تعلق بھی نہیں اس طیبِ خاطر کا اہتمام بلیغ کیوں نہ شرط ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں اس کی غایت درجہ کی تصریح فرمائی ہے

أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ،	"خبردار! کسی مسلمان کا مال بدون اس کی طیب خاطر کے حلال نہیں"۔

بلکہ عالی ہمتی وعالی حوصلگی دنیز ابقاءِ عزت دین کا مقتضا، تو یہ تھا کہ اس باب میں بالکل ہی یکسوئی اختیار کرتے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت پر رہتے، حیث قالوا: لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا، (میں تم سے اس پر مال کا سوال نہیں کرتا)، نظر نہ ہونے نے اس غائلہ (آفت) میں مبتلا کیا،

ابا حتِ تصرفِ مالی میں کوتاہ نظری

اباحتِ تصرفِ مالی کی شرائط کے متعلق کوتاہ نظری کے شعبوں میں سے ایک اور واقعہ ہے کہ میرے یہاں ایک مولانا مہمان آئے، گھر سے اُن کے لئے کھانا آیا تو آپ نے ایک دوسرے ہم وطن کو اصرار کر کے کھانے میں شریک کرلیا، میرے ملازم نے کہا کہ بلا اجازت مالک کے یہ تصرف جائز نہیں معلوم ہوتا، فرمانے لگے ہم تحقیق کرلیں گے، مگر ان کے نزدیک یہ امر اتنا مہتم بالشان ہی نہ تھا جو تحقیق کو ضروری سمجھتے، چنانچہ تحقیق نہیں فرمایا، اسی طرح کئی روز گذر گئے، آخر میں نے ہی ایک روز ان سے تذکرہ کیا، تو فرماتے ہیں میں یہ سمجھا کہ یہ سب میرے ہی لئے ہے، اور تھا زیادہ اس لئے دوسرے کو شریک کرلیا، میں نے کہا حیرت ہے، آپ کے پاس اس کی کیا دلیل تھی کہ یہ تملیکاً آیا ہے؟ بلکہ ظاہر تو یہی تھا کہ اباحۃً آیا ہے، اور وہ اباحت مقید ہے تصرفِ خاص کے ساتھ کہ وہ آپ کا نوش فرمانا ہے، اور زیادہ اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ مہمان کو کمی نہ رہے، اور شاید وہ دوبارہ مانگتا ہوا شرمائے تو آپ نے یہ دوسرا تصرف کس بناء پر کیا؟

تربیتِ اخلاق کی نظر سے قرآن وحدیث نہ دیکھنے والے علماء کی چند کوتاہیاں

غرض ان باتوں کی پرواہ ہی نہیں، سب کی وجہ یہی ہے کہ تربیت اخلاق کی نظر سے قرآن وحدیث کو نہیں دیکھا، اسی طرح بعض اہلِ علم و اہلِ مشیخت میں ایک بلائے عام شائع ہے، اِلّا نادراً کہ اپنے ساتھ دعوت میں دو چار کو (اگر بڑے محتاط ہوئے) یا بڑے مجمع کو (اگر غیر محتاط ہوئے) لے جاتے ہیں، اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ صاحبِ دعوت کی اجازت ہو ہی گی، حالانکہ بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ صاحبِ دعوت کو گراں گزرتا ہے، مگر ان کو کچھ بحث نہیں، ان میں بعضے اجازت کی ضرورت بھی سمجھتے ہیں مگر خود اجازت کی حقیقت نہیں سمجھتے، اجازت لینا وہ ہے جہاں اجازت دینے والا آزادی سے انکار بھی کرسکے، جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر دعوت میں ایک زائد شخص کی اجازت لی، مگر اس کے ساتھ ہی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثار خادموں کو اس قدر بے تکلف کر رکھا تھا کہ جب اُن کی رائے نہ ہوتی تو صاف انکار بھی کردیتے، چنانچہ ایک فارسی کا شوربا پکانا اور آپؐ کی دعوت کرنا اور آپؐ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے پوچھنا اور اس کا انکار کردینا، اور آپؐ کا بُرا نہ ماننا اور اسی طرح حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے مغیثؓ کی سفارش فرمانا اور اس کا انکار کردینا حدیثوں میں مصرح ہے، کیا آج کسی مرید کی ہمت ہے کہ وہ اس طرح پیر کی اجازت لینے پر انکار کرسکے، یا کسی پیر کی ہمت ہے کہ مرید کے لیے انکار کو بشاشت کے ساتھ قبول کرلے، حضرت قیامت قائم ہوجائے، تو ایسی اجازت کا نہ لینا معتبر نہ دینا معتبر، سو ان صاحبوں کو اجازت کی حقیقت سے ہی

آگاہی نہیں، غرض یہ وہ جماعت ہے کہ ضرورت تو تہذیبِ شرعی کی سمجھتے ہیں، مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، یہ مختصر نمونہ ہے تعلیم و تربیت کے متعلق کوتاہیوں کا، اور ضرورت دونوں امر کی عام ہوئی،

تعلیم و تربیت کا اثر ابتدا ہی میں مستحکم ہو سکتا ہے،

اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ابتدا ہی سے جو تعلیم و تربیت ہو اس کا جز اثر ہوتا ہے کہ علوم و اعمال مثل امورِ فطریہ و طبعیہ کے ہو جاتے ہیں، وہ بات بعد میں نہیں ہوتی، اور یہ کام ماں باپ اور سرپرستوں کا ہے، اور وہ عموماً اس میں کوتاہی کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہالتیں اور بداخلاقیاں طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہیں، پھر بعد میں جو شخص اس کا اہتمام کرنا چاہے، مثلاً عورت کے لئے شوہر اور مردوں کے لئے استاد و پیر، ان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض ناگواری درجۂ منافرت تک پہنچ جاتی ہے، دوسرے مصلحین سے تو یہ منافرت صرف مباعدت (دوری) کی صورت پیدا کر لیتی ہے،

عورتوں کی اصلاح کی طرف پوری توجہ دینی چاہئے!!

مگر زوجین کا تعلق ایسا ہے کہ ہر وقت کا سابقہ رہتا ہے، اور مرد اپنی مصلحتوں سے قطع تعلق کو پسند نہیں کرتا، اور نہ عورت کی جہالتوں کی برداشت کرتا ہے تو یہاں ہمیشہ کے لئے منازعت و مناقشت (لڑائی جھگڑے) کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے، جس کے نتائج جانبین کے حق میں برے سے برے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور دونوں کی زندگی موت سے بھی تلخ تر ہو جاتی ہے، اور ان سب کا سبب اکثر وہی ابتدا میں اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا ہے، لیکن اگر ایسا اتفاق ہو گیا تو یہی نہیں کہ ان لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا جائے بلکہ جب قدرت ہو تب ہی اس کی سعی کرنا ضروری ہے،

تہذیبِ شرعی پر عمل درآمد کا طریقہ

اور قدرت دو قسم کی ہے، ارادی اور قہری، سو ارادی تو پیر اور استاد کی ہے، اور قہری حاکم کی ہے، خواہ بحکومتِ عامہ ہو جیسے سلطان و نائبِ سلطان، خواہ بحکومتِ خاصہ جیسے عورت کے لئے شوہر، یا غلام کے لئے آقا، سو مردوں کے لئے تو تہذیبِ شرعی کے لئے حکومتِ قہریہ کے اسباب بہت کم مجتمع ہوتے ہیں، کیونکہ سلاطین کو تو اس طرف توجہ ہی نہیں، اور غلام کسی کے ہیں نہیں، اب رہ گئی حکومتِ ارادیہ سو اس کے اثر سے نکل جانا ہر وقت ان کے اختیار میں ہے، اس لئے مردوں کی اصلاح کے اسباب بے شک ضعیف ہیں، البتہ عورتوں کے لئے عادتاً شوہر کا ہونا لازم ہے، اور گو کبھی اس کی مدت قصیر (کم) بھی ہوتی ہے مگر اکثر طویل ہی ہوتی ہے، سو عورتوں کی اصلاح کا طریق بہت سہل ہے،

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ماں باپ یا پرورش کنندہ کے ذمہ بچوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہوئی

اور شوہر کے ذمہ بیبیوں کی، اصالۃً اسی مضمون کو بیان کرنا مقصود ہے، باقی جس کو جس پر قدرت ہو اور جس قسم کی ہو وہ اسی پر قیاس کرلی جاوے، ممکن ہے کہ استطراداً اس کے بھی کچھ مضامین مذکور ہوجائیں پس سنئے:

عورتوں کی تعلیم وتربیت کے مختصر اور ضروری قواعد

تعلیم وتربیت کے مختصر اور ضروری قواعد مخلوط طور پر لکھے جاتے ہیں:۔

(۱) جب گھر میں بی بی کو نکاح کرکے لاوے اوّل اس کو اپنے سے بے تکلف کرلے، اس کے بعد عقائدِ ضروریہ میں سے اس کا امتحان لے، یعنی بہشتی زیور کے اوّل حصہ میں جو عقائد ضروریہ لکھے ہیں ان کو سُناکر اور سمجھاکر اس سے پوچھے کہ کیا تیرا یہی عقیدہ ہے، جس کا وہ اقرار کرلے اس اقرار پر اکتفاء کرے، اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی زبان سے پوری تقریر کرسکے، بعض عوام اس پر قادر نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کو اس کی تکلیف نہ دی جاوے، اور جس میں وہ تردّد (شک) ظاہر کرے اس کو خوب سمجھاکر بتلادے کہ یہ عقیدہ ضروری ہے، اسی کے موافق اپنا اعتقاد رکھے،

(۲) اس کی پوری نماز سُن لے، یعنی جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی اور رکعات کی تعداد مع فرض اور واجب اور سنتوں کے، اور ہر ایک کی جس طرح نیت کی جاتی ہے، اور رکوع وسجود وقعدہ کی ہیئت سب پوچھ لے، اور دیکھ لے، جہاں کوئی غلطی ہو اس کو درست کردے، اور درست کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بس ایک دفعہ زبان سے کہہ دیا، ممکن ہے کہ ذہول (بھول) ہوجاوے، اور ممکن ہے کہ بہت سی غلطیوں پر ایک دم سے متنبہ کیا، اور سب کو ضبط نہ کرسکی، اس لئے ایک ایک غلطی کی اصلاح کرکے اس پر بار بار عمل کراکر دیکھ لے، اس طرح سے تمام نماز کو درست کردے،

(۳) اس کو پردہ کے سب احکام ومسائل بتلادے، کہ کس کس سے پردہ کرنا ضرور ہے، اور کون کون محرم ہیں، اور اس کی بہت تاکید کردے، یہ سب مسائل بہشتی زیور میں ملیں گے، ان کو دیکھ دیکھ کر بتلادے،

(۴) اس کو اہلِ حقوق کے حقوق خصوص جن سے ہر وقت سابقہ (واسطہ) پڑے گا سمجھادے رسالہ حقوق الاسلام میں یہ حقوق مذکور ہیں، خواہ اُن کو پڑھ کر سنادے یا سمجھادے،

(۵) رسومِ جہالت کی قباحت اس کے دل میں بٹھلادے، اور ان سے ایسی نفرت دلادے کہ وہ اُن کے پاس نہ پھٹکے، اصلاح الرسوم اس کے لئے کافی ہے، نیز اس کے دیگر اعمال واخلاق و عادات کی اصلاح کی بھی کوشش جاری رکھے، جس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ کتبِ ذیل اس کو تھوڑا تھوڑا کرکے سنادے:۔

بہشتی زیور تمام اور فروع الایمان جزاء الاعمال، تصد السبیل، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم. تبلیغ دین، آداب المعاشرت، احقر کے مواعظ[1] جو کہ تخمیناً سو کی تعداد یا کچھ کم دبیش چھپ چکے ہیں. یہ رسالہ اصلاح انقلاب ... جتنا چھپ جاوے، ترجمہ روضۃ الریاحین اگر چھپ جاوے، اور جو کوئی حرکت ان کتابوں کے خلاف ہو نرمی سے مطلع کرے. اور بار بار مطلع کرنے سے اُکتاوے نہیں، انشاء اللہ ضرور اثر اور نفع ہوگا،

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الذّٰریٰت، آیت)	(اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا ایمان لانیوالوں کو (بھی) نفع دے گا")

(۶) خرچ کرنے کے آداب اس کو سمجھاوے کہ فضولیات میں خرچ نہ کرے،

(۷) زیور اور لباس کے زیادہ .... اہتمام کرنے سے اس کو نفرت دلاوے،

(۸) تھوڑا سا ذکر و شغل اس کو قصد السبیل سے بتلادے، اگر کوئی شیخ متبع سنت محقق میسر ہو اس کی برکات و کمالات اس کے سامنے بیان کرکے جب اس کو اعتقاد ہو جاوے اس کو بیعت کرادے کہ اس کو اتباع کی سہولت میں دخل عظیم ہے،

(۹) اگر تھوڑا وقت فرصت کا نکال کر کچھ لکھ پڑھ لے اس قدر کہ کتب مذکورہ ؎ کو پڑھ کر سمجھ سکے تو زیادہ بہتر ہے، اس سے اس کی نظر دین پر وسیع ہو جاتی ہے، اور جس قدر نظر وسیع ہوگی اسی قدر اصلاح میں ترقی کی امید ہے،

بچوں کی تربیت کا طریقہ

(۱۰) پھر خدا تعالیٰ جب اولاد دے اور وہ سیانی ہونے لگے تو سب سے اوّل اس کو کلمۂ توحید سکھلاوے، پھر اس کو ضروری آداب کی تعلیم کرے،

(۱۱) جب سامنے آوے سلام کرے،

(۱۲) کسی کے پاس کوئی چیز دیکھے تو حرص نہ کرے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی وسعت (حیثیت) کے موافق اس کی مرغوب (پسندیدہ) چیزیں خود منگا کر اس کو کھلاتا پلاتا رہے، اور جب وہ ضد کرے ہرگز اس کی ضد پوری نہ کرے، تاکہ ضد کرنے کی عادت چھوٹ جاوے،

(۱۳) اس کو یہ عادت ڈالے کہ کوئی چیز تنہا نہ کھاوے، بلکہ دوسرے بچوں کو تقسیم کرکے کھائے، اور اس کے لئے یہ رعایت رکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اس کو دے خواہ نقد یا غیر نقد اس کی ملک نہ کرے،

---

[1] حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے مواعظ کا مطالعہ اصلاح نفس کے لئے تریاق کا حکم رکھتا ہے، ان کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے ۱۲

کیونکہ ملک ہو جانے کے بعد نابالغ کو تبرع کرنا جائز نہیں، بلکہ اباحت کے طور پر دے، تاکہ دوسروں کو دینا اوران دوسروں کو لینا جائز ہو،

(۱۴) جھوٹ بولنے سے اس کو نفرت دلائے،

(۱۵) پردہ اور حیا، کی اس کو تعلیم کرے،

(۱۶) اس کو یہ عادت ڈلے کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا اقرار کر لیا کرے، اور اگر وہ غلطی متعدّی ہو تو صاحبِ حق سے معاف کرایا کرے، اس کی عادت ڈالنا بہت سخت ضروری ہے کہ اس میں اس کے دین کی سلامتی اور دنیا میں موجبِ عزت و راحت ہے، اور اس میں پس و پیش کرنا تکبر اور ہمیشہ کے لئے موجبِ نفرت و ذلت ہے،

(۱۷) اس کی بھی عادت ڈلے کہ سخن پروری کبھی نہ کرے، حق واضح ہو جانے کے بعد گو اپنے سے کم درجہ کا آدمی اس پر مطلع کرے فوراً اس کا اتباع کرے، اور ہر امر میں اس کو تواضع اور خاکساری کی عادت ڈلے،

(۱۸) لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جگہ نہ کھیلنے دے، اگر وہ نامحرم ہیں تو آئندہ کے مفاسد کا اس میں انسداد ہے، اور اگر وہ محرم ہیں تو لڑکیوں میں قلتِ حیا، پیدا ہونے کا اور لڑکوں میں نقصانِ عقل کا احتمال ہے۔

(۱۹) اس کی عادت ڈلے کہ وہ چھپ کر کوئی کام نہ کریں، چھپ کر بچہ وہی کام کرے گا جس کو برا سمجھے گا، تو گویا ابتدا ہی سے وہ برا کام کرنے کا خوگر (عادی) ہو جائے گا،

(۲۰) خود بھی بچوں کے سامنے کوئی نامناسب کام یا بے حیائی کا کام نہ کرے، گو بچہ اتنا چھوٹا ہو کہ بول بھی نہ سکتا ہو، کیونکہ اس فعل کا عکس اس کے دماغ میں مرتسم (منقوش یعنی نقش) ہو جاتا ہے، پھر اس کا اثر بڑے ہو جانے کے بعد ظاہر ہو گا،

(۲۱) ہنسی، دل لگی کی عادت اس میں نہ پیدا ہونے دے کہ اس سے مادہ بیباکی کا پیدا ہو گا، کیونکہ محل بے محل کی بچہ کو تمیز نہیں ہو گی،

(۲۲) اس کا اہتمام رکھیں کہ سیانے بچوں میں دوستی نہ پیدا ہونے پائے کہ اس کے مفاسد بے شمار ہیں، اور اگر ان کو باہم کھیلنے میں کوئی مصلحت ہو تو اس کھیل کے وقت خود حاضر رہیں، بعد میں اختلاط (میل جول) نہ ہونے دے،

(۲۳) سیانے لڑکوں کو علماءِ محققین اور مشائخ محققین کی مجالس میں اپنے ساتھ لے جایا کرے،

کہ ان حضرات کی صحبت و توجہ موجب برکات و تقویت علی الدین والطاعات ہے،

(۲۴) جب بچہ سیانا ہوجائے اس کو نماز کی سورتیں اور دعائیں زبانی یاد کرائے اور نماز پڑھائے اور لڑکی ہو تو اس کو پردہ میں بٹھلائے،

(۲۵) اور جب پڑھنے کا متحمل ہو تو اس کو کسی ایسے مکتب میں جس کا معلم شفیق اور دیندار ہو بٹھلادے اور لڑکی ہو تو زنانہ مکتب میں بٹھلائے، مگر آجکل جو زنانہ اسکول ایجاد ہوئے ہیں ان کی آب و ہوا اچھی نہیں اُن سے بچائے،

(۲۶) سب سے اوّل قرآن شریف پڑھوائے، اگر دماغ متحمل ہو تو حفظ کرانا افضل ہے، ورنہ ناظرہ ہی سہی مگر صحیح خواں (صحیح پڑھانے والے) سے پڑھوائے،

(۲۷) اگر قرآن حفظ کرائے تو بعد ختم قرآن اور اگر ناظرہ پڑھوائے تو بعد نصف قرآن ایک سبق اُن کتابوں کا شروع کرائے جو نمبرہ میں مذکور ہوئیں،

(۲۸) اور خواہ ان سبقوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت نکال کر یا ان کتابوں کے بعد بقدر ضرورت کچھ حساب اور املاء، و انشاء کی مشق بھی ضرور کرادی جائے کہ ان چیزوں سے دین میں بھی مدد پہنچتی ہے لڑکیوں کے لئے لکھنے نہ لکھنے کے مناسب یا نامناسب کی تحقیق اسی رسالہ کے مبحث تعلیم نسواں میں گذر چکی ہے،

(۲۹) ان کتابوں کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فراغ دے تو عربی کی تعلیم بھی کرادے، کہ اس زمانے میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے، ورنہ کوئی حلال اور طیب حرفہ کسب معاش کے لئے سکھلادے کہ پریشانی سے ہمیشہ محفوظ رہے، بلکہ اگر علوم عربیہ کے ساتھ کوئی پیشہ مناسبِ حال طلبہ سکھلا دیا جائے تو علم دین کو ذریعۂ معاش بنانے سے وہ بچ سکتے ہیں،

(۳۰) اہل و عیال کی اصلاح و تادیب میں مضامینِ ذیل سے بہت اعانت ملے گی، ضرور ملاحظہ کرکے اس کے موافق عمل کریں،

رسالۂ ہٰذا کی سُرخی طریقِ اصلاحِ انقلاب طالبانِ احکام کے دستور العمل کے ختم تک،

رسالۂ ہٰذا کی سُرخی سدِ موانعِ انقلاب امرِ پنجم کے ختم تک،

حصۂ دہم بہشتی زیور اوّل سے ہنر اور پیشے کے بیان تک۔

رسالہ الامداد میں مضمون قوتُ العیال جواب تک حسب بیان مہتمم رسالہ ان پرچوں میں شائع ہوا ہے جلد اوّل کے سب باستثناء ۱۰، جلد دوم کے نمبر ۱، ۵، ۶، ۹، جلد سوم کے نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۰، جلد چہارم

کا نمبر ۳. یہاں تک مضمون لکھنے کے بعد یاد آیا کہ بہشتی زیور کے چوتھے حصہ میں بذیل سرخی "اولاد کی پرورش کرنے کا طریقہ" اسکے متعلق کچھ ضروری دستور العمل ہے، دیکھنے سے اس مقام پر اس کا بعینہ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا، گو اس میں بعض ماسبق کا تکرار بھی ہے، مگر اس کے مہتم بالشان ہونے کے سبب تکرار کو گوارا کر کے اس میں تصرف گوارا نہیں کیا گیا، وہو ہذا۔

اولاد کے پرورش کرنے کا طریقہ جاننا چاہیئے کہ یہ امر بہت ہی خیال رکھنے کے قابل ہے، کیونکہ بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہو جاتی ہے وہ عمر بھر نہیں جاتی، اس لئے بچپن سے جوان ہونے تک ان باتوں کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) نیک بخت دیندار عورت کا دودھ پلائیں، دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے،

(۲) عورتوں کی عادت ہے کہ بچوں کو کہیں سپاہی سے ڈراتی ہیں کہیں اور ڈراؤنی چیزوں سے، یہ بری بات ہے، اس سے بچے کا دل بیحد کمزور ہو جاتا ہے،

(۳) اس کے دودھ پلانے کے لئے اور کھلانے کے لئے وقت مقرر رکھو کہ وہ تندرست رہے،

(۴) اس کو صاف ستھرا رکھو، کہ اس سے تندرستی رہتی ہے،

(۵) اس کا بہت سا بناؤ سنگار مت کرو،

(۶) اگر لڑکا ہو اس کے سر پر بال مت بڑھاؤ،

(۷) اگر لڑکی ہے اس کو جب تک پردہ میں بیٹھنے کے لائق نہ ہو جائے زیور مت پہناؤ، اس سے ایک تو ان کی جان کا خطرہ ہے، دوسرے بچپن ہی سے زیور کا شوق دل میں پیدا ہونا اچھا نہیں،

(۸) بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کھانا کپڑا پیسے اور ایسی چیزیں دلوایا کرو، اسی طرح کھانے پینے کی چیزیں ان کے بھائی بہنوں کو یا اور بچوں کو تقسیم کرایا کرو، تا کہ اُن کو سخاوت کی عادت ہو، مگر یہ یاد رکھو کہ تم اپنی چیزیں اُن کے ہاتھ دلوایا کرو، خود جو چیز شرع سے انہی کی ہو اس کا دلوانا کسی کو درست نہیں،

(۹) زیادہ کھانے والوں کی برائی اس کے سامنے کیا کرو، مگر کسی کا نام لے کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ جو کوئی بہت کھاتا ہے لوگ اس کو حبشی کہتے ہیں، اس کو بیل جانتے ہیں،

(۱۰) اگر لڑکا ہو سفید کپڑے کی رغبت اس کے دل میں پیدا کرو، اور رنگین اور تکلف کے لباس سے اس کو نفرت دلاؤ کہ ایسے کپڑے لڑکیاں پہنتی ہیں، تم ماشاءاللہ مرد ہو، ہمیشہ اس کے سامنے ایسی باتیں کیا کرو،

(۱۱) اگر لڑکی ہو جب بھی زیادہ مانگ چوٹی بہت تکلف کے کپڑوں کی اس کی عادت مت ڈالو،

(۱۲) اس کی سب ضدیں پوری مت کرو کہ اس سے مزاج بگڑ جاتا ہے،

(۱۳) چلّا کر بولنے سے روکو، خاص کر اگر لڑکی ہو تو چلّانے پر خوب ڈانٹو، ورنہ بڑی ہو کر وہی عادت ہو جاوے گی،

(۱۴) جن بچّوں کی عادتیں خراب ہیں، یا پڑھنے لکھنے سے بھاگتے ہیں، یا تکلف کے کپڑے یا کھانے کے عادی ہیں اُن کے پاس بیٹھنے سے، اُن کے پاس کھیلنے سے اُن کو بچاؤ،

(۱۵) ان باتوں سے اُن کو نفرت دلاتی رہو، غصہ، جھوٹ، بولنا، کسی کو دیکھ کر جلنا، یا حرص کرنا، چوری، چغلی، اپنی بات کی پچ کرنا، خواہ مخواہ اس کو بنانا، بے فائدہ بہت باتیں کرنا، بے بات ہنسنا، یا زیادہ ہنسنا، دھوکہ دینا، بھلی بُری بات کا نہ سوچنا، اور جب ان باتوں میں سے کوئی بات ہو جاوے فوراً اس کو روکو، اس پر متنبہ کرو،

(۱۶) اگر کوئی چیز توڑ پھوڑ دے یا کسی کو مار بیٹھے، مناسب سزا دو، تاکہ پھر ایسا نہ کرے، ایسی باتوں میں پیار دلاڈ ہمیشہ بچّوں کو کھو دیتا ہے،

(۱۷) بہت سویرے مت سونے دو،

(۱۸) سویرے جاگنے کی عادت ڈالو،

(۱۹) جب سات برس کی عمر ہو جاوے نماز کی عادت ڈالو،

(۲۰) جب مکتب میں جانے کے قابل ہو جاوے اول قرآن مجید پڑھواؤ،

(۲۱) مکتب میں جانے میں کبھی رعایت مت کرو،

(۲۲) جہاں تک ہو سکے دیندار استاد سے پڑھواؤ،

(۲۳) کسی کسی وقت اُن کو نیک لوگوں کی حکایتیں سُنایا کرو،

(۲۴) ان کو ایسی کتابیں مت دو جن میں عاشقی معشوقی کی باتیں یا شرع کے خلاف مضمون یا اور بیہودہ قصے یا غزلیں وغیرہ ہوں،

(۲۵) ایسی کتابیں پڑھواؤ جس میں دین کی باتیں اور دنیا کی ضروری کارروائی آجاوے،

(۲۶) مکتب سے آنے کے بعد کسی قدر دل بہلانے کے لئے اس کو کھیلنے کی اجازت دو، تاکہ اس کی طبیعت گند نہ ہو جاوے، لیکن کھیل ایسا ہو جس میں کوئی گناہ نہ ہو، چوٹ لگنے کا اندیشہ نہ ہو،

(۲۷) آتشبازی یا باجہ یا فضول چیزیں مول لینے کے لئے پیسے مت دو،

(۲۸) کھیل، تماشے دکھلانے کی عادت مت ڈالو،

(۲۹) اولاد کو ضرور کوئی ایسا ہنر سکھلادو جس سے ضرورت اور مصیبت کے وقت چار پیسے حاصل کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا گذارہ کر سکے،

(۳۰) لڑکیوں کو اتنا لکھنا سکھلادو کہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکیں،

(۳۱) بچوں کو عادت ڈالو کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا کریں، اپاہج اور سست نہ ہو جائیں، ان کو کہو کہ رات کا بچھونا اپنے ہاتھ سے بچھائیں، صبح کو سویرے اُٹھ کر تہہ کر کے احتیاط سے رکھ دیں کپڑوں کی گٹھڑی اپنے انتظام میں رکھیں، اُدھڑا پھٹا خود سی لیا کریں، کپڑے خواہ میلے ہوں خواہ اُجلے ہوں ایسی جگہ رکھیں جہاں کپڑے کا چوہے کا اندیشہ نہ ہو، دھوبن کو خود گن کر دیں اور لکھ لیں اور گن کر پڑتال کر کے لیں،

(۳۲) لڑکیوں کو تاکید کرو کہ جو زیور تمہارے بدن پر ہے رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو جب اٹھو دیکھ بھال لیا کرو،

(۳۳) لڑکیوں سے کہو کہ جو کام کھانے پکانے، سینے پرونے، کپڑے رنگنے، چیز بننے کا گھر میں ہوا کرے اس میں غور کر کے دیکھا کرو کہ کیونکر ہو رہا ہے،

(۳۴) جب بچے سے کوئی بات خوبی کی ظاہر ہو اس پر خوب شاباش دو پیار کرو، بلکہ اس کو کچھ انعام دو تاکہ اس کا دل بڑھے، اور جب اس کی بری بات دیکھو اوّل تنہائی میں اس کو سمجھاؤ اور دیکھو بری بات ہے، دیکھنے والے دل میں کیا کہتے ہوں گے، اور جس جس کو خبر ہوگی وہ دل میں کیا کہے گا، خبردار پھر مت کرنا، نیک بخت لڑکے ایسا نہیں کیا کرتے، اور اگر پھر وہی کام کرے مناسب سزا دو،

(۳۵) ماں کو چاہئے کہ بچے کو باپ سے ڈراتی رہے،

(۳۶) بچے کو کوئی کام چھپا کر مت کرنے دو، کھیل ہو یا کھانا اور کوئی شغل ہو، جو کام چھپا کر کرے گا سمجھ جاؤ کہ وہ اس کو برا سمجھتا ہے، سو اگر وہ برا ہے تو اسے چھڑاؤ، اور اگر اچھا ہے جیسے کھانا پینا تو اس سے کہو سب کے سامنے کھائے پیئے،

(۳۷) کوئی کام محنت کا اس کے ذمہ مقرر کر دو جس سے صحت اور ہمت رہے، سستی نہ آنے پائے، مثلاً لڑکوں کے لئے ڈنڈ مگدر کرنا، ایک آدھ میل چلنا، اور لڑکیوں کے لئے چکی یا چرخہ چلانا ضرور ہے، اس میں یہ بھی فائدہ ہے کہ ان کاموں کو عیب نہ سمجھیں گی،

(۳۸) چلنے میں تاکید کردو کہ بہت جلدی نہ چلے، نگاہ اوپر اٹھا کر نہ چلے،

(۳۹) اس کو عاجزی اختیار کرنے کی عادت ڈالو، زبان سے، چال سے، برتاؤ سے، شیخی نہ بگھارنے پائے یہاں تک کہ اپنے ہم عمر بچوں میں بیٹھ کر اپنے کپڑے یا مکان یا خاندان یا کتاب و قلم دوات، تختی تک کی تعریف نہ کرنے پائے،

(۴۰) کبھی کبھی اس کو دو چار پیسے دیدیا کرو، کہ اپنی مرضی کے موافق خرچ کیا کرے، مگر اس کو یہ عادت ڈالو کہ کوئی چیز تم سے چھپا کر نہ خریدے،

(۴۱) اس کو کھانے کا طریقہ اور محفل میں اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھلاؤ، تھوڑا تھوڑا ہم لکھے دیتے ہیں،

کھانے کا طریقہ

(۱) داہنے ہاتھ سے کھاؤ (۲) شروع میں بسم اللہ کہو (۳) اپنے سامنے سے کھاؤ (۴) اوروں سے پہلے مت کھاؤ (۵) کھانے کو گھور کر مت دیکھو (۶) کھانے والوں کی طرف مت دیکھو، (۷) بہت جلدی جلدی مت کھاؤ (۸) خوب چبا کر کھاؤ (۹) جب تک لقمہ نگل نہ لو دوسرا لقمہ مُنہ میں مت رکھو، (۱۰) شوربا وغیرہ کپڑے پر نہ ٹپکنے پاتے (۱۱) انگلیاں ضرورت سے زیادہ سننے نہ پائیں،

محفل میں اٹھنے بیٹھنے کا طریقہ

(۱) جس سے ملو ادب سے ملو (۲) نرمی سے بولو (۳) محفل میں تھوکو نہیں، (۴) وہاں ناک صاف مت کرو، اگر ایسی ضرورت ہو وہاں سے الگ چلے جاؤ (۵) وہاں اگر جمائی یا چھینک آئے مُنہ پر ہاتھ رکھو، (۶) آواز پست کرو، (۷) کسی کی طرف پشت مت کرو، (۸) کسی کی طرف پاؤں مت کرو، (۹) ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر مت بیٹھو، (۱۰) انگلیاں مت چٹخاؤ (۱۱) بلا ضرورت بار بار کسی کی طرف مت دیکھو، (۱۲) ادب سے بیٹھے رہو، (۱۳) بہت مت بولو (۱۴) بات بات میں قسم مت کھاؤ (۱۵) جہاں تک ممکن ہو خود کلام مت کرو (۱۶) جب دوسرا شخص بات کرے خوب توجہ سے سنو، کہ اس کا دل نہ بجھے، البتہ اگر گناہ کی بات ہو مت سنو، یا تو منع کردو یا وہاں سے اُٹھ جاؤ (۱۷) جب تک کوئی شخص بات پوری نہ کرلے بیچ میں مت بولو (۱۸) جب کوئی آئے اور محفل میں جگہ نہ ہو ذرا اپنی جگہ سے کھسک جاؤ، مل کر بیٹھ جاؤ کہ جگہ ہو جائے (۱۹) جب کسی سے ملو یا رخصت ہونے لگو، السلام علیکم کہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہو، اور طرح طرح کے الفاظ مت کہو،

ختم ہوا مضمون بہشتی زیور کا،

امید ہے کہ اہل وعیال کی تعلیم وتربیت کے متعلق مضمون مذکور کافی ہوجائے گا، اسی طرح اور بھی جس جس پر قدرت ہو جیسے شاگرد و مرید، نوکر و رعیت وغیرہم سب کی تعلیم وتربیت میں یہی طریقہ مشترک ہے،

انتہت عبارت رسالہ بہشتی زیور

وبانتہارہا

تمت احکام النفقات الروحانیۃ

اصلاحِ انقلاب متعلق لقطہ کے

لقطہ کا مفہوم اور اسکی کوتاہیاں

(اوپر کے باب میں اپنے مال کے خرچ کرنے کے احکام تھے، اِس میں دوسرے کے مال کے بعض افراد کے احکام ہیں، کیونکہ لقطہ ایسی پڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جس کا مالک معلوم نہ ہو) اس میں بھی مختلف و متعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں،

جس چیز کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو اس کا اٹھانا واجب ہے،

چنانچہ ایک کوتاہی اس میں یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسی چیز کو بالکل اٹھاتے ہی نہیں، اور سمجھتے ہیں یہ نہ اٹھانا ہی افضل ہے، حالانکہ جہاں گمان غالب ہو کہ نہ اٹھانے سے وہ چیز ضائع ہوجائے گی وہاں اٹھالینا واجب ہے، اگر نہ اٹھائے گا گناہگار ہوگا (درمختار) اور یہی حکم ہے پڑے ہوئے بچے کا (درمختار)

اور اگر اٹھا کر پھر وہاں ہی رکھ دیا تو گناہ تو ہے ہی، مگر بعض کے نزدیک اس کے ذمے ضمان بھی لازم ہے، (ردالمحتار)

اپنے کام کی غرض سے کسی چیز کا اٹھانا گناہ ہے،

ایک کوتاہی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعضے لوگ اس نیت سے اٹھاتے ہیں کہ اس کو اپنے کام میں لائیں گے، تو اس نیت سے اٹھانا گناہ بھی ہے اور اس اٹھانے سے وہ ضامن بھی ہوجائے گا، جب تک مالک کے پاس نہ پہنچائے (ردالمحتار عن نورالعین عن الخانیہ)

اٹھائی ہوئی چیز کی تشہیر واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے اٹھاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ ہم مالک کو پہنچادیں گے، مگر مالک کو نہ پہنچاتے ہیں نہ تلاش کرتے ہیں، گھر میں لے کر بیٹھ جاتے ہیں، کہ کوئی ڈھونڈھتا ہوا آئے گا، ورنہ کون مشقت کرے، سو ایسا کرنا جائز نہیں، بلکہ اس کی تشہیر واجب ہے، یعنی جس جگہ وہ ملی ہے وہاں بھی اعلان کرے اور مواقع اجتماع پر بھی جیسے بازار میں اور مساجد کے دروازوں پر اور جہاں جہاں احتمال مالک کے ملنے کا ہو، اور مدت اس تشہیر کی یہ ہے کہ گمان غالب یہ ہوجائے کہ اب مالک نے اس کی تلاش چھوڑ دی ہوگی،

یا اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہونے لگے، جیسے پھل وغیرہ (درمختار)

چیز اٹھانے کے بعد دو اختیار | پھر اس کے بعد اس کو دو اختیار ہیں، ایک یہ کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھے، اور دوسرے یہ کہ اس کو خیرات کردے، پھر اگر خود مسکین ہے، تو اپنے نفس پر بھی خیرات کرسکتا ہے، اور مسکین نہیں ہے تو مساکین پر تصدق کردے، اور یہ بھی اختیار ہے خواہ بعینہٖ تصدق کردے، خواہ فروخت کرکے دام تصدق (صدقہ) کردے، اور اگر اس کو یا اس کے داموں کو محفوظ رکھا تو وصیت کرجانا واجب ہے (ردالمحتار)

مسئلہ: اگر کسی وجہ سے خود تشہیر نہ کرسکے تو دوسرے شخص کو بشرطیکہ امانتدار ہو تشہیر کے لئے دے سکتا ہے (ردالمحتار)

نہ معلوم اہلِ حقوق کے حقوق کی ادائیگی کا طریقہ | مسئلہ: جس کے ذمہ کچھ حقوق العباد ہوں اور اہلِ حقوق معلوم نہیں یا معلوم ہیں مگر مرگئے، اور اُن کے وارث بھی نہیں تو ایسے حقوق بمنزلہ لقطہ کے ہیں، کہ مالک کے نہ ملنے کے وقت خیرات کردینا چاہیئے، اور یہ خیرات ایسے حقوق کی اور اسی طرح لقطہ کی مالک کی نیت سے ہونا چاہیئے،

صدقہ کرنے کے بعد مالک آنے کا حکم | مسئلہ: اگر بعد تصدق کے مالک آگیا تو اس کو اختیار ہے، خواہ اس تصدق کو جائز رکھے اور خواہ اس سے ضمان لے، اور ثواب اس لاقط (اٹھانیوالے) کو ملے گا، (ردالمحتار)

بروز قیامت ظلم کا دعویٰ مورث اور حق کا دعویٰ وارث کرے گا | مسئلہ: اگر کسی کا قرض یا کوئی حق اس کے ذمہ آتا ہے اور اس نے نہ اسکو دیا اور نہ اُس کے ورثاء کو تو قیامت میں اس پر دعویٰ کون کرے گا؟ اس میں قول مختار یہ ہے کہ ظلم کا دعویٰ تو مورث کرے گا کہ اس کا حق نہ دیا تھا، اور حق کا دعویٰ وارث کرے گا، کیونکہ وہ مالِ میت سے اس وارث کی طرف منتقل ہوگیا، اور اگر وارث کو دیدیا تو وارث کا دعویٰ تو جاتا رہا مورث کا رہے گا، اس کے لئے دعاء، واستغفار کیا جائے (ردالمحتار)

مسافر کا ترکہ بحکم لقطہ کے ہے | مسئلہ: تمہارے گھر کوئی مسافر مرگیا اور اس کے ورثاء معلوم نہیں تو اس کا ترکہ بحکم لقطہ ہے (درمختار)

دفینہ کا حکم لقطہ کا ہوگا | مسئلہ: تم نے کوئی گھر خریدا اور اس میں کچھ دفینہ (دفن شدہ مال) نکلا تو وہ بحکم لقطہ ہے، (ردالمحتار)

اصلاحِ انقلاب
متعلّق گم شدہ انسان

(لقطہ مال تھا جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں، یہ انسان ہے جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں)، اس میں بھی کچھ غلطیاں کی جاتی ہیں؛

مفقود اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے | اور اس کے سمجھنے سے پہلے ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لینا چاہئے، اس سے ان غلطیوں کا سمجھنا آسان ہو جائے گا،

مفقود اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے | وہ قاعدہ یہ ہے کہ مفقود چونکہ وقت مفقود ہونے کے زندہ تھا، اور اب تک اس کی موت کی کوئی دلیل نہیں، تو اس کا ظاہر حال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے، اور ظاہر حال جس کو استصحاب بھی کہتے ہیں حجتِ دافعہ ہے حجتِ مثبتہ نہیں، پس یہ حیاتِ ظاہری اس کا حق تو دوسرے کے مال میں ثابت نہ کرے گی، لیکن اس کے مال میں دوسرے کا حق ثابت نہ ہونے دے گی، یعنی اگر اس کے زمانۂ فقدان (گمشدگی) میں اس کا کوئی مورث مثلاً اس کا باپ مرا اور اس کے دو بیٹے تھے ایک یہی مفقود، دوسرا موجود، تو اس کے ترکہ میں اس مفقود کا یقینی حق نہیں ہوگا، بلکہ احتمالِ حیات کے سبب اس کا حصہ بطورِ امانت کے رکھیں گے، اگر آ گیا تو لے لے گا، اور اگر نہ آیا یہاں تک کہ انتظار کی مدتِ شرعیہ کے بعد (جس کی مقدار آگے آتی ہے) اس کی موت کا حکم کیا گیا تو وہ امانت رکھا ہوا حصہ اسی موجود کا سمجھا جائے گا، اگر وہ زندہ ہوا تو وہ لے گا ورنہ اس کے شرعی ورثہ لیں گے یوں نہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس مفقود کا حق ہے، تاکہ اس کے مال کے ساتھ وہ بھی اس کے ورثہ کو دیا جائے، اور یہی مطلب ہے حجت مثبتہ نہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے حجت واقعہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے فقہاء کے اس قول کا کہ وہ اپنے نفس کے حق میں حیّ (زندہ) ہے۔

مفقود کے بارے میں چند کوتاہیوں کا بیان

اس قاعدہ کلیہ کے بعد اب ان غلطیوں کو سمجھنا چاہیے :-

مفقود کا حصہ وراثت رکھنا چاہیے، سو ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس کے مفقود ہونے کا زمانہ میں جو اس کا مورث مرتا ہے اس کے ترکہ میں سے اس مفقود کا حصہ کوئی شخص نہیں رکھتا، ورثاء حاضرین باہم تقسیم کر لیتے ہیں، حالانکہ گو اس کا استحقاق یقینی نہیں مگر محتمل تو ہے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ صحیح سالم آگیا، اگر اس کو اپنے استحقاق کا علم ہوا اور اس کے وصول کی قوت بھی ہوئی تب تو نزاع (جھگڑا) ہوگا اور اگر علم نہ ہوا یا قدرت نہ ہوئی تو دوسرے ورثہ حق العباد کے وبال میں مبتلا ہوں گے،

مفقود کے مال اور اس کے حصہ امانت کا حکم یکساں نہیں، اور ایک غلطی یہ ہو سکتی ہے (گو سنی نہیں گئی) کہ اگر اس کا حصہ امانت کے طور پر محفوظ رکھا جائے تو جس وقت اس کی موت کا حکم شرعاً کیا جائے گا اور خود اس کا ترکہ اس کے ورثہ موجودین وقت الحکم بالموت میں تقسیم کیا جائے گا، تو ممکن ہے کہ اس حصہ امانت کو بھی اس کی ملک سمجھ کر اس کو بھی اس کے ترکہ کے ساتھ تقسیم کر دیا جائے، حالانکہ اوپر کے قاعدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس صورت میں وہ حصہ امانت کا ان ورثہ کا حق ہے، جن کے حصہ میں سے یہ امانت نکال کر رکھی گئی تھی، خلاصہ یہ کہ اس امانت کا حکم اور خود جو اس مفقود کا مال بلاواسطہ ہے ان دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے،

مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا صحیح نہیں، ایک غلطی اس دوسرے مسئلہ سے (کہ اگر وہ نہ آیا تو وہ امانت اُن ورثہ کا حق ہے جن کا حق کم کرکے یہ امانت رکھی گئی ہے) یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو وقت فقدان (گم ہونے کے وقت) سے میت سمجھ کر جب اس کا ترکہ تقسیم کرنے لگیں تو انہی ورثہ کو دیدیں جو اس کے فقدان کے وقت تھے، حالانکہ وہ اپنے مال کے اعتبار سے زندہ ہے، حاصل یہ کہ بعض غلطی تو منشاء مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا ہے، اور بعض کا منشاء دوسرے کے مال کو مفقود کے مال پر قیاس کرنا ہے، یہ دونوں قیاس باطل ہیں، ان دونوں کا حکم جدا جدا ہے، جیسا کہ مفصل بیان کیا گیا،

مفقود کے متعلق امام مالکؒ کے فتویٰ پر عمل کے لئے قضاء قاضی شرط ہے، ایک غلطی عام یہ ہو رہی ہے کہ علماء سے یہ سُن لیا کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک انتظار مفقود کی مدت چار سال ہے اور یہ بھی سُن لیا کہ ضرورت میں دوسرے مذہب پر عمل درست ہے،

اس کو مطلق سمجھ کر بلا کسی قید کے اس پر عمل شروع کر دیا، چار سال کے بعد اس کی بی بی کا نکاح بھی کرانے لگے، عدت کی بھی ضرورت نہ سمجھی، اگر قدرت ہوئی اس کا ترکہ بھی تقسیم کر لیا، پھر ضرورت کو بھی نہیں دیکھا اور بعد تحقیقِ ضرورت کے اس پر عمل کی شرط بھی نہ دیکھی، حالانکہ امام مالکؒ کے نزدیک چار سال جوازِ نکاح کی مدت نہیں، بلکہ اس کے حکم بالموت کی مدت ہے، پھر اس کے بعد عدتِ وفات ہوگی؛

اور شافعیؒ کا مذہب قدیم اس کو قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قولِ جدید اس کے خلاف ہے، اور مفتی بہ قولِ جدید ہوتا ہے، پھر یہ قول ان دونوں حضرات کا صرف نکاح کے بارے میں ہے، میراث میں ان کا مذہب ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تفصیل ہے کہ اگر ایسی حالت میں غائب ہوا ہے کہ غالب حال اس کا ہلاک ہے، جیسے صفِ قتال یا کشتیٔ شکستہ میں تھا، تب تو چار سال کی مدت ہے ورنہ ان کا مذہب بھی ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

یہ سب اقوال شامیؒ نے نقل کئے ہیں (اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کا مذہب اس میں ایسا قوی ہے کہ دوسرے ائمہ بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کو ضرور لیتے ہیں)

اسی طرح جس عورت کے پاس نفقہ موجود ہو وہاں ضرورت بھی متحقق نہیں، یا کسی دیندار معتبر گھرانے میں نوکری کر سکے وہاں بھی ضرورت نہیں، اسی طرح جہاں مالکی یا شافعی حاکم مل سکے وہاں بھی حنفی کو اس قول پر حکم کرنے کی ضرورت نہیں، اور جہاں ضرورت بھی ہو تب بھی اس پر عمل کرنے کی اکثر علماء کے نزدیک ایک شرط یہی ہے، وہ یہ کہ اس عمل کے لئے صرف فتویٰ کافی نہیں، قضاءِ قاضی ہونا چاہیے، چنانچہ درمختار میں واقعاتِ مفتیین سے اس کی نسبت قنیہ کی طرف کی ہے، اور گو اس میں دوسرا قول بھی ہے جو شرف الائمہ کی طرف نسبت کیا گیا ہے مگر نجم الائمہ قاضی عبدالرحیم نے اشتراط کو ترجیح دی ہے، اور واقعات کی عبارت سے امام صاحبؒ کا اس میں نص ہونا ثابت کیا ہے،

مفقود کی مدت انتظارِ طویلہ کا اصل مقصد احتیاط ہے؛

اور احقر کہتا ہے کہ قواعد سے بھی ایسے امور مجتہد فیہا میں قضاءِ قاضی کے اشتراط سے اس اشتراط ہی کو ترجیح ہوتی ہے، اور احقر اس کے خلاف پر فتویٰ دینے کو صحیح نہیں سمجھتا، خصوص جبکہ اصل فروج (شرمگاہوں) میں حرمت ہے' اور یہ لزومِ قضاءِ قاضی کسی خاص قول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس باب میں حنفیہ کے نزدیک جو مدتِ انتظار ہے، جس میں سب سے زیادہ احتیاط ہے اس میں بھی قضاءِ قاضی شرط ہے یعنی

قاضی یوں کہے کہ میرے نزدیک اب وہ مرگیا ہے، اس لئے میں اس کی موت کا حکم کرتا ہوں (للاطلاق مافی الدر المختار انما یحکم لموتہ لقضاء لانہ امر محتمل مما لم ینضم الیہ القضاء لایکون حجۃ) اور وہ مدت احتیاط کی اس لئے ہے کہ بہت طویل ہے، اصل معنون تو اس کا یہ ہے، باقی اُس کے عنوانات میں اقوال مختلف ہیں،

(۱) موت اقران فی بلدہ (۲) موت اقران فی جمیع البلاد (۳) نوّے سال وقتِ ولادت سے نہ کہ وقتِ فقدان سے (۴) ننّوسال (۵) ایک سو بیس۱۲۰ سال (۶) ساٹھ سال (۷) ستّر سال، (۸) تفویض الی رائ الامام (امام کی رائے کے سپرد کردینا) اور شامی نے اس قول اخیر میں یہ شرط نقل کی ہے،

لابد من مضی مدۃ طویلۃ حتی یغلب علی الظن موتہ لابمجرد فقدہ عند ملاقاۃ العدو اوسفر البحر ونحوہ،	(اتنی طویل مدت کا گذرنا ضروری ہے کہ اس کی موت واقع ہونے پر گمان غالب ہوجائے دشمن سے ملاقات یا مطلق سفر وغیرہ کی صورت میں صرف گمشدگی کافی نہیں ۔)

ہندوستان میں سلطنت کی طرف سے کسی ایسے قاضی کے تقرر کا انتظام نہیں ہے اس لئے اس شرط کی تحقق یہاں دشوار ہے، پس اس صورت میں مفقود کے احکام میں بجز صبر کے کوئی علاج نہیں، البتہ اگر کوئی مسلمان حاکم جس کو سلطنت کی طرف سے ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں کسی عالم سے فتویٰ لے کر مفقود کی موت کا حکم کردے، وہ حکم صحیح ہوجائے گا، اس لئے کہ قاضی مسلم کا تقرر سلطنتِ غیر مسلم کی طرف سے بھی صحیح ہے، صرح بہ الفقہاء، یا ریاستوں میں جو قضات مسلمان مقرر ہیں ان سے حکم حاصل کرلیا جائے، مگر اس میں یہ شبہ ہے کہ اس قاضی کی حدود شرع سے باہر جو شخص ہو اس پر بھی اس کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں اس کی تحقیق علماء سے کرلی جائے،

احکامِ مفقود سے متعلق چند شبہات اور انکے جوابات

یہ تھیں ضروری تنبیہات احکام مفقود کے متعلق اب بعض ان شبہات کے جواب لکھتا ہوں جو اُن احکام کے متعلق بطور معارضہ پیش کئے جاتے ہیں،

زیادہ عمر مانع نکاح نہیں ایک شبہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اتنی مدّت انتظار کے بعد کہ نوّے برس میں یا اس سے زیادہ، جب موت کا حکم کیا گیا تو اس حکم سے کیا فائدہ ہوا؟ اتنی عمر کی عورت تو نکاح کے

قابل ہی نہیں رہتی،

جواب اس کا یہ ہے کہ معترض مسئلہ ہی نہیں سمجھا، اس مدت کی ابتداء مفقود ہونے کے حکم سے نہیں ہے تاکہ عورت کا اتنا سن رسیدہ ہونا لازم آئے، بلکہ اس کی ابتداء مفقود کے یوم ولادت سے ہے یعنی وہ نوّے برس کا ہو جائے، مثلاً، اور مرد کے سن رسیدہ ہونے سے عورت کا سن رسیدہ ہونا لازم نہیں آتا، مثلاً کسی اسّی برس کے بوڑھے نے دس برس کی لڑکی سے نکاح کیا اور مفقود ہو گیا، تو جب یہ نوّے سال کا ہوگا عورت بیس برس کی ہوگی، وعلیٰ ہذا، دوسرے حکم بالموت کا ثمرہ محض صرف نکاح زوجہ ہی تو نہیں ہے، اسکے مال کی تقسیم بھی تو ہے اور اسمیں یہ استعداد نہیں تیسرے یہ بھی مسلّم نہیں کہ ایسی عمر کی عورت نکاح کے قابل نہیں رہتی اگر تقاضائے نفسانی کی نفی بھی تسلیم کرلی جائے تب بھی نکاح میں اور مصالح بھی تو ہیں، مثلاً کوئی مسن (عمر رسیدہ) بیوہ عورت حج کو جاتی ہے اور محرم کوئی موجود نہیں، اس نے اس لئے کسی سے نکاح کر لیا کہ اس کے ساتھ سفر جائز ہو، اور مرد نے اعانت فی الدین (دین میں مدد) سمجھ کر قبول کر لیا، تو دیکھئے اتنی عمر مانع نکاح نہ ہوئی،

قانون مفقود کے سخت ہونے کا شبہ صحیح نہیں،	ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ قانون بڑا سخت ہے، اگر عورت کو نان نفقہ کی حاجت ہو یا اس پر نفس کا غلبہ ہو تو وہ کیا کرے ؟

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ اشکال اسی صورت کے ساتھ خاص نہیں، اگر کسی عورت کا شوہر موجود ہو، مگر بے توجہ ہو کر نہ نان نفقہ دیتا ہے نہ اس کا حق تحصین (بیوی ہونے کا حق) ادا کرتا ہو تو اس صورت میں عورت کیا کرے ؟ اگر کہا جائے کہ دعوٰے کر دے، ہم بھی یہی کہیں گے کہ یہاں بھی دعویٰ کر دے، اگر حاکم کی رائے میں ضرورت متحقق ہوگی وہ شافعیؒ و مالکؒ کے مذہب پر حکم بالموت جلدی کر دے گا، اگر کہا جائے کہ ایسا حاکم کہاں ہے، ہم کہیں گے اگر ہماری مفروضہ صورت بھی ایسا حاکم نہ ملے، یا ملے مگر یہ حکم نہ کرے تو عورت کیا کرے گی، اگر کہا جائے کہ صبر کرے، ہم کہیں گے یہاں بھی صبر کرے، یا اگر بے توجہ نہ ہو مگر نادار اپاہج ہو کر نہ بالفعل کسی مال کا مالک ہو نہ کسب پر قادر ہو، اور نہ عورت پر قادر ہو، تو اس کی عورت کیا کرے ؟ اگر کہا جائے کہ عنّین اور اس کی زوجہ میں قاضی تفریق کر دے گا، .... تو ہم کہیں گے کہ اگر ایک بار قادر ہو چکا ہو اور اس وجہ سے اب تفریق ممکن نہ ہو (چنانچہ مسئلۂ فقہیہ باب عنّین میں یہی ہے) تو عورت کیا کرے ؟ اسی طرح اگر زنِ مفقود کی نوکری کر کے کھانے میں شبہ فتنہ کے سبب کسی کو اعتراض ہو تو صورت مفروضہ میں بھی ایسا احتمال ہو سکتا ہے، غرض کچھ بلا اسی میں منحصر نہیں، دوسری صورتوں میں بھی ایسا ہو سکتا ہے

اور بکثرت ہوتا بھی ہے، پس بجز صبر و تحمل مشاق کے کوئی چارہ نہیں،

مفقود کے بارے میں ایک ضروری مسئلہ

اب ایک ضروری فرع لکھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اگر بعد حکم بالموت کے اس کی بی بی نے نکاح کر لیا اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ پھر صحیح سالم آگیا تو اس کا کیا حکم ہے؛ سو وہ حکم یہ ہے کہ اس کی بی بی کا نکاح ثانی فاسد ہو جائے گا اور عدت گزرنے کے بعد وہ بی بی اسی کو مل جائے گی، البتہ اگر کچھ اولاد ہو گئی ہو تو وہ دوسرے شوہر کو ملے گی، کذا فی رد المحتار وعبارتہ:۔

آن زوجۃ لہ والاولاد للثانی

(''بیشک بیوی اس کی ہوگی اور اولاد دوسرے کی ہوگی'')

اور مال میں یہ تفصیل ہے کہ جو وارثوں کے ہاتھ میں خرچ ہو چکا وہ گیا گذرا، اور جو خرچ نہیں ہوا وہ اس مفقود کو دلایا جائے گا، کذا فی رد المحتار وعبارتہ؛

فی الباقی فی ید ورثتہ لہ ولا یطالب بما ذھب،

(''یعنی جو اس کے ورثہ کے ہاتھ میں باقی موجود ہے اس کو مل جائے گا اور جو ختم ہو چکا اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا'')

مرنے کے بعد بفرضِ محال زندہ ہونیوالے کا حکم

اور یہی حکم ہے مال میں اس شخص کا جو مرنے کے بعد زندہ ہو جائے البتہ اس کی بی بی اب اس کو نہ ملے گی، کیونکہ موت سے خود اسی کا نکاح یقیناً باطل ہو گیا تھا، اور مفقود کا یقیناً باطل نہ ہوا تھا، ظناً باطل ہوا تھا، وہ ظن کاذب (گمان جھوٹا) ثابت ہوا، فقط ؛

اصلاح انقلاب
متعلق بہ تعزیر و تعییر و تکفیر

تعزیر و تعییر اور تکفیر کا مفہوم تفسیر ان الفاظ کی یہ ہے :۔

تعزیر: وہ سزا ہے جو تادیب کے لئے دی جائے، اور حد کے درجہ سے کم ہو، اور اس کے طرق (طریقے) مختلف ہیں، ملامت کرنا، ڈانٹنا، مارنا، ہاتھ یا لکڑی وغیرہ سے، کان کھینچنا، سخت الفاظ کہنا، محبوس کر دینا، (رد المحتار) مالی سزا دینا، جس کا طریقہ بعد میں آتا ہے۔

تعییر: کسی کا عیب نکالنا، اس میں غیبت و بہتان بھی داخل ہو گیا،

تکفیر: کسی کو کافر کہنا.

اوپر کے قریب ابواب میں غیر کے مال میں تصرف کرنے کی بحث تھی، ان تینوں امور میں غیر کی آبرو میں تصرف کرنے کا بیان ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ ان تینوں امر سے دوسرے کی آبروریزی ہوتی ہے، گو بعض میں تصرف فی النفس و تصرف فی المال ہے، اور چونکہ آبروریزی ان تینوں میں امرِ مشترک ہے، اور اس مابہ الاشتراک کی وحدت سے یہ تینوں امر گویا امرِ واحد ہیں، اس لئے ان تینوں کے متعلق مضامین مخلوط طور پر بیان ہوں گے، جیسے تینوں کے عنوان کو جمع کر دیا گیا، (یعنی ترتیب کا قصد نہ ہوگا)

حقوق العباد کی ایک کوتاہی کی عِلمی غلطی پس ان کے متعلق ایک کوتاہی جو بوجہ علمی غلطی ہونے کے سب سے اشد ہے کہ ان میں حق العباد ہونے کا احتمال ہی کسی کو نہیں ہوتا، اِلّا ماشاءاللہ، اور اس وجہ سے اُن کو بالکل خفیف و سرسری سمجھا جاتا ہے، سو یہ بڑی سخت غلطی ہے اور سخت ہونا اس کا اس لئے ہے کہ یہ اعتقادی غلطی ہے، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے :۔

اَلَا اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ عَلَیْکُمْ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا،	"خبردار! تمھارا خون، مال اور تمھاری عزتیں ناحق طریقہ سے، تم پر اسی طرح حرام ہیں، جس طرح تمھارے آج کے دن کی تمھارے اس خطہ اور اس شہر کی حرمت ہے"،

حقوق العباد کی تین قسمیں، جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) کسی کی جان یا بدن کو ضرر پہنچانا، (۲) کسی کے مال کو ضرر پہنچانا، (۳) کسی کی آبرو کو ضرر پہنچانا یعنی بدون کسی استحقاق کے، اس وقت اکثروں نے حق العبد کو صرف قسم دوم ہی میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور اگر کسی کی نظر بڑھتی ہے تو قسم اوّل کو بھی اس میں داخل کر لیتے ہیں، باقی قسم ثالث تک تو اکثر خواص کا ذہن بھی نہیں جاتا،

تعزیر سے متعلق اساتذہ کی ایک عظیم کوتاہی ایک کوتاہی تعزیر کے متعلق یہ ہے کہ جفا کاروں کے نزدیک اس کی کوئی حد ہی نہیں، جب تک اپنے غصہ کو سکون نہ ہو جائے، سزا دیتے ہی چلے جاتے ہیں، اور اس میں اہلِ حکومت عموماً مبتلا ہیں، الّا ما شاء اللہ خواہ دنیا کی حکومت ہو جیسے اہلِ عدالت و اہلِ پولیس، یا شوہر یا باپ یا خواہ دینی حکومت ہو، جیسے استاد کہ یہ ہزار گونہ ان سب سے اس باب میں بڑھے ہوئے ہیں، عدالت اور پولیس کو تو یہ بھی فکر ہے کہ کبھی مظلوم حکامِ بالا سے استغاثہ (فریاد) نہ کر بیٹھے، شوہر کو محبت ہوتی ہے، باپ کو شفقت بھی ہوتی ہے، یہ اسباب ظلم کے مقلّل (کم کرنے والے) ہو جاتے ہیں، اور ان حضرات کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ محبت و شفقت، اگر کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا تو والدین سے ہوتا، مگر والدین خواہ حُسنِ اعتقاد سے خواہ اپنی مطلب برآری کی خوشامد میں کان تک نہیں ہلاتے، اور بعضے اپنے اعتقاد میں شاگرد کے گوشت پوست کا استاد کو مالک سمجھتے ہیں، تو اُن سے کب احتمال ہے کہ ان حضرت کو ظلم سے روکیں گے، اس لئے یہ سب سے بڑھ کر آزاد ہیں، بہرحال باوجود کچھ کچھ تفاوت کے اتنا امر سب میں مشترک ہیں کہ ان کے بیانِ تعزیر (سزا دینے) کی کوئی حد نہیں، حالانکہ ضربِ فاحش (سخت مارنے) سے فقہاء نے مصرحًا منع فرمایا ہے، اور جس ضرب سے جلد پر نشان پڑ جائے اس کو بھی ضربِ فاحش میں داخل کیا ہے، اور جس سے ہڈی ٹوٹ جائے یا کھال پھٹ جائے وہ تو بدرجۂ اَولیٰ (ردالمختار عن التاتارخانیہ، ص ۲۹۳ ج ۳) بلکہ ضربِ فاحش سے خود استاد کو تعزیر دی جائے گی (در مختار)

تعزیر بدون ثبوتِ شرعی کے نہیں دی جا سکتی

اسی طرح یہ سخت کوتاہی ہے کہ ایسی سزاؤں کے لئے ثبوتِ شرعی کی ضرورت نہیں سمجھتے، بے سند خبروں پر بلکہ بعض دفعہ محض قرائن پر سزا دینے کو مباح سمجھتے ہیں، قرآن مجید میں نص ہے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (الشوریٰ، آیت ۴۱)	(الزام صرف اُن لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی اور تکبر کرتے ہیں۔)

اور حق یا بدون دلیلِ شرعی کے کسی کو ایذاء دینا ناحق کا ظلم ہے، جس پر یہ وعید ہے، اسلم طریق ایسے لوگوں کا جن کو سزائیں دینا پڑتی ہیں یہ ہے کہ جو صورتیں اکثر پیش آتی ہیں اُن کو علماء محققین کے روبرو پیش کر کے اُن کے احکامِ شرعیہ دریافت کرلیں کہ کونسا طریق ثبوت کا معتبر ہے، اور کونسا غیر معتبر، اور کس صورت میں کتنی سزا جائز ہے؟ کتنی سزا ناجائز ہے؟ اور اس مقام پر کسی کتاب بینی کرنے والے کو دھوکا نہ ہو کہ فقہاء نے مشتبہ آدمی کو تعزیر دینا جائز لکھا ہے، اگرچہ ثبوت باقاعدہ نہ ہو، کما فی الدر المختار:۔

لِلْقَاضِی تعزیر المتھم وان لم یثبت علیہ،	(تہمت والے پر تعزیر لگوانے کے لئے قاضی کو اختیار ہے اگرچہ وہ تہمت اس پر ثابت نہ ہو۔)

بات یہ ہے کہ یہ حکم صحیح ہے، مگر خود مشتبہ ہونا بھی محتاجِ ثبوت ہے، یہ نہیں کہ سزا دینے والا جس کو چاہے مشتبہ سمجھ لیا کرے، چنانچہ قول مذکور وان لم یثبت کے تحت میں ردالمختار کا قول ہے:

ای ما اتھم بہ اما نفس التھمۃ او کون من اھلہا فلابد من ثبوتہا کما علمت،	(یعنی مطلقاً تہمت لگائی یا وہ اس کا اہل ہو تو اس کے لئے ثبوت ضروری ہے، جیسا کہ تجھے معلوم ہو چکا۔)

شہادتِ شرعی کے ثبوت کا طریق

اور طریقہ اس کے ثبوت کا یہ ہے کہ دو مستور الحال یا ایک عادل کسی جنایت (شرارت) کی شہادت دے، یا اس نے اس قدر جنایتیں کی ہوں کہ اس کا مفسد ہونا مشہور ہو گیا ہو تو ایسے شخص کو حاکم محبوس کر سکتا ہے، پس یہ حقیقت ہے تعزیر متہم کی، اور فاسق کی شہادت سے اسی طرح ایک مستور کی شہادت سے مشتبہ بھی نہیں ہوتا، یہ سب ردالمحتار میں ہے تحت قول مذکور للقاضی تعزیر المتہم، اور پھر یہ بھی مطلقاً نہیں، بلکہ بعض حقوق اللہ میں۔ (درمختار)

مالی جرمانہ ہمارے مذہب میں درست نہیں

ایک کوتاہی اور یہ بعض برادریوں میں بھی شائع ہے یہ ہے کہ خطاؤں پر جرمانہ کرتے ہیں، پھر بعضے تو کسی کسی موقع پر کھانا پکاکر تمام برادری جمع ہو کر کھا پی لیتے ہیں، اور بعضے اپنے زعم میں اس کو ثواب کے کاموں میں صرف کرتے ہیں، جیسے مدرسہ یا مسجد یا انجمن، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تعزیر بالمال (مالی جرمانہ) ہے جو کہ ہمارے مذہب میں درست نہیں، اور بعض روایات میں جو وارد ہے وہ منسوخ ہے، اور بعض جو اس کے قائل ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ چندروز تک اس مال کو اپنے پاس رکھے، جب وہ شخص توبہ کرلے وہ مال اس کو لوٹا دیا جائے، نہ خود رکھے نہ بیت المال میں داخل کرے، (کذا فی الدر المختار و رد المحتار، ص ۵۲۷ ج ۳)

اور مجوزین (جائز کہنے والوں میں) کے نزدیک بھی جو اس کے شرائط ہیں، ان فاعلین (کرنے والوں) کو نہ ان کی خبر نہ اُن کی رعایت، تو اختلافی جواز بھی متحقق نہیں، اور جب یہ جائز نہیں تو وہ رقم حلال نہ ہوگی، تو اس کا کھانا بھی ناجائز اور نیک کاموں میں صرف کرنا اور بھی زیادہ ناجائز حدیث میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ	(اللہ تعالیٰ پاک ہیں سوائے پاک چیز کے کسی کو قبول نہیں کرتے")

اور ابھی ردالمحتار سے بیت المال میں داخل کرنے کا عدم جواز مذکور ہو چکا ہے،

اور یہی حکم ہے ان رقوم کا جو دباؤ ڈال کر یا شرما کر چندہ کے نام سے جمع کی جاتی ہیں یا شادیوں میں وہ دولہا والوں سے اپنے کمینوں کے یا مسجد وغیرہ کے لئے لیتے ہیں، کیونکہ بلا طیب خاطر دینا ان سب میں امرِ مشترک ہے، اور اس سے اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا جو بعض جگہ کمیٹی یا جماعت معاہدہ سے اس پر متفق ہو جاتی ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس پر اس قدر جرمانہ، سو یہ بھی جائز نہیں، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہاں تو طیب خاطر سے معاہدہ ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ معاہدہ کے وقت طیب خاطر ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ رقم کے مطالبہ کے وقت بھی طیبِ خاطر ہو اور جہاں معاہدہ بھی نہ ہو بلکہ دو چار ذی اثر شخصیتوں نے متفق ہو کر اس جرمانہ کو اپنے تابعین پر عام کر دیا، یہ تو بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا،

صاحبِ معصیت اپنے نفس پر خود جرمانہ کرے تو گناہ نہیں

اور بعض احادیث میں جو بعض معاصی کا کفارہ تصدق بدینار یا نصف دینار یا مطلق تصدق وارد ہوا ہے، اور بعض مشائخ انہی احادیث سے اس طریقہ پر مریدین کی تربیت بھی فرماتے ہیں تو ان احادیث یا اس طریق تربیت کا محمل یہ ہے کہ

کہ صاحبِ معصیت خود اپنے نفس کا علاج کرے نہ کہ کوئی دوسرا اس سے جبراً وصول کرے، یہ امرِ اول کے متعلق ضروری بیان تھا،

ہر سُنی سنائی بات پر اعتماد صحیح نہیں،

اور امرِ ثانی کے متعلق ایک کوتاہی جو بہت ہی عام ہے، حتیٰ کہ علماء و مشائخ و ثقات تک بھی باستثناء من شاء اللہ اس سے محفوظ نہیں، یہ ہے کہ جس کی نسبت جو کچھ بھی سُنا یا اکثر اوقات سُنے ہوئے بھی نہیں ہوتے محض قرائن پر (پھر قرائن بھی کیسے جو ضعیف الدلالت بھی نہیں محض غیر دال) اعتماد کر کے زبان سے ہانک دیا' خود ہی تفسیر و حدیث میں اس کے متعلق احکام پڑھائیں، وعظ میں دوسروں کو سُنائیں، مگر جب عمل کا موقع ہوا ایسے بھول جائیں گویا اس کے متعلق کبھی حکمِ شرعی کان میں پڑا ہی نہیں، پس بلفظِ دیگر گویا قرآن و حدیث صرف درس و وعظ کے لئے ہے عمل کے لئے ہے ہی نہیں' یا اگر عمل کے لئے بھی ہے تو صرف عوام کے لئے اور خواص اس سے بری ہیں، یہ تو بعینہٖ علماءِ یہود کا طرز ہے اللّٰھم احفظنا،

بہرحال کوئی خاص ہو یا عامی، احکام تو سب ہی کے لئے عام ہیں، اور حدیث :-

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ،	(آدمی کے جھوٹ کے لئے کافی ہے کہ وہی بات (بلاتحقیق) کہدے جو اُسنے (کسی سے) سُنی ہو)

اور حدیث :-

اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ	(بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی زیادہ جھوٹی بات ہے)

ان ابواب میں نصوصِ صریحہ صحیحہ ہیں، نیز ان احادیث کا مدلول شب و روز مشاہدہ میں بھی آتا ہے، کہ سُنی ہوئی حکایات اور اس سے بڑھ کر قرائن پر بنا کی ہوئی روایات اس کثرت سے غلط نکلتی ہیں کہ گویا قریب قریب سب ہی غلط ہوتی ہیں، اور اگر اتفاقاً شاذ و نادر کوئی صحیح بھی ہوتی ہے تو اس میں جھوٹ کی آمیزش (ملاوٹ) اس نسبت سے ہوتی ہے جو پَر اور کوّے میں نسبت ہے، یعنی پَر کے برابر سچ ہوتا ہے اور کوّے کے برابر جھوٹ،

پھر اس بے بنیاد اور لغو اور مہمل حکایت پر کسی سے عداوت، کسی پر بدگمانی، کسی کی نسبت بدزبانی بے تکلف جائز رکھی جاتی ہے، اور عجب بات ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی نسبت کوئی نہ کوئی شخص ایسی ہی بیہودہ بنیاد پر کچھ نہ کچھ کہتا نہ ہو اور خود اس شخص کو اس مقولہ کا باطل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اس مقولہ سے ناگواری بھی محسوس کرتا ہے، اور اس وقت خود بھی اسی قاعدہ شرعیہ سے تمسک کرتا ہے، اور اس قائل کو اس قاعدہ کی مخالفت پر جاہل سمجھتا ہے، مگر خود کسی کی

نسبت کچھ کہنے بیٹھتا ہے اُس وقت یہ سب اصولِ صحیحہ کالعدم ہوجاتے ہیں، تو گویا معنی اس کے یہ ہوئے کہ اور لوگ تو ہمارے معاملہ میں ان اصول کے مقید رہیں، مگر ہم دوسروں کے معاملہ میں ان اصول سے آزاد رہیں، سبحان اللہ! کیا انصاف ہے، موٹی سی بات ہے کہ یہ اصول قابلِ تمسک ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو تم بھی اس پر عمل کرو اور اگر نہیں تو دوسروں سے بھی عمل کے منتظر و متوقع نہ رہو، یہ زبردستی کا فرق کیسا کہ تم دوسروں کے لئے تو عمل نہ کرو اور دوسرے تمہارے لئے عمل کریں، اس فرق کا منشاء اگر جہل و تعسف و کبر نہیں تو اور کیا ہیں؟ اگر یہ ہے تو کیا ان اخلاق کی اصلاح واجب نہیں، اور بالخصوص کسی مرد و عورت کی عفت و پاک دامنی کے متعلق معاملات میں تو بے احتیاطی حد سے گذری ہوئی ہے، جس کی نسبت نصوص سے سب سے زیادہ احتیاط کی ضرورت معلوم ہوتی ہے،

کسی بچّہ کو ولدالزنا کہنے کا حکمِ احتیاط

حتیٰ کہ فقہاء نے انہی نصوص کی بناء پر تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک مشرقی کا نکاح ایک مغربیہ سے توکیلاً (وکیل کے ذریعہ) نکاح ہوا اور کسی نے دونوں کو مجتمع نہیں دیکھا، اور پھر اولاد ہوئی تو باوجود اس کے بھی اس عورت کو زانیہ کہنا یا اس بچہ کو ولدالزنا کہنا جائز نہیں، بلکہ اس بچے کو اسی مشرقی مرد کا کہیں گے،

(بہشتی زیور میں یہی مسئلہ تو لکھ دیا تھا جس پر مہربانوں نے بیحد شور و غل مچایا، اور اس کے قبل تمام کتبِ فقہ میں (جن میں بہت کا اردو میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے) موجود ہے، مگر کسی کو اس طرف التفات نہیں ہوا، بس بہشتی زیور میں اس کا آجانا غضب ہوگیا، رسالہ رفع الارتیاب[1] اور رسالہ حکایات الشکایات، شکایت اوّل کے ذیل میں ان سب شبہات کا جواب نقلی و عقلی موجود ہے)۔

واقعی بات یہ ہے کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باب میں وحیِ قطعی نازل نہ ہوئی ہوتی تو لوگوں کی اس بے احتیاطی پر نظر کرتے ہوئے قوی شبہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بہت سے مسلمان بھی ان پر بدگمانی کئے ہوئے نہ رہتے، مگر ہم لوگوں کی قسمت اچھی تھی جو اس باب میں وحی نازل فرمائی گئی مگر عجیب بات ہے کہ باوجود اس حکم کے عام ہونے کے دوسرے موقع پر جہاں جزئیاً وحی ..... نہ ہو اس حکم پر عمل نہیں ہوتا، حالانکہ اس حکم کے ضمن میں جو اصول بیان فرمائے گئے ہیں وہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، گو یہ فرق ضرور ہے کہ محلِ نص کی برأت و نزاہت قطعی ہے، کیونکہ

---

[1] یہ دونوں رسائل حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے تالیف فرمودہ ہیں، جو آجکل نایاب ہیں، کاش کسی ناشر کو ان کی اشاعت کی توفیق ہوجائے، آمین، (احقر قریشی غفرلہٗ)

وہ صرف ان اصول ہی پر مبنی نہیں، اگر وہ اصول نہ بھی ہوتے تب بھی برأت کا اعتقاد قطعاً فرض تھا اور خلاف کا احتمال بھی واقع نہیں تھا،

کسی پر زنا کا حکم لگانے کے لئے کشف، الہام، خواب کا اعتبار حجت نہیں،

اور غیر محل نص کی برأت ظنی ہے، کیونکہ وہ ان اصول پر مبنی ہے جن کا حاصل دلیل شرعی نہ ہو اس کے ساتھ تکلّم اور اس میں سوءِ ظن جائز نہیں ۔ گو واقع میں اس کے خلاف کا احتمال ہو، کما قال تعالیٰ :-

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ ○

(النور، آیت ۱۵)

(یعنی جب کہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے، اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات تھی ")

مگر اس فرق میں اس بے احتیاطی کی اجازت کہاں ہوئی، کفِ لسان وحُسنِ ظن تو دونوں میں امرِ مشترک ہے،

اور میں نے جو ان اصولِ واردہ فی تبریۃ الصدّیقہ کا حاصل بیان کیا ہے اس میں ایک طالبعلمانہ شبہ کا بھی جواب ہو گیا،

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِنْدَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○

(النور، آیت ۱۳)

(یعنی یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے جس حالت میں یہ لوگ گواہ نہیں لائے، تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں ")

یعنی اس دعوے پر جب چار گواہ نہ لاسکے تو وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا علم خلاف واقع ہونا محال (ناممکن) ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا وہی ہو گا جو واقع میں جھوٹا ہو، تو اس مقدمہ کے بعد معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر کوئی کسی کو زانی کہے اور اس پر چار گواہ قائم نہ کر سکے تو وہ شخص واقع میں جھوٹا ہے، اور جب کسی کو زانی کہنے والا واقع میں جھوٹا ہوا تو یہ شخص جس کو زانی کہا گیا ہے واقع میں زانی نہیں تو لازم یہ آیا کہ جہاں چار گواہ نہ ہوں وہاں واقع میں کوئی زانی نہیں ہوتا، اور یہ مشاہدہ سے باطل ہے، کیونکہ ہزاروں آدمی واقع میں زانی ہوئے ہیں، اور ان کے زنا پر ایک بھی گواہ نہیں ہوا چہ جائیکہ چار، تو پھر آیت کا مضمون کیسے صحیح ہوا؟ یہ ہے اشکال

مگر میں نے جو حاصل بیان کیا ہے اس سے یہ اشکال جاتا رہا،

تقریر اس کی یہ ہے کہ عند اللہ کے معنی فی علم اللہ و فی الواقع نہیں بلکہ فی حکم اللہ و قانونہٖ ہیں یعنی گو گواہ نہ لانے کی صورت میں واقع میں اس مدعیٰ علیہ کے زانی ہونے کا احتمال ہو، مگر قانونِ الٰہی میں اس مدعی کو کاذب کہا جائے گا، یعنی اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جو کاذب کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی اس کو اس تہمت لگانے کی سزا دی جائے گی، اور اس کے دعوے کی بناء پر کسی کو اس مدعیٰ علیہ پر بدگمانی یا اس کے ساتھ بدزبانی جائز نہ ہوگی،

اسی طرح ایسی ہی ضعیف یا باطل بناؤں پر کسی کو چور سمجھنا اور کسی طرح کا شبہ کرنا جائز نہیں، اور سب کا قاعدۂ مشترکہ یہی ہے کہ جس امر کے اثبات کا شرع میں جو طریق ہے جب تک اُس طریق سے وہ امر ثابت نہ ہو اس کا کسی کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، اور اپنے محل میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان طرقِ اثبات میں شریعت نے الہام یا خواب یا کشف کو معتبر و حجت قرار نہیں دیا، تو ان کی بناء پر کسی کو چور یا مجرم سمجھنا حرام اور سخت معصیت ہے،

مسمریزم، حاضرات، لوٹا گھمانا، وغیرہ سب جہل اور خرافات ہیں،

اور جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں جو کہ بعض امور غیر ملزمہ میں کسی درجہ میں معتبر بھی ہیں بشرطِ عدم تخالفِ شرع تو جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی درجہ بھی نہیں رکھتے اُن پر حکم لگانا تو کس درجہ سخت گناہ ہوگا، جیسے حاضرات کرنا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھمانا یا آجکل جو عمل مسمریزم کا شائع ہوا ہے یہ تو بالکل جہل اور خرافات ہی ہیں، جن میں اکثر جگہ تو عامل کا دھوکہ ہی ہے، اور بعض جگہ عامل دھوکہ باز تو نہیں ہوتا، مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں،

سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب تصرفات قوتِ خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر و خیال کو صرف کر کے کوئی رائے قائم کر لے بس اس سے زیادہ ان اعمال کی حقیقت نہیں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیاتِ قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت محض حیلہ ہے، قوتِ خیالیہ کے یکسو کرنے کا، ورنہ اصل فعل قوتِ خیالیہ کا ہے، گو آیات بھی پڑھی جائیں، جب بھی وہ تصرفات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرف کر دیا جائے تو ہرگز یہ تصرفات ظاہر نہ ہوں،

قرآن مجید، دیوان حافظ، مثنوی سے فال نکالنے کا حکم،

اور یہی حکم ہے قرآن مجید کا، دیوانِ حافظ یا مثنوی سے فال لے کر کسی پر حکم لگا دینے کا، جیسے ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کی

بیگم کا بڑا قیمتی ہار گم ہوگیا تھا، اس نے کنیزک سے بوقتِ شب چراغ منگا کر اس کی روشنی میں دیوانِ حافظ سے فال لی تو یہ مصرعہ نکلا، ع

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

(”چور کتنا دلیر ہے کہ اپنی ہتھیلی پر چراغ رکھتا ہے“)

بس اس نے اس کنیز کو پکڑ لیا اور تلاشی لینے سے وہ ہار اس کے پاس نکلا، اگر ایسی حکایات ثابت بھی ہوں تو اتفاقی بات ہے، نہ اس عمل اور اس واقعہ میں کوئی وجہِ تعلق، نہ کسی دلیل سے اس کی دلالت اس پر ثابت، تو حجتِ معتبرہ کیسے ہوگا؟

سحر یا جنّ یا نجومی یا پنڈت کے واسطہ سے کسی چیز یقین کرلینا قریب کفر ہے

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی سحر یا کسی جنّ کے واسطے یا کسی نجومی یا پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کرلینا خصوصاً جبکہ اس خبر سے کسی بری کو متہم کردیا جائے ایسا شدید حرام ہے کہ قریب کفر کے ہے، اور اس سے دھوکا نہ ہو کہ فلاں دفعہ اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کرے، یونہی بکنا شروع کردے، کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو نٹو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے، تو معتقدین اس ایک کا تو ذکر کرتے ہیں اور نٹو بار کا ذکر نہیں کرتے، اور اگر کوئی یاد دلاتا ہے تو اتفاقی ہونے سے جواب دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس طرح جھوٹ ہونے کو اتفاقی کہہ دیتے ہیں سچ ہونے کو اتفاقی کیوں نہیں کہتے، یہ سب تسویلات شیطانیہ (شیطانی حیلہ بازیاں) ہیں،

مسلمان کے لئے شریعت ہی علم وعمل کا مدار ہے،

اور اگر تجربہ ومشاہدہ میں نزاع قطعی نہیں کرتے ہو تو ان کو جانے دو آخر شریعت مسلمان کے لئے اصل مدارِ علم وعمل کا ہے یا نہیں؟ جب ہے تو دیکھ لو، جب شریعت نے ان کی دلالت کو حجت نہیں کہا تم کیسے کہتے ہو؟ اس کی ایسی مثال ہے سمجھ لو کہ جنتری سے اگر ۲۹ر کا چاند ثابت ہو خواہ وہ اپنے قاعدہ میں صحیح ہی ہو مگر شریعت نے اسکو حجت قرار نہیں دیا، کوئی بیٹا اپنے باپ کے نافع معاملہ میں گواہی دے گو وہ بیٹا کتنا ہی بڑا متقی اور سچا ہو، مگر اس گواہی میں اس کے قول کو حجت قرار نہیں دیا گیا، گو اسی اجلاس پر اگر دوسرے شخص کے معاملہ میں وہ شہادت دے فوراً قبول کرلی جائے گی،

تار کے ذریعہ گواہی قبول نہیں،

یا اہلِ سلطنت نے باوجودیکہ تار کو بعض امور میں حجت ٹھہرایا ہے، لیکن اگر کوئی شخص عدالت میں اپنی شہادت تار کے ذریعہ بھیج دے گو پورا یقین ہو کہ اسی شخص کا تار ہے

مگر قبول نہ کیا جائے گا،

قانونِ شریعت کی حکمتوں کا اظہار ضروری نہیں

آخر شریعت ایک قانون ہے، کیا اس کو حق نہیں کہ جن دفعات کو اپنے محکومین کے لئے قرینِ حکمت سمجھے تجویز کر دے، باقی یہ اس کے ذمہ نہیں کہ ان حکمتوں کا سبق بھی سب کے سامنے دُہرایا کرے، گو بعض خاص عباد کو بعض حکمتوں کی اطلاع بھی ہو جاتی ہے، مگر ان کے ذمہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا اظہار کیا کریں، کیونکہ اصل مقصود کہ عمل ہے ان حکمتوں کے ظہور پر موقوف نہیں، اور ایسوں ہی پر ان کا انکشاف بھی ہوتا ہے، جو اپنے عمل میں اطلاعِ حکمت کا انتظار نہیں کرتے، اور یہ مشرب رکھتے ہیں ؎

زبان تازہ کردن باقرارِ تو   نینگیختن علت از کارِ تو

کفر کا فتویٰ دینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے،

امر ثانی کے متعلق بھی ضروری بیان ہو چکا، اب امر ثالث کے متعلق عرض ہے کہ اس میں بھی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ذرا تدبیر سے کام نہیں لیتے، قائل کے قول کا کوئی محمل صحیح نہیں سوچتے، بس مفتی صاحب کو جو بات ناگوار ہوئی فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیا، بلکہ بعض اوقات محمل صحیح سمجھ میں بھی آجاتا ہے پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کر کے اپنا غیظ نکالتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ بیچارہ قائل وجہِ کفر کا خود انکار کر رہا ہے، اور محمل صحیح کی تصریح کر رہا ہے، مگر جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی، تکفیر ہی کی سزا اس کے لئے بحال رہتی ہے، حالانکہ حدیث میں تصریح ہے، لا تکفرہ بذنب ولا تخرجہ عن الاسلام اور فقہاء نے فرمایا ہے کما فی ردالمحتار عن الخلاصۃ:

اذا کان فی المسئلۃ وجوہ یوجب التکفیر ووجہ واحد یمنعہ فعلی المفتی (ای یجب علیہ) ان یمیل الی الوجہ الذی یمنع التکفیر تحسنا للظن بالمسلم	(جب کسی مسئلہ میں بہت سی وجوہ ہو جو کفر ثابت کرتی ہیں اور ایک وجہ کفر کی نفی کی ہو تو مفتی پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس وجہ کی طرف میلان اختیار کرے جو کفر کی نفی کرتی ہے مسلمان کے ساتھ حُسنِ ظن اختیار

لہ اس موضوع پر حضرت مفتی اعظم سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ العزیز نے "وُصول الافکار الی اصول الاکفار" کے نام سے جامع مکمل اور مدلل رسالہ لکھا ہی جو قابل دید ہے، اس کے علاوہ حضرت موصوف قدس سرہٗ کا دوسرا رسالہ "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" بھی قابل ملاحظہ ہی، جو ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴ سے مل سکتا ہے ۱۲ (احقر قریشی)

زاد فی البزازیۃ الا اذا صرح بارادتہ موجب الکفر فلا ینفعہ التاویل والذی تحرر انہ لا یفتی بکفر مسلم امکن محمل کلامہ علی محمل حسن او کان فی کفرہ اختلاف ولو روایۃ ضعیفۃ من البحر (ج ۳ ص ۴۴۰)

کرتے ہوئے، بزازیہ میں یہ عبارت زیادہ کی ہے کہ مگر جب اس شخص نے ایسے ارادے کی صراحت کر دی جو کفر ثابت ہی کر دیتا ہے تو اس وقت اسے تاویل نفع نہ دے گی، اور جو شخص اس بات سے بچا کہ کسی مسلمان کے کفر کا فتویٰ نہیں دے گا، اس کے کلام کا اچھے محل پر خیال کرنا ممکن ہے، یا اس کے کفر میں اختلاف ہے اگرچہ ضعیف روایت کے اعتبار سے ہے جیسا کہ بحرالرائق ج ۳ ص ۴۴۰ پر ہے''

بلا تحقیق کفر کے فتووں کا انجام

اور ان مکفرین کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عوام سے گذر کر خواص یعنی علماء تک کو اپنی تکفیر کا نشانہ بناتے ہیں، اور ان سے گذر کر اخص الخواص یعنی عارفین تک بھی پہنچتے ہیں، اور ماشاء اللہ جن اقوال کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں وہ ایسے دقیق ہوتے ہیں کہ ان مکفرین کا طائر ذہن بھی وہاں نہیں پہونچتا، یا دقیق نہیں ہوتے مگر ناشی ایسے احوال سے ہوتے ہیں جن کی ہوا تک بھی ان محبوسانِ الفاظ و رسوم کو نہیں لگی تو ان کی تکفیر کرنا بالکل اس آیت کا مصداق ہوتا ہے،

قال تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ،

(یونس، آیت ۳۹)

(بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے (صحیح و سقیم ہونے کو) اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے اور ہنوز انکو (اس قرآن کی تکذیب) کا آخری نتیجہ نہیں ملا)

وقال تعالیٰ:

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ۝

(الاحقاف، آیت ۱۱)

(''اور جب اُن لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ قدیمی جھوٹ ہے)،

ولنعم ما قیل ؎

وکم من عائب قولاً صحیحاً ✤ وآفتہ من الفہم السقیم

(''اور کتنے لوگ ہیں جو درست بات کا عیب نکالنے والے ہیں، اور اس کی مصیبت ہے سمجھ کی بیماری سے'')

کیا یہ غضب اور ستم نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں ایسوں کی تکفیر ہوئی جن کی برکت سے علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا، اور جن کے فیض سے برکاتِ دینیہ کا القاء ہوا،

کفر کا فتویٰ دینے کے لئے بعض شرائط

اور اگر کسی بزرگ کا کلام ماؤل نہ ہوسکے، تو اس کی تکفیر سے یہ یہ اسہل واسلم ہے کہ اس کلام ہی کی نسبت کا انکار کر دیا جائے اور غلبۂ حال کی تاویل کے رَد کرنے کے لئے بعض متقشفین عذر کو ان چند عذروں میں سمجھتے ہیں جن کو اصولیین نے بوجہ کثرتِ وقوع ذکر کردیا ہے، اور اس تخصیصِ ذکری کو تخصیصِ واقعی سمجھ کر دوسرے عذروں کی نفی ہی کردی، حالانکہ ان میں عذر منحصر نہ ہونا خود فقہاء ہی کے کلام میں مصرح ہے:۔

فی العالمگیریہ احکام المرتدین من اصابہ برسام او اطعم شیئًا فذھب عقلہ فھذی فارتد لم یکن ذٰلک ارتدادًا وکذا لو کان معتوھًا او موسوسًا او مغلوبًا علی عقلہ بوجہ من الوجوہ فھو علیٰ ھٰذا کذا فی السراج الوھاج،

("عالمگیری احکام المرتدین میں ہے جسے سرسام کی بیماری پہنچی یا اس نے کسی چیز کو کھا لیا جس کے بعد اس کی عقل چلی گئی پھر اس نے کچھ بکواس کی، پھر وہ مرتد ہوا یہ اس کا ارتداد نہیں ہوگا، اور اسی طرح اگر کوئی شخص کم عقل (پاگل) ہے، یا کسی وجہ سے مغلوب العقل یا وسوسہ والا ہے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے جیسا کہ سراج وہاج میں ہے۔")

اس عبارت میں "بوجہ من الوجوہ قابلِ نظر ہے:۔

وفی مدارج السالکین لابن القیم ج ا ص ۱۱۴، تحت حدیث قصۃ القائل انا عبدک وانت ربی، وفی الحدیث من قواعد العلم ان اللفظ الذی یجری علی لسان العبد خطأً من فرح شدید او غیظ شدید ونحوہ لا یؤاخذ بہ ولھٰذا لم یکن

("ابن قیم سے مدارج السالکین ج ا ص ۱۱۴ "انا عبدک وانت ربی" کے قائل کے قصہ میں مرقوم ہے کہ قواعدِ علم سے یہ بات ہے کہ بندہ کی زبان پر جو لفظ سخت غصہ کی وجہ سے یا غیر معمولی خوشی یا اور کسی وجہ سے خطاءً چل نکلے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا اسی واسطے وہ شخص کافر نہیں ہوگا، جس نے "انت عبدی وانا ربک (بسبقتِ لسانی)

كافرًا بقوله انت عبدی وانا ربك ومعلوم ان تاثير الغضب فی عدم القصد يصل الی هذا الحال او اعظم منها۔

کہہ دیا، اور معلوم ہے کہ غصہ کی تاثیر سے اس حالت تک یا اس سے بڑھ کر پہنچنے میں عدم قصد ہے"۔

اس عبارت میں لفظ "ونحوہ" قابلِ غور ہے، اور اس دوسری عبارت کے نقل کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ بعض جامدین علی الظاہر غیر متبعین للفقہاء پر بھی کہ وہ امر تکفیر میں اور بھی شدید ہیں، حجت ہو، کہ ان کے متبوع مسلم کا فتویٰ ہے، اور ہم نے جو امر تکفیر میں احتیاط کرنے کو کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی صریح کفر کا کام کرے یا صریح کفر کی بات کرے، جس میں تاویل نہ ہو سکے، یا ہو سکے مگر خود وہ فاعل یا قائل اس کا انکار کرے تب بھی اس کی تکفیر نہ کی جاوے،

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے

چنانچہ ایک کوتاہی اس اول کوتاہی کے مقابل اس باب میں یہ بھی ہے کہ علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے، کہ ذرا ذرا سی بات میں تکفیر کر دیتے ہیں، ان معترضین کے نزدیک وہ بات ذرا سی ہوتی ہے، ان صاحبوں کو یہ آیت پیشِ نظر رکھنا چاہیے:۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ ۚ

(التوبۃ: آیت ۶۵، ۶۶)

"اور اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہہ دیں گے ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے آپ (ان سے) کہہ دیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے، تم اب یہ بیہودہ عذر مت کرو، تم اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے"۔

اور اوپر یہ عبارت گزر چکی ہے الا اذا صرح بارادة الكفر فلا ينفعه التاويل،

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کی رعایت ضروری ہے

خلاصہ یہ کہ ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے، نہ ان کا تنابز ہو اور نہ ان سے تجاوز ہو،

ثبوتِ کفر کے بعد تجدیدِ ایمان کے ساتھ تجدیدِ نکاح اور اعادۂ حج بھی واجب ہے

ایک بے احتیاطی اس باب میں یہ ہوتی ہے کہ ثبوتِ کفر کے بعد اسلام کی تو تجدید کرلی جاتی ہے، نہ نکاح کی تجدید ہوتی ہے حالانکہ یہ بھی ضروری ہے اور نہ حج کا اعادہ ہوتا ہے حالانکہ کفر سے حجِ سابق بھی باطل ہو جاتا ہے، تو بعد تجدیدِ ایمان اگر شرائط وجوبِ حج کے پائے جائیں تو حج پھر کرنا چاہیے۔

وھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الفصول

حصہ دوم تمام شد